بدستِ زندہ

محی الدین نواب

.....بدستِ زندہ

انسان کو انسان مارتا ہے' بدنصیبی کبھی نہیں مارتی۔ جب تک زندہ رہتا ہے' زندہ لوگوں کے ہاتھوں بدترین حالات کی صلیب پر چڑھتا رہتا ہے۔ ویسے کچھ شامت کے مارے ایسے بھی ہوتے ہیں' جو پیدا ہونے سے پہلے ہی حالات کی سولی پر چڑھا دیئے جاتے ہیں۔

جب وہ پیدا ہوا تو گھر کی چار دیواری میں نہیں تھا۔ میٹرنٹی ہوم میں بھی نہیں تھا۔ کچرا گھر میں یا کسی فٹ پاتھ پر بھی نہیں پڑا تھا۔ انسان کا بچہ تھا۔ کسی جانور نے اسے پیدا نہیں کیا تھا۔ زندہ لوگوں نے ایک کوکھ کی کال کوٹھری سے نکال کر اسے جیل کی کوٹھری میں پہنچا دیا تھا۔

ابھی وہ اپنے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ پیدا ہو چکا ہے اور اس کا ایک وجود بھی ہے۔ مکاری کیا ہے' جرم کیا ہے اور معصومیت کیا ہوتی ہے' وہ نہیں جانتا تھا۔ اس معصوم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ غلطی اس کے باپ کی تھی۔ باپ نے اسے ایک قیدی ماں کے پیٹ میں پہنچا

دیا تھا۔

بعض لوگ کوئی جرم نہیں کرتے۔اس کے باوجود نہ کردہ گناہوں کی سزائیں پاتے رہتے ہیں۔جیل کے رجسٹر میں اس قیدی عورت کا نام صبارانی لکھا ہوا تھا۔وہ کسی راجہ کی رانی نہیں تھی۔عالیشان کوٹھیوں میں کام کرنے والی ایک نوکرانی تھی۔

وہ ماں باپ کے اچھے دنوں میں پیدا ہوئی تھی۔اس لئے نام صبا رانی رکھا گیا تھا۔جب حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور فاقوں کی نوبت آگئی تو بدنصیبی نے رانی کے نام میں نوک چبھودی اور وہ رانی سے 'نوک' رانی بن گئی۔

کوٹھی کے مالک شہباز درّانی کا بیٹا بہزاد درّانی عیاش تھا۔کبھی کبھی اسے چھیڑنے لگا۔اس نے مالکن سے شکایت کی۔"آپ چھوٹے صاحب کو سمجھائیں۔وہ مجھے چھیڑتے رہتے ہیں۔"

مالکن نے پوچھا۔"وہ تجھے کیسے چھیڑتا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔"میں کیا بتاؤں' وہ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔"

"اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ میرا بیٹا جوان ہے۔ذرا دل لگی کرتا ہے۔اسے کرنے دے۔تیرا کچھ بگڑتا تو نہیں ہے نا...."

"مگر مجھے یہ پسند نہیں ہے۔میں کام چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

مالکن نے اسے گھور کر دیکھا پھر کہا۔"تجھے ماہانہ تین سو دیتی ہوں۔اب چھ سو دوں گی۔یہ باتیں اپنے ماں باپ سے نہ کہنا۔"

باپ بیمار تھا۔محنت مزدوری نہیں کر سکتا تھا۔ماں دوسرے گھروں میں ماسی کا کام کرتی تھی۔وہ بھی ماہانہ تین سو روپے کماتی تھی۔بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔مالکن نے ایکدم سے تنخواہ دوگنی کر دی تو وہ صرف دل لگی کی حد تک چھوٹے صاحب سے راضی ہو گئی۔

وہ روز صبح کام کرنے آتی تھی۔دوپہر کو چلی جاتی تھی۔چودہ برس کی تھی۔بچپن اور جوانی کی درمیانی دہلیز پر کھڑی تھی۔دوسری بار چھوٹے صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔دونوں بازوؤں میں دبوچ کر پتہ نہیں کیا کرنا چاہتا تھا؟ وہ بڑی مشکلوں سے خود کو چھڑا کر

وہاں سے بھاگتی ہوئی مالکن کے بیڈروم میں آگئی۔

مالکن نے پوچھا۔"اس طرح کیوں ہانپ رہی ہے؟"

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔"وہ بیگم صاحبہ...! وہ چھوٹے صاحب..."

اس نے گھبرا کر پوچھا۔"کیا ہوا میرے بچّے کو...؟"

"انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔میرے ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔وہ مجھے پھر چھیڑ رہے ہیں۔"

بیگم نے گھور کر کہا۔"تین سو زیادہ دے رہی ہوں۔پھر کیوں شکایت کر رہی ہے؟"

"وہ کچھ زیادہ ہی دل لگی کر رہے ہیں۔آج انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔"جب میں تیرے عمر کی تھی تو اس کے باپ نے میرے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔"آپ ہنس رہی ہیں۔کیا یہ ہنسنے کی بات ہے؟"

"رونے کی بھی بات نہیں ہے۔نوجوانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔جا تجھے چھٹی دیتی ہوں۔گھر کا کام نہ کر۔اس کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہ..."

ایسے وقت شہباز درّانی کمرے میں آیا۔اس نے پوچھا۔"کیا ہو رہا ہے؟"

بیگم نے کہا۔"میں بتا چکی ہوں' بیٹا آپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اور یہ بُرا مان رہی ہے۔جبکہ تین سو روپے زیادہ دے رہی ہوں۔"

شہباز درّانی نے سینہ تان کر کہا۔"میرا بیٹا ہے۔میرے ہی نقشِ قدم پر چلے گا۔یہ اعتراض کیوں کر رہی ہے؟"

بیگم نے کہا۔"معاملہ کچھ آگے بڑھ گیا ہے۔اس کی تنخواہ کچھ اور بڑھانی ہو گی۔"

شہباز نے صبا رانی کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔"ہوں...اور چار سو روپے بڑھا دو۔"

پھر اس نے صبا رانی سے کہا۔"اے...! تجھے ہر مہینے پورے ایک ہزار روپے ملیں گے۔چل جا یہاں سے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔اس نے ڈانٹ کر کہا۔"کبھی تیرے باپ نے بھی ایک ہزار روپے دیکھے ہیں...؟ کہا نا جا یہاں سے..."

وہ ڈانٹ سنتے ہی وہاں سے چلی گئی۔شہباز نے حقارت سے کہا۔"اونہہ.....یہ کام کرنے والیاں بھی پارسا بننے لگی ہیں۔کیا دوسری کوٹھیوں والے انہیں چھوڑ دیتے ہوں گے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔"دوسروں کو جانے دیں۔ہمارا بیٹا تو اسے نہیں چھوڑے گا۔"

اس بات پر وہ دونوں فاتحانہ شان سے قہقہے لگانے لگے۔پھر بیگم نے کہا۔"یہ تو میں یقین سے کہتی ہوں' رانی کو کسی نے میلا نہیں کیا ہے۔ابھی یہ بچی ہے۔ہمارا بیٹا حد سے بڑھے گا تو یہ نہیں مانے گی۔ان لوگوں کی تو نہ کوئی اوقات ہے' نہ کوئی عزت ہے۔یہ باہر ہماری عزت اُچھالتی پھرے گی۔ہمیں آگے کی بھی سوچنا چاہئے۔"

"اس بچی کو تنہائی میں بٹھا کر سمجھایا کرو۔آخر کوئی تو اسے جوان بنائے گا۔میں نہیں چاہتا' ہمارا بیٹا باہر سے بیماریاں لے کر آئے۔بیماری سے پہلے ہی گھر میں علاج ہوتا رہے تو اچھا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔میں رانی کو تنخواہ کے علاوہ کچھ دیتی دلاتی رہوں گی تو وہ راضی رہے گی۔"

بیٹے کو باہر بہکنے اور بھٹکنے سے بچانا ضروری تھا۔بیگم روز ہی رانی کے کانوں میں یہ بات پھونکتی رہی کہ جوان لڑکے لڑکیاں اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہیں تو کوئی باہر والا دیکھنے نہیں آتا۔کوئی بدنامی نہیں ہوگی اور ہوگی تو ہم پردہ ڈال لیں گے۔

رانی کو ان کا بیٹا بہزاد ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔مگر ماہانہ ایک ہزار روپے ان غریبوں کے لئے بہت تھے۔پھر بیگم اسے بخشش بھی دیتی رہتی تھی۔اس لئے ایک حد تک بہزاد کو برداشت کر رہی تھی۔لیکن ایک دن وہ حد سے بڑھ گیا۔اس نے ایک ٹھنڈے مشروب میں نشے کی دوا گھول کر اسے پلا دی۔

وہ کوئی بیہوشی کی دوا نہیں تھی۔اس پر مدہوشی طاری ہوگئی۔یعنی ہوش میں تھی' مگر

نہیں تھی۔ایسے وقت اس کا ذہن ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔وہ اپنے اختیار میں نہیں تھی۔دھند میں لپٹی ہوئی دیکھ رہی تھی کہ زیادتی ہو رہی ہے۔نشے کی مستی سمجھا رہی تھی' جو ہو رہا ہے' ہونے دیا جائے۔اس کے بچپن کی پارسائی انکار کر رہی تھی۔"نہیں...یہ غلط ہے۔ایسا نہیں ہونا چاہئے...ایسا نہیں ہونا چاہئے..."

اسی کشمکش میں وہ ایک چیخ مارتے ہوئے بیہوش ہوگئی۔بہزاد درانی نے اس کی حالت دیکھی تو گھبرا گیا۔وہ اناڑی نوجوان تھا۔یہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا ظلم کیا جائے تو ایک بچی لہولہان ہو جاتی ہے۔بیگم اور شہباز درانی کو معلوم ہوا تو انہوں نے وہاں آ کر دیکھا۔وہ نو آموز عیاش بیٹے کے بیڈ پر بیہوش پڑی تھی۔

اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔جبراً منہ کھول کر حلق میں لیمن جوس کے قطرے ٹپکائے گئے۔تب اسے آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا' بیڈ روم کی چھت دکھائی دے رہی تھی۔اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔اس نے دائیں بائیں سر گھما کر بیگم کو بڑے صاحب کو پھر کارنامہ انجام دینے والے صاحب زادے کو دیکھا تو ایکدم سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔اپنے لباس پر نظر ڈالتے ہی چیخنے لگی۔چیخ چیخ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔"ہائے...میں برباد ہوگئی۔ہائے مر جاؤں گی۔میں زندہ نہیں رہوں گی..."

وہ بہزاد درانی پر انگلی اُٹھاتے ہوئے بولی۔"میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ماں جی اور بابا جی کے پاس جاؤں گی۔دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہوں گی' اس نے مجھے برباد کیا ہے۔"

شہباز درانی نے اس کے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ مارتے ہوئے' گرجتے ہوئے کہا۔"یو شٹ اپ۔اب اگر ایک آواز بھی منہ سے نکالی تو گولی مار دوں گا۔"

وہ بولی۔"ہاں مار دو۔مجھے مار ڈالو۔میں مرتے مرتے بھی اس پر تھوکتی رہوں گی۔آخ تھو...!"

اس نے بہزاد کی طرف منہ کر کے تھوک دیا۔دونوں باپ بیٹے طیش میں آ کر اس کی پٹائی کرنے لگے۔اسے بیڈ پر سے کھینچ کر فرش پر گرا کر ٹھوکریں مارنے لگے۔وہ پہلے ہی نیم مردہ سی ہوگئی تھی۔مار کھاتے کھاتے اور آدھی جان نکل گئی۔چیخنے چلانے کی سکت بھی

نہ رہی۔

وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے باتھ روم میں لے آئے۔ وہاں فرش پر پھینک کر شاور کھول دیا۔ شہباز نے بیگم سے کہا۔ ''اس کے لباس سے داغ دھبے اچھی طرح دھوڈالو۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔''

اس نے ڈرائنگ روم میں آکر فون کے ذریعے ایک پولیس افسر سے بات کی۔ اسے صبارانی کے تمام حالات بتائے۔ پھر کہا۔ ''ہمیں اس لڑکی سے نجات دلاؤ۔ میں ابھی تمہیں پچاس ہزار روپے دوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد ہی ایک پولیس انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے آگے پچاس ہزار کی ایک گڈی رکھ دی گئی۔ انسپکٹر نے کہا۔ ''سونے کا ایک آدھ زیور ہمیں دیں۔ اس پر چوری کا الزام لگایا جائے گا۔ اس طرح اس کا اور اس کے گھر والوں کا منہ بند کیا جائے گا۔''

پچاس ہزار روپے قانون کا حلیہ بگاڑنے کے لئے بہت تھے۔ صبارانی کو وہاں سے اٹھا کر حوالات میں پھینک دیا گیا۔ اس کے ماں باپ روتے پیٹتے ہوئے وہاں آئے۔ ان سے کہا گیا۔ ''اب سے دودن پہلے شہباز درانی کے گھر سے چالیس ہزار کے زیورات چرائے گئے تھے۔ شہباز صاحب کو تمہاری بیٹی پر شبہ تھا۔ انہوں نے ہماری خدمات حاصل کیں۔ ہم تمہاری بیٹی کی نگرانی کرنے لگے۔''

پھر انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ان کا شبہ درست نکلا۔ آج یہ لڑکی جڑاؤ کنگن چرا کرلے جارہی تھی۔ ہم نے اسے چوری کے مال کے ساتھ پکڑا ہے۔''

باپ نے کہا۔ ''یہ سراسر الزام ہے۔ میری بیٹی کبھی چوری نہیں کرسکتی۔''

ماں نے کہا۔ ''میں نے اسے پیدا کیا ہے۔ ہم اسے بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ آٹھ برس کی تھی' تب سے کوٹھیوں میں کام کرتی آرہی ہے۔ سب ہی کوٹھیوں کے مالکان اس سے خوش رہتے ہیں۔ کبھی کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہم نے دوسرے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ اُن سب کا بیان ہے' رانی جب تک کام کرتی رہی۔ ان کے ہاں سے کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی چیز چوری

ہوتی رہی۔''

''ہم کیسے یقین دلائیں کہ ہماری بیٹی ایسی نہیں ہے؟''

''تم کیا یقین دلاؤ گے؟ وہ بچی ہے اور تم بڑے چور ہو۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں واردات کرنے کے لئے بیٹی کو وہاں بھیجتے ہو۔ اس کے ذریعے معلوم کرتے ہو کہ بڑے گھروں میں نقدی اور زیورات کہاں چھپا کر رکھے جاتے ہیں؟ پھر وہاں نقب لگاتے ہو۔ اب سے دودن پہلے تم ہی نے وہاں سے چالیس ہزار کے زیور چرائے ہیں۔''

اس کے بوڑھے اور بیمار باپ کو بھی چوری کے الزام میں پکڑ لیا گیا۔ حوالات میں پہنچا کر اس کی اچھی طرح پٹائی کی گئی۔ وہ اپنی اور بیٹی کی قسمیں کھارہا تھا۔ اس بیچارے کے پاس چالیس ہزار تو کیا چالیس پیسے بھی نہیں تھے۔

آخر انسپکٹر نے کہا۔ ''چلو کوئی بات نہیں۔ مال واپس نہ کرو۔ بس یہ بیان لکھ دو کہ تم نے اور تمہاری بیٹی نے چوری کی ہے۔''

وہ خواہ مخواہ چوری کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔ اتنی تو عقل تھی کہ ناکردہ جرم کے الزام میں پھنسادیئے جائیں گے۔ اس بوڑھے کو حوالات میں بند کرکے دن رات اس کی پٹائی کی جارہی تھی۔ اس طرح مظالم ڈھائے جارہے تھے کہ جسم پر کوئی زخم نہ آئے۔ قانون کے محافظوں پر یہ الزام نہ آئے کہ ایک بے گناہ پر خواہ مخواہ تشدد کیا گیا ہے۔

اس کی ماں روتی پیٹتی محلے والوں کے پاس جاتی تھی۔ علاقے کے کونسلر سے ملتی تھی۔ بڑی کوٹھیوں والوں کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی۔ سب ہی سے گڑ گڑا کر کہتی تھی۔ ''میری معصوم بچی کو میرے بیمار خاوند کو ان ظالموں سے نجات دلاؤ۔''

بڑے لوگوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے معاملے میں خواہ مخواہ خود کو الجھاتے۔ محلے کے لوگ روز کماتے روز کھاتے تھے۔ پولیس کچہری کی دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد کرنے کے لئے خود کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

کتنے ہی کوٹھی والوں نے کہا۔ ''کوئی کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگاتا۔ تمہاری بیٹی نے یقیناً چوری کی ہوگی۔ اسی لئے ان کی گرفت میں آئی ہے۔''

قدرتی آفات نازل ہوتی ہیں تو ان سے کسی طرح بچاؤ ممکن ہوتا ہے۔ پولیس

والوں کے ذریعے آفات نازل ہوں تو رشوت اور سفارش کے بغیر نجات نہیں ملتی۔ ان غریبوں کی کوئی سفارش نہیں کر سکتا تھا اور ان کے پاس رشوت دینے کے لئے پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔

بیشک ہماری دنیا میں لوگ ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔ ان سے کہا جا رہا تھا' چالیس ہزار روپے کے زیورات واپس کرو اور یہ ظلم بھی ہو رہا تھا کہ بیٹی سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ وہ بیچارے نہیں جانتے تھے کہ بڑی کوٹھی میں ان کی بیٹی کی عزت لوٹی گئی ہے۔ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ حوالات میں رکھ کر اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟

مار کھاتے کھاتے بیمار باپ کی حالت ایسی ہو گئی' جیسے اب تب میں مرنے ہی والا ہو۔ صبا رانی کو سلاخوں کے پیچھے سے نکال کر دور سے باپ کی حالت دکھائی گئی۔ وہ بیچارہ فرش پر نیم مردہ سا پڑا ہوا تھا۔ ہلنے جلنے کی سکت نہیں تھی۔ سر گھما کر بیٹی کو دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

انسپکٹر نے کہا۔ "اگر اپنے باپ کی بہتری اور اس کی رہائی چاہتی ہے تو اس بیان پر دستخط کر دے کہ تُو نے چوری کی ہے اور بیگم شہباز درانی کے جڑاؤ کنگن بھی چرائے ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "جو کہیں گے' وہ لکھوں گی۔ جو حکم دیں گے' وہ کروں گی۔ مگر خدا کے لئے میرے ابا کو چھوڑ دو۔ ان کا علاج کراؤ نہیں تو یہ مر جائیں گے۔"

انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم اتنے نادان نہیں ہیں کہ اسے حوالات میں مرنے دیں گے اور اپنے سر کوئی الزام رکھیں گے۔ اسے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں یہ اپنا علاج کرائے یا مر جائے ہماری بلا سے....."

وہ ان کے حکم کے مطابق بیان لکھنے لگی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "یہ بھی لکھو کہ شہباز درانی اور ان کا بیٹا بہزاد درانی انتہائی شریف لوگ ہیں۔ وہ تمہیں بیٹی اور بہن کی طرح سمجھتے تھے۔ یہ لکھنے کے بعد تم اپنی بے آبروئی کی شکایت نہیں کر سکو گی۔"

صبا رانی نے غریبی اور مفلسی کے باوجود چھ جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ قانون کے محافظوں نے اس سے جو کہا' اس نے وہاں بیٹھ کر سب کچھ لکھ دیا۔ اس کے بعد باپ بیٹی کو ملنے کی اجازت دی گئی۔ پہلی بار ڈھنگ کا کھانا کھانے کے

لئے دیا گیا۔ بعد میں باپ سے بھی وہی لکھوایا گیا' جو بیٹی سے لکھوایا گیا تھا۔

چونکہ انہوں نے چوری کا تحریری اعتراف کیا تھا۔ اس لئے باپ کو رہا کیا گیا مگر بیٹی کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا۔ مجبور باپ سے کہا گیا۔ "جب تک چالیس ہزار کے زیورات واپس نہیں ملیں گے۔ تمہاری بیٹی سلاخوں سے باہر نہیں آ سکے گی۔"

باپ روتا پیٹتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ بھلا چالیس ہزار کے زیورات کہاں سے لاتا؟ دو دنوں کے بعد ہی بیمار رہ کر دواؤں کے بغیر مر گیا۔ کوئی صبا رانی کی وکالت کرنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا اسے حوالات سے نکال کر جیل کی چار دیواری میں بھیج دیا گیا۔ اس نے سنا تھا' باپ دواؤں کے بغیر ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر چکا ہے۔ وہ روتی بلکتی رہی اور کہتی رہی۔ "مجھے باپ سے ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ مر چکا ہے مگر ماں تو زندہ ہے۔ مجھے ایک بار اس سے ملنے دو۔"

ماں جانتی تھی' بیٹی سینٹرل جیل میں ہے۔ وہ احاطے کے بڑے گیٹ تک آتی تھی۔ مگر کوئی اسے اندر جا کر بیٹی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

جواد اکبر ضلع کی تمام جیلوں کا انسپکٹر جنرل تھا۔ جیلر نے اس سے کہا۔ "سر! ایک نوخیز لڑکی آئی ہے۔ سنگ مرمر کی طرح چکنی ہے۔ ابھی ہم میں سے کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ حضور! کبھی وقت نکال کر آئیں اور اسے ایک نظر دیکھیں۔ آپ کے مزاج کے مطابق دل بہلانے کا سامان ہے۔"

جواد اکبر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ذرا شبہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ جانتے ہو' میں کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔ سچ بتاؤ کسی نے اسے ہاتھ تو نہیں لگایا ہے؟"

وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "ہماری کیا مجال ہے؟ ہم تو آپ کا جھوٹا کھانے والوں میں سے ہیں۔"

جواد اکبر دوسرے ہی دن جیل کا معائنہ کرنے وہاں پہنچ گیا۔ زنانہ وارڈ میں صبا رانی کو سب سے الگ رکھا گیا تھا۔ جیلر نے اسے بتایا۔ "جواد اکبر صاحب بہت بڑے عہدیدار ہیں۔ وہ چاہیں تو تجھے ماں سے ملا سکتے ہیں۔ تیرا کیس اپنے ہاتھوں میں لے کر رہائی بھی دلا سکتے ہیں۔ اگر تُو اپنا دل نکال کر ان کے آگے رکھ دے گی تو وہ بھی تیرے لئے رحم دل بن جائیں گے۔"

جب جواد اکبر جیل کی چار دیواری میں قدم رکھتا تھا تو وہاں کا تمام عملہ بری طرح سہما ہوا الرٹ رہتا تھا۔ اس کے مزاج میں ایسی گرمی تھی' جیسے کھوپڑی کے اندر انگارے دہکتے رہتے ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر ماتحتوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ ان کے منہ پر تھوک دیا کرتا تھا۔ کوئی اس کے سامنے شکایت کرنے کی تو کیا' زبان ہلانے کی بھی جرات نہیں کرتا تھا۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے صبا رانی کے کمرے میں آیا تو وہ اس پہاڑ جیسے شخص کو دیکھ کر سہم گئی۔ وہ آگ تھا۔ مگر رانی کو دیکھتے ہی برف کی طرح پگھل گیا۔ عاشق مزاج نہیں تھا۔ لیکن رانی اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ جواد اکبر نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت کم سن ہے۔ بہت ہی معصوم ہے۔ جیل میں کیسے آ گئی؟''

اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی رانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''کیا بتاؤں جناب! بیچاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ آپ حاکم ہیں۔ قانون کے محافظ ہیں۔ اس بیچاری کو انصاف دلا سکتے ہیں۔''

جواد اکبر نے رانی کو سر سے پاؤں تک چبا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ پھر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ''انصاف ہوگا اور ابھی ہوگا۔ اسے ہمارے کمرے میں پہنچا دو۔''

وہ حکم صادر کر کے وہاں سے چلا گیا۔ جیلر نے رانی کے پاس آ کر کہا۔ ''تو بڑی نصیب والی ہے۔ تیرے تو دن پھر گئے۔ ابھی دو سپاہی تجھے ان کے پاس لے جائیں گے۔ بڑے صاحب کو ناراض نہ کرنا۔ انہیں خوش کرے گی تو سمجھ لے تجھے رہائی مل گئی۔ پھر اپنی ماں کا بھی منہ دیکھ سکے گی۔''

وہ اسے اچھی طرح سمجھا کر وہاں سے چلا گیا۔ نہ سمجھاتا' تب بھی اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بڑے صاحب بہت اچھے ہیں۔ اسے معصوم بچی کہہ رہے تھے۔ اس جہنم سے ضرور نکالیں گے۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایک ائر کنڈیشنڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں فوم کا بڑا ہی آرام دہ صوفہ کم بیڈ تھا۔ سینٹر ٹیبل پر تازہ پھل' خشک میوے' شراب سے بھری بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جواد اکبر اپنے لئے ایک پیگ بنا رہا تھا۔ وہ بوتل کو اور بڑے صاحب کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''رک کیوں گئیں؟ آؤ میرے پاس بیٹھو۔''

وہ اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے آ کر اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس نے بھاری بھرکم گرجتی ہوئی سی آواز میں حکم دیا۔ ''میرے قریب آؤ۔''

وہ لرز سی گئی۔ ایک ذرا ہچکچاتی ہوئی کھسکتی ہوئی قریب آ گئی۔ وہ اسے ایک بازو کی گرفت میں لے کر اور قریب کھینچتے ہوئے بولا۔ ''ہوں..... جیلر نے درست کہا تھا۔ تمہیں سنگ مرمر سے تراشا گیا ہے۔ میں تو دیکھتے ہی پھسل گیا۔''

وہ اس کی قربت سے گھبرا رہی تھی۔ ایک ذرا کتراتے ہوئے بولی۔ ''یہ.... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

وہ ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''معصوم بچی دکھائی دیتی ہو۔ مگر بالکل ہی نادان تو نہیں ہو۔ میرے ارادوں کو اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ تم مجھے خوش کرو گی تو میں تمہیں خوش کر دوں گا۔ تمہاری ماں کو تم سے ملاؤں گا۔ یہاں کی چار دیواری سے باہر نکالوں گا۔''

اس دنیا میں پیسہ بھی ملتا ہے' روٹی بھی ملتی ہے اور بدن ڈھانپنے کو کپڑا بھی ملتا ہے۔ لیکن پیسوں کے بغیر مصیبتوں سے نجات نہیں ملتی۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ مگر کچھ دے کر کچھ لینے کے لئے بس ایک حسن تھا اور جوانی تھی۔ مردوں کی دنیا میں عورتوں کو کیش ہونے کے لئے بس یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔

صبا رانی نے پہلی بار اپنی مرضی سے خود کو داؤ پر لگا دیا۔ مرد کبھی عورت کے ہاتھ نہیں لگتا۔ عورت کو اپنے ہاتھ میں کرتا ہے۔ جواد اکبر جیسے جیسے اس کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ ویسے ویسے اس کے اندر یہ بات پک رہی تھی۔ ''یہ تو واقعی زبردست ہے۔ بالکل الگ سی چیز ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں لے رہی ہے۔''

اس نے ذرا سی ہار مانتے ہوئے سوچا۔ ''میں نے سوچا تھا۔ اسے چبا کر تھوک دوں گا۔ مگر یہ تو حلق سے اتر رہی ہے۔''

اس نے طے کر لیا' اس لڑکی کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ نہ ہی کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت دے گا۔ جب تک دل نہیں بھرے گا۔ اپنے لئے ریزرو رکھے گا۔

صبا رانی نے پوچھا۔ ''کیا مجھے یہاں سے رہائی مل جائے گی؟ کیا میں اپنی ماں سے مل سکوں گی؟''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''کل ہی ملاقات کرادوں گا۔مگر رہائی کے معاملے میں قانونی رکاوٹیں ہیں۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''آپ تو حاکم ہیں۔کیا آپ کے سامنے بھی رکاوٹیں آجاتی ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''امیر ہو یا غریب' حاکم ہو یا محکوم' قانون سب کے لئے ایک ہی ہوتا ہے۔تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم نے چالیس ہزار کے زیورات نہیں چرائے۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں' میں نے اس کوٹھی سے ایک تنکا بھی نہیں چرایا ہے۔''

''قسمیں کھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔تم نے تھانے میں جو تحریری بیان دیا ہے۔عدالت میں اسے تسلیم کیا جائے گا۔''

وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ ''میں کیا کروں؟ تھانیدار نے مجبور کردیا تھا۔اگر یہ بیان نہ دیتی تو وہ میرے ابا کو حوالات میں مار ڈالتے۔''

''کیا تم نے اپنے ابا کو بچالیا ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟''

''نہیں....وہ تو رہائی پانے کے دو دن بعد ہی مر گئے تھے۔''

''تو پھر جھوٹا بیان لکھ کر تم نے کیا حاصل کیا؟ اپنے لئے مصیبت مول لے لی ہے۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔وہ بولی۔ ''میں کیا کرتی؟ یہ سمجھ رہی تھی' ابا حوالات میں آدھے مرچکے ہیں۔ان پر اور ظلم ہوتے دیکھ نہیں سکتی تھی۔آپ سمجھ سکتے ہیں' ہم غریبوں پر کس طرح مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔''

''میں مانتا ہوں' مگر تمہیں بھی قانون کو سمجھنا چاہئے۔تم نے تھانے میں جو کاغذ لکھا ہے' اسی کو درست مانا جائے گا۔فی الحال کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔مگر کوشش کروں گا۔تم نے میرا دل خوش کیا ہے۔میں ضرور تمہارے کام آؤں گا۔بس ذرا صبر کرو اور انتظار کرو۔میں بھی تمہاری رہائی چاہتا ہوں۔تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں''

ایسی باتوں سے امید بندھ رہی تھی۔وہ پھر اس کی مجبوریوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری رہائی کے لئے کچھ ہیرا پھیری کروں گا۔تب تک یہیں رہنا ہوگا۔مگر

یہاں تمہیں میرے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔تم قیدی بن کر نہیں میری منظور نظر بن کر رہوگی۔جیلر بھی تمہیں آنکھیں دکھانے کی جرات نہیں کرے گا۔''

وہ بڑے صاحب جو کہہ رہے تھے' اسے مان لینے میں ہی بہتری تھی۔یہ امید تھی کہ اسے جلد ہی چوری کے الزام سے بری کردیا جائے گا۔تب تک ایک داشتہ بن کر رہنے کے عذاب سے گزرنا ہوگا۔دوسرے ہی دن اسے ماں سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔

تقریباً چار ماہ بعد وہ ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔اس نے ماں کو یقین دلایا کہ بڑے صاحب اس پر بہت مہربان ہیں۔وہ جلد ہی چوری کا جھوٹا کیس ختم کرادیں گے۔اسے رہائی ملے گی تو وہ ماں بیٹی پہلے کی طرح اپنے نصیب میں لکھی ہوئی زندگی گزارتی رہیں گی۔

وہ پھر سے غریبوں کی طرح ہی سہی....مگر ایک شریفانہ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی رہی اور ماں بڑے صاحب کو دعائیں دیتی رہی۔انہیں زیادہ دیر تک ملنے اور باتیں کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔مگر جدا تو ہونا ہی تھا۔ماں روتی ہوئی آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

جواد اکبر نے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا کہ گھر کے کام کاج کے لئے صبا رانی کو اس کی کوٹھی میں بھیج دیا جائے اور اپنے ماتحتوں کو یہ سمجھایا کہ جب کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ' کمشنر یا ڈپٹی کمشنر اور فلاحی تنظیم کے وکلاء اور اہم کارکن معائنے کے لئے جیل میں آئیں تو اس سے پہلے ہی صبا رانی کو کوٹھی سے وہاں منتقل کردیا جائے گا۔

وہ اس حکم کے مطابق جیل سے نکل کر کوٹھی میں آگئی۔وہاں بڑے صاحب کی داشتہ بن کر رہنے لگی۔جواد ایک قد آور صحت مند تگڑا جوان تھا۔مگر اب جوانی سے بڑھاپے کی طرف آنے والا تھا۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی عمر کا چالیسواں کررہا تھا۔مگر شادی نہیں کررہا تھا۔

مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بڑے فخر سے کہتا تھا۔ ''جب ایسے ہی مل جاتی ہیں تو پھر بیوی کے نام کی دردسری کیوں مول لی جائے؟ بیوی ایک ہوتی ہے۔مگر فتنے ہزار لاتی ہے۔اور داشتائیں ہزار ہوتی ہیں۔مگر کبھی کسی فکر اور پریشانی میں مبتلا نہیں کرتیں۔آتی ہیں'

گل کھلاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔"

اسے اپنی نسل آگے بڑھانے کا شوق نہیں تھا۔ بچے اسے بکواس لگتے تھے۔ اگر بیٹی ہوتی ہے تو بستر پر آنے والی کم سن لڑکیاں سوالیہ نشان بن جاتی ہیں۔ زبان بے زبانی سے پوچھتی ہیں۔ "کیا ہم تمہاری بیٹی کے برابر نہیں ہیں؟"

لعنت ہے۔ کوئی داشتہ ایسا سوال کرے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ جوانی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ دانشمندی یہی ہے' نہ شادی کی جائے' نہ بیٹیاں پیدا کی جائیں۔

بیٹوں کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ یہ خود غرض ہوتے ہیں۔ جوان ہو کر بیویوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ماں باپ کو گھر کی چھٹی پرانی چیزیں سمجھ کر اسٹور روم میں ڈال دیتے ہیں۔ جو والدین سمجھدار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں دولت اور جائیداد کبھی ان کے نام نہیں لکھتے۔ اپنے ہی نام رکھتے ہیں۔ اس طرح بیٹے بڑی سعادت مندی سے والدین کی آخری سانسوں تک ان کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ یہ یقین ہوتا ہے' آخر ان بوڑھوں کا سب کچھ اپنے ہی نام ہونے والا ہے۔ لہٰذا ایسی لالچی اولاد کو پیدا ہی نہ کیا جائے۔

عیش و عشرت سے بھری ہوئی زندگی میں ساری مصیبت ایک بیوی ہی لے کر آتی ہے۔ نہ وہ کبھی آئے' نہ ایسی مصیبتیں پیدا ہوں۔ وہ دوسروں سے سب کچھ چھین لینا جانتا تھا۔ اپنی طرف سے کچھ دینے کی غلطی کبھی نہیں کرتا تھا۔ شادی نہ کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت اور جائیداد بیوی بچوں کو بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ سوچتا تھا۔ "میری دولت اور جائیداد کی لوٹ مار میرے اپنے ہی کریں گے۔ جو کچھ چھوڑ کر جاؤں گا' اس کے لئے لڑتے مرتے رہیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ لڑنے مرنے والے پیدا ہی نہ ہوں۔ آخری وقت اپنی تمام دولت اور جائیداد محکمہ اوقاف کے نام کر جاؤں۔ پتہ نہیں کبھی بھولے بھٹکے زندگی میں کوئی نیکی ہو سکے گی یا نہیں؟ مگر آخری وقت اپنی عاقبت کے لئے یہ نیکی کر جاؤں گا۔"

وہ ایک ہی چھت کے نیچے اپنی پھوپھی کی بیٹی ستارہ جبیں کے ساتھ بچپن سے رہتا آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ ستارہ بھی اس کی ہم مزاج تھی۔ نہ شادی کرنا چاہتی تھی' نہ بچے پیدا کر کے انہیں دودھ پلا کر اپنے حسن و شباب کا کباڑا کرنا چاہتی تھی۔

یوں بھی جواد سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس نے بچپن میں اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔ وہ دونوں پورے خاندان میں دودھ بہن بھائی کہلاتے تھے۔

جب اس نے پہلی بار ستارہ کو اپنی آغوش میں جکڑا تو وہ خود کو چھڑاتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو ہمیں کرنا چاہئے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ بولی۔ "میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم نے بچپن میں غلطی کیوں کی؟ کیوں میری ممی کا دودھ پیا؟"

"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ میں بچپن میں نادان تھا۔"

"تم بچپن ہی سے چالباز اور مکار ہو۔ جو چیز چاہتے ہو' چھین لیتے ہو۔ ممی یہ بات ہنستے ہنستے کہتی ہیں کہ میں ان کا دودھ پی رہی تھی۔ ایک برس کی تھی اور تم تین برس کے تھے۔ جبراً مجھے ہٹا کر خود ہی ممی کا دودھ پینے لگے تھے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے۔ مگر کیا کروں؟ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے' پہلے اسے مانگتا ہوں۔ نہ ملے تو چھین لیتا ہوں۔"

"اب تو چھین بھی نہیں سکتے۔ ہمارا رشتہ ہی بدل گیا ہے۔"

"میں نہیں مانتا کہ ایک ذرا دودھ پی لینے سے رشتے بدل جاتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ دودھ کے حوالے سے کبھی سگے بہن بھائی نہیں بن سکیں گے۔"

وہ پھر اسے گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ وہ کترا کر وہاں سے بھاگتی ہوئی دروازے پر آ گئی۔ وہ بولا۔ "ستارہ! میری جان! آ جاؤ..."

"تم جو چاہتے ہو' اسے دنیا والے نہیں مانیں گے۔"

"میں نے کبھی دنیا والوں کی پرواہ نہیں کی۔ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیتا ہوں۔ تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔"

وہ ٹھینگا دکھاتے ہوئے بولی۔ "تمہیں یہ ملے گا۔"

وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ وہ دن گزر گیا۔ رات کو معمول کے مطابق وہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھا پی رہا تھا۔ گھر کے تمام افراد کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ ستارہ ایک

باریک نائٹی پہن کر وہاں آ گئی۔ پھر بولی۔ ''میری انگوٹھی گم ہوگئی ہے۔ دن کو یہاں آئی تھی۔ شائد یہیں کہیں ہوگی۔''

وہ بولا۔ ''میں نے نہیں دیکھی۔ تم تلاش کرلو۔''

وہ اندر آ کر تلاش کرنے لگی۔ اس نے دروازہ بند کرلیا۔ پھر اس کے پاس آیا تو وہ کترانے لگی۔ ''پلیز۔ مجھے جانے دو۔''

وہ بولا۔ ''تم بھی میری طرح مکار ہو۔ انگوٹھی کے بہانے مجھے للچانے اور بھڑکانے یہاں آئی ہو۔''

وہ اسے للچا رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ آرہی تھی' کبھی پھسل رہی تھی۔ وہ ضدی تھا۔ اسے اور چنگیز خاں بنا رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر بولی۔ ''بس میں یہی چاہتی ہوں۔ جیتتے رہو گے تو ملتی رہوں گی۔ مانگتے رہو گے تو ٹھینگا دکھاتی رہوں گی۔''

گناہ گاروں کی سوچ یہ ہے کہ رشتے جائز یا ناجائز نہیں ہوتے۔ جو چیز اچھی لگے اسے منہ لگا لیتے ہیں۔ دینی اور دنیاوی قوانین کی گرفت میں نہیں آتے۔ ان کے قانون کے مطابق گناہ وہی ہے' جو ظاہر ہو جاتا ہے۔ جو ظاہر نہ ہو' وہ جائز ہے۔ اسے رواں دواں رکھا جا سکتا ہے۔

ان کے خفیہ تعلقات ایک عرصے تک قائم رہے۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔ وہ چوری چھپے ملتے تھے۔ گھر کی چاردیواری میں موقع نہ ملتا تو آؤٹنگ کے لئے' شاپنگ کے لئے لندن یا پیرس چلے جاتے تھے۔ بزرگوں اور خاندان والوں کو یہ یقین تھا کہ وہ دونوں دودھ کے رشتے کو بچپن سے جانتے اور سمجھتے آرہے ہیں۔ کبھی کوئی غلطی نہیں کریں گے۔

ایک غلط عمل مسلسل جاری رہے تو پھر نہیں چھپتا۔ گناہ کا بیج بوتے رہو' وہ ایک دن پھوٹ پڑتا ہے۔ ایسے ہی ایک دن ستارہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو یہ خبر سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ تب یہ بھید کھلا کہ ستارہ اور جواد نے اپنے بزرگوں کے اعتماد کو اور دودھ کے تقدس کو پامال کیا ہے۔

پھوپھی نے اپنے بھتیجے جواد اکبر کو باتیں سنائیں۔ وہ صرف باتیں ہی سنا سکتی

تھی۔ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ وہ خود مختار تھا۔ ایک سرکاری اعلیٰ عہدیدار تھا۔ اس نے اپنی بیٹی ستارہ سے کہا۔ ''تمہاری اس بے حیائی پر مٹی ڈالنی ہوگی۔ ہماری فیملی ڈاکٹر بڑی رازداری سے یہ کام کرے گی۔''

ستارہ نے کہا۔ ''پہلے میں سوچتی تھی' نہ شادی کروں گی' نہ بچے پیدا کروں گی۔ لیکن جواد کی محبت نے میری سوچ بدل دی ہے۔ میں اپنے اس بچے کو ضائع نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیا ہماری ناک کٹواؤ گی؟ ساری دنیا ہم پر تھوکے گی۔''

''غلطی ہماری نہیں' آپ کی ہے۔ آپ نے جواد کو اپنا دودھ کیوں پلایا تھا؟''

''مجھے کیا معلوم تھا' تم دونوں بڑے ہو کر ایسی بے حیائی کرو گے۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔ یہ بات ابھی اس گھر کی چاردیواری سے باہر نہیں گئی ہے۔ اس بدنامی کو ظاہر ہونے سے پہلے ختم کرنا ہوگا۔ تم میری بات نہیں مانو گی تو میں تمہیں اپنی تمام دولت اور جائیداد سے محروم کر دوں گی۔''

یہ بہت بڑی دھمکی تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ اس نے دو سو کروڑ روپے کی جائیداد اس کی ماں کے نام لکھی تھی۔ ماں کے بعد یہ سب کچھ اسے ملنے والا تھا۔ مگر اس کی دھمکی کہہ رہی تھی کہ بچہ پیدا کرو یا دو سو کروڑ روپے حاصل کرو۔ ہونے والی بدنامی کو ضائع نہ کیا گیا تو اسے جائیداد میں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔

وہ بولی۔ ''ممی! میں آپ کی ایک ہی بیٹی ہوں۔ آپ مجھے اس دولت اور جائیداد سے محروم کر کے دنیا والوں کی نظروں سے نہیں گرا سکتیں۔''

''اور تم جو مجھے اور میرے پورے خاندان کو نظروں سے گرانا چاہتی ہو۔ کیا یہ درست ہے؟''

اس نے عاجزی سے کہا۔ ''ممی! آپ میری جان لے لیں۔ مجھ سے دنیا کی کوئی بھی بات منوا لیں۔ میں مان لوں گی۔ مگر بچے کے خلاف نہ بولیں۔ اگر اسے ختم کرنا چاہیں گی تو میں بھی اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاؤں گی۔''

ماں نے اسے بڑی مجبوری سے' بڑی محبت سے دیکھا۔ وہ اس کی بیٹی تھی۔ اسے

غصے میں دھمکیاں دے سکتی تھی‘ مگر اسے تباہ نہیں کرسکتی تھی۔اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔’’تمہاری شادی جواد سے کبھی نہیں ہو سکے گی۔ ہمارا خاندان یہاں سے یورپ اور امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔سب ہی اس دودھ کے رشتے کو جانتے ہیں۔کیا پورے خاندان کو ہم سے بدظن کردینا چاہتی ہو؟‘‘

’’آپ پریشان نہ ہوں۔میں جواد سے شادی نہیں کروں گی۔اس کے ساتھ کسی رشتے کے بغیر زندگی گزارتی رہوں گی۔‘‘

’’اور زیادہ بے حیائی کی باتیں نہ کرو۔اس بچے کو کس باپ کے نام سے پیدا کروگی؟‘‘

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔’’میرے پاس ان باتوں کا جواب نہیں ہے۔اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے۔مجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہیں‘ میری خوشی چاہتی ہیں تو کچھ بھی کریں۔اس بچے کو ضائع نہ ہونے دیں۔‘‘

ماں بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔’’ایک ہی راستہ ہے۔میں نعیم صدیقی کو اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کرچکی تھی۔اب میرے اس فیصلے سے انکار نہ کرو۔اس سے شادی کرلو۔‘‘

’’میری شادی جواد سے نہیں ہوسکے گی۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی اور سے شادی کرلوں۔‘‘

’’کسی اور سے نہیں کروگی تو بچے کو باپ کا نام نہیں ملے گا۔دنیا والوں سے کیا کہوگی کہ تم نے کس کا بچہ پیدا کیا ہے؟‘‘

نعیم صدیقی دور کے رشتے سے ستارہ کا کزن تھا۔ستارہ کے باپ نے اس کی پرورش کی تھی۔اسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور اب وہ ان کا کروڑوں کا کاروبار بڑی دیانتداری سے سنبھال رہا تھا۔اس کی ممی نے کہا۔’’نعیم ہمارا احسان مند ہے۔ہم اسے بچپن سے جانتے ہیں۔اس نے ہمیں کبھی کسی معاملے میں دھوکہ نہیں دیا۔بڑی دیانتداری سے تمہارے ڈیڈی کا کاروبار سنبھال رہا ہے۔وہ تمہاری غلطی کو بھی سنبھال لے گا۔‘‘

’’کیا اسے بتایا جائے گا کہ میں ماں بننے والی ہوں؟‘‘

’’نہیں۔ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔کوئی آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگلتا۔بیشک نعیم نے ہمیں کبھی کسی معاملے میں دھوکہ نہیں دیا۔مگر ہم مجبور ہیں۔اسے دھوکہ دیں گے۔ایک ہفتے کے اندر اندر تمہارا نکاح اس سے پڑھایا جائے گا۔اسے کبھی شبہ نہیں ہوگا۔وہ اس بچے کو اپنا ہی بچہ سمجھے گا۔‘‘

’’خاندان کے سب ہی لوگ حیرانی سے پوچھیں گے کہ اچانک اتنی جلدی شادی کیوں کی جارہی ہے؟‘‘

’’یہ سب ہی جانتے ہیں کہ میں نعیم کو اپنا داماد بنانے والی ہوں۔کل تمہارے ڈیڈی کی برسی ہے۔انہوں نے خواب میں آکر کہا ہے کہ برسی کے دوسرے یا تیسرے دن تمہاری شادی نعیم سے کرائی جائے۔‘‘

ستارہ نے حیرانی سے پوچھا۔’’کیا واقعی ڈیڈی نے خواب میں آکر ایسا کہا ہے؟‘‘

’’وہ کبھی خیالوں میں نہیں آتے‘ خواب میں کیا آئیں گے؟ رشتے داروں سے تو یہی کہنا ہوگا۔‘‘

ستارہ نے سر جھکا لیا۔اس کی ممی نے دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا۔اس طرح جواد کا بچہ اس کی گود میں ہنستا کھیلتا رہتا۔جواد نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ نعیم صدیقی کو ایک لیبل بنا کر بچے کی پیدائش کو جائز بنالو۔آئندہ بھی بچے پیدا کرتی رہوگی تو وہ سب نعیم کے نام سے پھلتے پھولتے رہیں گے۔

ایسے شرمناک سمجھوتے کے مطابق شادی ہوگئی۔ستارہ نے ایک سائن بورڈ کے طور پر نعیم کو اپنا شوہر بنالیا۔وہ اپنے مرحوم سسر کو یعنی ستارہ کے باپ کو دل وجان سے چاہتا تھا۔اس کا احسان مند تھا۔مرحوم کے کاروبار پر اس کا پورا کنٹرول تھا۔منافع کی شرح بڑھ رہا تھا۔اس کی فطرت میں لالچ اور منافع خوری نہیں تھی۔وہ کاروبار میں کسی طرح کی ہیرا پھیری نہیں کرتا تھا۔

وہ تیس برس کا جوان تھا۔اس نے شادی نہیں کی تھی۔یہ جانتا تھا کہ ستارہ کی ممی اس سے بہت خوش ہے اور اسے اپنا داماد بنانا چاہتی ہے۔کیونکہ بیٹی تک چڑھی اور مغرور

تھی۔اس لئے اسے منانے میں کچھ وقت لگ رہا تھا۔

جب ستارہ اچانک ہی راضی ہوگئی اور ایک ہفتے کے اندران کی شادی ہوگئی تو نعیم کا ماتھا ٹھنکا۔وہ کوئی نادان بچہ نہیں تھا۔کروڑوں کا کاروبار سنبھال رہا تھا۔دنیا کی ہیرا پھیریوں کو خوب سمجھتا تھا۔

ستارہ اور اس کی ممی نے جو ہیرا پھیری کی تھی۔اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔وہ اگرچہ فریبی نہیں تھا۔دیانتدار تھا۔اس کے باوجود بالکل فرشتہ نہیں تھا۔ایک انسان تھا۔جس کے اندر کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔اس کی ایک کمزوری یہ تھی کہ اس نے اس خاندان کی ایک فیملی ڈاکٹر سے ناجائز تعلقات قائم رکھے تھے۔

ستارہ سے اچانک ہی شادی ہوئی تھی۔ایسے وقت وہ لیڈی ڈاکٹر موجود نہیں تھی۔جب ایک ہفتے بعد وہ لندن سے واپس آئی تو اس نے ہنستے ہوئے نعیم سے پوچھا۔''تم نے ستارہ سے شادی کی ہے؟''

اس نے پوچھا۔''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

اس کی داشتہ ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔''مبارک ہو.... ہاتھ ملاؤ....تم تو شادی سے پہلے ہی ایک بچے کے باپ بن گئے ہو۔''

وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا۔''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔اب سے دس دن پہلے میں نے ستارہ کا معائنہ کیا تھا اور اس کی ممی سے صاف صاف سے کہہ دیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔یہ سنتے ہی میرا منہ بند کرنے کے لئے مجھے پچاس ہزار روپے دیئے گئے تھے۔''

نعیم نے پوچھا۔''تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کرائیں گے اور تمہارے ساتھ دھوکہ کریں گے۔ابھی معلوم ہوا ہے تو تمہیں بتا رہی ہوں۔''

وہ آگے بڑھ کر اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔''جو پچاس ہزار مجھے دیئے گئے ہیں۔میں ان کے منہ پر ماردوں گی۔مگر دلدار کو دھوکہ نہیں کھانے دوں گی۔''

وہ اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔''واقعی تم نے ایک محبوبہ ہونے کا حق ادا کیا

ہے۔میں بالکل ہی اندھا بن کر دھوکہ کھانے والا تھا۔تم نے مجھے بچالیا ہے۔آئی لو یو۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔''پھر کیا ارادہ ہے؟ستارہ سے اپنی جان چھڑاؤ گے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔''میں بزنس مین ہوں۔گھاٹے کا سودا نہیں کروں گا۔اب تک ان کے ساتھ دیانتدار رہا۔مگر انہوں نے بے ایمانی اور فریب دینے کی ابتدا کی ہے۔میں انتہا کردوں گا۔دوسو کروڑ کی جائیداد ہے اور پچاس کروڑ بزنس میں گردش کر رہے ہیں۔میں اس کا شوہر بن کر اور ساسو ماں کا داماد بن کر یہ سب کچھ رفتہ رفتہ حاصل کرتا رہوں گا۔''

''بیشک تمہیں یہی کرنا چاہئے۔''

''میرا مرحوم سسر بہت ہی نیک دل شخص تھا۔میں اس کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔اس نے جو دولت اور جائیداد چھوڑی ہے'اس کی حفاظت نہیں کروں گا تو ستارہ یہ سب کچھ اپنے کسی یار کے حوالے کردے گی۔''

وہ اسے بڑی محبت اور عقیدت سے چومتے ہوئے بولا۔''آفرین!تم آئندہ بھی میرے بہت کام آتی رہوگی۔''

وہ جذباتی انداز میں بولی۔''تم دن رات مجھے کام میں لاتے رہو۔میں خوش ہوتی رہوں گی۔بولو آئندہ مجھے کیا کرنا ہے؟''

وہ بولا۔''تم فیملی ڈاکٹر ہو۔اب سے نو ماہ تک یعنی ستارہ کی زچگی ہونے تک اس دیکھ بھال کرتی رہوگی۔علاج کرتی رہوگی اور بچے کی پیدائش کے وقت موجود رہوگی۔''

''ہاں۔آگے بولو۔''

''آگے تم سمجھدار ہو۔اس بچے سے مجھے نجات دلاؤ گی۔میں کسی ناجائز بچے کا باپ کہلانا پسند نہیں کروں گا۔''

''فکر نہ کرو۔تم جو چاہتے ہو'وہی ہوگا۔میں زچگی کا کیس اس حد تک بگاڑ سکتی ہوں کہ بچے کے ساتھ ماں بھی اس دنیا سے رخصت ہوجائے گی۔''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔''ہرگز نہیں...ستارہ جیسی بھی ہے'میرے محسن کی بیٹی ہے۔میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ان ماں بیٹی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔صرف ان کی مکاری کا جواب مکاری سے دوں گا۔''

آفرین اور نعیم صدیقی بمقابلہ ستارہ اور جواد اکبر یہ دو ٹیمیں بن گئیں۔ دوسری ٹیم کی کوچ ستارہ کی ممی تھی۔ اس نے جو طریقہ کار بیٹی کو سکھایا تھا۔ اس کے مطابق اس نے اپنے یار سے ہونے والے بچے کو ضائع ہونے سے بچالیا تھا۔ بظاہر یہ ٹیم جیت کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

دوسری ٹیم ابھی جان بوجھ کر انجان بنی ہوئی تھی۔ نعیم صدیقی ایک معصوم اطاعت گزار داماد اور فرمانبردار شوہر بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر آفرین خود کو ایک وفادار فیملی ڈاکٹر ثابت کر رہی تھی۔ مگر بڑی رازداری سے علاج اور دواؤں کے ذریعے سُرنگ کھودتی ہوئی ایک بے گناہ معصوم بچے تک پہنچ رہی تھی۔

نعیم صدیقی پہلی بار کاروباری مُنافع میں ہیرا پھیری کرنے لگا۔ اب وہ لندن اور سوئٹزرلینڈ میں اپنا بینک بیلنس بڑھا رہا تھا۔ اپنے اور آفرین کے نام سے چھوٹی بڑی جائیداد خریدتا جا رہا تھا۔ ادھر آفرین اپنی چالیں چل رہی تھی۔ جن کے نتیجے میں ستارہ کی صحت دن بہ دن گرتی جارہی تھی۔ زچگی سے قبل الٹراساؤنڈ کے ذریعے پتہ چلا' بچے میں برائے نام جان ہے۔ اسے آپریشن کے ذریعے دنیا میں لانا ہوگا۔

برائی کرنے والوں کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ لیکن جو کسی کا بُرا نہیں چاہتے' جو نہ کسی سے دوستی کرتے ہیں' نہ دشمنی کرتے ہیں۔ وہ جو دنیا میں آنے والے ہوتے ہیں' ان معصوم اور بے گناہوں کو بھی انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

اس بچے نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مگر اسے ماں کی کوکھ میں ہی اس قدر کمزور بنا دیا گیا کہ دنیا میں آتے ہی چند سانسیں لینے کے بعد وہ مر گیا۔ ستارہ کو اس کی موت کا صدمہ تھا۔ اس بچے کے لیے اس نے کتنی ہیرا پھیری کی تھی۔ اسے پیدا کرنے کے لیے اور ایک باپ کا نام دینے کے لیے نعیم صدیقی کو اوپری دل سے شوہر بنا لیا تھا۔ ساری تدبیریں' سارے ہتھکنڈے ناکام ہوئے تو وہ رونے لگی۔

ماں نے اسے تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! پریشان نہ ہو۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ تم پھر ماں بنو گی۔ اپنی صحت کا خیال رکھو گی تو بچہ بھی صحت مند پیدا ہوگا۔"

ڈاکٹر آفرین نے کہا۔ "میڈم...! ایک بُری خبر یہ ہے کہ آپ کی صاحبزادی اب

کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔"

جواد اکبر بھی اس کمرے میں موجود تھا۔ ستارہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں بن سکوں گی...؟ میں ضرور بنوں گی۔ مجھے حوصلہ دو۔ میں پھر ایک بچے کو جنم دوں گی۔"

جواد اکبر نے ہچکچاتے ہوئے نعیم صدیقی کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "ستارہ کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ تمہیں اسے حوصلہ دینا چاہیے۔"

نعیم نے ستارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو کسی حوصلے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو چاہتی ہو' کر گزرتی ہو۔ مگر تقدیر سے نہیں لڑ سکو گی۔ جب ایک لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی ہے کہ ماں نہیں بن سکو گی تو اس کا مطلب یہی ہے' تمہارے اندر کوئی بہت بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔"

اس کی ممی نے کہا۔ "کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ میں اپنی بیٹی کو لندن لے جاؤں گی۔ وہاں کسی مہنگے ہوسپٹل میں اس کا علاج کراؤں گی۔ یہ ضرور ماں بنے گی۔"

نعیم نے جواد اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا معجزہ ہو جائے تو صرف ستارہ کو ماں بن کر ہی نہیں' مجھے بھی باپ بن کر خوشی ہوگی۔ آخر اتنی دولت و جائیداد کا کوئی تو وارث پیدا ہونا چاہیے۔"

ستارہ کو ہوسپٹل سے گھر لایا گیا۔ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اس کی ماں نے نعیم صدیقی سے کہا۔ "میں اپنی بیٹی کو لندن لے جاؤں گی۔ وہاں مہینوں رہ کر اس کا علاج کراؤں گی۔"

نعیم نے کہا۔ "اور میں وہاں مہینوں رہ کر یہاں اتنے بڑے بزنس سے غافل نہیں ہو سکتا۔ ویسے کبھی کبھی آتا جاتا رہوں گا۔"

وہ ماں بیٹی لندن چلی گئیں۔ جواد اکبر بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ ڈاکٹر آفرین نے تنہائی میں نعیم صدیقی کے گلے لگ کر کہا۔ "اُدھر وہ دونوں پھر اپنا گیم کھیلنے گئے ہیں۔ ادھر ہمیں ہنی مون منانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

نعیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بے چاری میری ستارہ... اپنے یار کی اولاد سے اپنی گود

بھرنا چاہتی ہے۔"

آفرین نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "اور میڈم اپنی بیٹی کی گود بھرنے گئی ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی اس کا علاج نہیں کر سکے گا۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔"

نعیم صدیقی کاروباری مصروفیات کا بہانہ کرتا رہتا تھا۔ ستارہ کے پاس نہیں جاتا تھا۔ اس کے برعکس جواد اکبر مہینے دو مہینے میں ایک ہفتے کے لیے وہاں پہنچ جاتا تھا۔ لندن کے ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اس کے باوجود ستارہ وہیں رہی اور جواد کے ساتھ دن رات گزارتی رہی۔ دس ماہ کے بعد مایوس ہوگئی۔ یقین ہوگیا کہ تمام ڈاکٹر درست کہتے ہیں۔

وہ ماں بیٹی واپس آئیں تو نعیم نے کہا۔ "ستارہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی اور مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں نے ڈاکٹر آفرین سے کورٹ میرج کر لی ہے۔"

میڈم نے غصے سے کہا۔ "تم نے کس کی اجازت سے دوسری شادی کی ہے...؟"

"قانون اجازت دیتا ہے' ایک بیوی ماں بننے کے قابل نہ رہے تو مرد دوسری شادی کر سکتا ہے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تم نے اس لیڈی ڈاکٹر سے شادی کی ہے' جو ہمارے ٹکڑوں پر پلتی رہی ہے۔ اب تم اس سے ہونے والی اولاد کو ہماری دولت و جائیداد کا وارث بنانا چاہو گے۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

نعیم نے کہا۔ "پلیز۔ جھگڑا نہ بڑھائیں۔ مجھے بے ایمان نہ سمجھیں۔ میں اور میرا ہونے والا بچہ اس دولت و جائیداد کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ آپ اپنی تسلی کے لئے اپنا سب کچھ ستارہ کے نام لکھ دیں۔ میں آپ سے پھوٹی کوڑی نہیں مانگوں گا۔ اس کاروبار کو سنبھالنے کے لیے جو محنت کرتا ہوں' بس اس کی تنخواہ لیتا رہوں گا۔"

ساس صاحبہ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ بچپن سے اسے جانتی تھی۔ وہ وفادار بھی تھا اور دیانتدار بھی تھا۔ ستارہ نے کہا۔ "لیکن ممی...! مجھے اولاد کی ضرورت ہے۔ میں اپنی پسند کا ایک بچہ گود لوں گی۔ اس کی پرورش کروں گی۔ اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرتی رہوں گی۔"

اس نے نعیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بچہ.... جواد اکبر کا ہوگا۔ جب تم من مانی

کر سکتے ہو' میری اجازت کے بغیر دوسری شادی کر سکتے ہو تو میں بھی جواد کے بچے کو گود لے سکتی ہوں۔ اسے اپنا وارث بنا سکتی ہوں۔"

وہ بولا۔ "تم بڑے باپ کی بیٹی ہو' جو چاہو کر سکتی ہو۔"

ماں نے بیٹی سے کہا۔ "جواد اکبر نے آج تک شادی نہیں کی اور نہ آئندہ شادی کرنے کے موڈ میں ہے۔ پھر اس کا بچہ کہاں سے آئے گا؟"

ستارہ نے کہا۔ "شادی نہیں کی ہے تو کر لے گا۔ کوئی کرائے کی عورت لے آئے گا۔ اس سے نکاح پڑھوائے گا۔ پھر باپ بننے کے بعد بچہ اس عورت سے لے کر اس کی چھٹی کر دے گا۔"

نعیم نے کہا۔ "ستارہ...! تم میری بیوی ہو۔ اگر میرے خلاف کوئی فیصلہ سناؤ گی تو میں بھی تمہارے خلاف فیصلہ سنانے کا حق رکھتا ہوں۔ آفرین سے میرا بچہ ہوگا تو تم اسے قبول نہیں کرو گی۔ اسے اپنی جائیداد کا وارث نہیں بناؤ گی۔ اسی طرح تم جواد اکبر کے ہونے والے بچے کو گود لو گی تو میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ ایک باپ کے طور پر اسے اپنا نام نہیں دوں گا۔"

ستارہ نے کہا۔ "اگر تم میرے لے پالک بچے کو اپنا نام نہیں دو گے تو میں بھی تمہیں اپنا شوہر تسلیم نہیں کروں گی۔ طلاق لے لوں گی۔"

نعیم نے اس کی ممی سے پوچھا۔ "آپ کیا فرماتی ہیں؟ ہمارے درمیان طلاق ہو جانی چاہئے؟ یہ رشتہ ٹوٹے گا تو کیا کاروباری رشتہ بھی ختم ہو جائے گا؟"

اس کی ماں نے کہا۔ "میں کچھ عرصے سے تمہارے تیور دیکھ رہی ہوں۔ تم بہت بدل گئے ہو۔ تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تمہارے بغیر ہمارا بزنس رواں دواں نہیں رہ سکے گا۔"

ستارہ نے کہا۔ "تمہاری یہ خوش فہمی پلک جھپکتے ہی ختم ہو جائے گی۔ اگر تم جواد اکبر سے ہونے بچے کو باپ کا نام نہیں دو گے تو میں تمہیں اپنی زندگی سے اور اپنی ممی کے کاروبار سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی۔"

"تم کیا نکالو گی اور کیا پھینکو گی؟ میں خود ہی یہاں سے جا رہا ہوں۔ کل تک تمہارے پاس طلاق نامہ پہنچ جائے گا۔"

اسے ایک جھوٹی، فریبی اور مغرور شریکِ سے حیات بہت پہلے ہی پیچھا چھڑا لینا چاہئے تھا۔ دوسرے ہی دن طلاق ہو گئی۔ وہ اپنا ضروری سامان لے کر اس کوٹھی سے نکل آیا۔ کاروبار سے تعلق رکھنے والے تمام اہم کاغذات ان کے حوالے کر دیے۔ ماں بیٹی کو یقین تھا کہ اس پھلتے پھولتے کاروبار کو اچھی طرح سنبھال لیں گی۔ جواد اکبر نے ایک بہت ہی تجربہ کار اور قابلِ اعتماد شخص کو جنرل منیجر کی حیثیت سے ملازم رکھا۔ اس نے تمام اہم دستاویزات کی اسٹڈی کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ وہ کاروبار خسارے میں چل رہا ہے۔ نعیم صدیقی نے بینک سے کروڑوں روپے قرض لے کر اس کاروبار کو جاری رکھا تھا۔

نئے جنرل منیجر نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اس ڈوبتے ہوئے کاروبار کو سنبھال نہیں پائے گا۔ نعیم صدیقی نے ایسی چالاکی اور ہنرمندی سے فراڈ کیا تھا کہ اسے قانونی گرفت میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔ وہ بڑی رازداری سے اپنا ایک نیا بزنس سیٹ اپ قائم کر چکا تھا۔

ستارہ اپنی ممی اور جواد اکبر کے ساتھ اس کے آفس میں آ کر بولی۔ ”تم تو آستین کے سانپ نکلے۔ میرے ڈیڈی نے تمہیں ذلت کی پستیوں سے اٹھا کر اس بلند مقام تک پہنچایا۔ مگر تم احسان فراموش ہو۔ تم نے ہمیں ڈس لیا ہے۔“

ستارہ کی ماں نے کہا۔ ”میں نے تمہیں دودھ نہیں پلایا۔ لیکن ایک ماں کی طرح محبتیں دیتی رہی۔ بیٹا سمجھتی رہی۔ پھر اپنا داماد بنا لیا۔“

نعیم نے کہا۔ ”اگر تم مجھے اپنا دودھ پلاتیں اور مجھ سے فراڈ کرتیں‘ تب بھی وہ دودھ پانی ہو جاتا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ جب تک تم تینوں نے مل کر مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ تب تک میں تمہارا وفادار اور دیانتدار ملازم تھا۔“

وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر اِدھر سے اُدھر گھومتے ہوئے بولا۔ ”پہلے میں تمہاری عزت کرتا تھا۔ مگر تم اس قابل نہیں ہو۔ یہ سب ہی جانتے ہیں‘ تم نے جواد اکبر کو بچپن میں دودھ پلایا تھا۔ مگر یہ شرمناک حقیقت میں جانتا ہوں کہ یہ دودھ بہن بھائی کہلانے والے تمہاری چھتر چھایا میں رہ کر بے حیائی کی زندگی گزار رہے ہیں۔“

وہ کرسی پر اِدھر سے اُدھر ہوتے ہوئے بولا۔ ”جب آفرین نے مجھے بتایا کہ تم اپنی بیٹی کو بدنامی سے بچانے کے لئے اور جواد اکبر سے ہونے والے ناجائز بچے کو میرا نام دینے

کے لئے جھوٹ بول رہی ہو‘ فراڈ کر رہی ہو تو میں نے بھی وفاداری اور دیانتداری سے توبہ کر لی۔ لوہا‘ لوہے کو کاٹتا ہے۔ میں بھی تم جیسے مکاروں کو اپنی مکاری سے کاٹتا چلا گیا۔“

جواد اکبر ایک طرف خاموش بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر اپنی بھاری بھرکم گونجتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ تمہیں وارننگ دے رہا ہوں‘ ایک ہفتے کے اندر ہماری تمام لوٹی ہوئی دولت واپس کر دو۔ ورنہ تمہاری زندگی سکڑ جائے گی۔ ہفتے کا ساتواں دن گزرتے ہی تم ایک کے بعد دوسری سانس لینے کے قابل نہیں رہو گے۔“

نعیم صدیقی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکال کر جواد کو نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہفتے کا ساتواں دن بہت دور ہے۔ ابھی ایک گولی چلے گی۔ پھر تم دھمکیاں دینے کے قابل نہیں رہو گے۔“

ستارہ اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی جواد اکبر کے سامنے آ کر ڈھال بنتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا بدمعاشی ہے؟ ہم ملاقات کرنے آئے ہیں اور تم ہمیں قتل کرنا چاہتے ہو؟“

”تمہارے یار نے بدمعاشی شروع کی ہے۔ مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔“

پھر وہ جواد سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں‘ تمہارے پاس ریوالور ہے۔ کیا تم جانتے ہو‘ ابھی میں کیا کرنے والا ہوں؟“

جواد اکبر نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ وہ بولا۔ ”میں تمہیں گولی ماروں گا۔ پھر تمہارے مرتے ہی تمہارا اسلحہ نکال کر اپنی کرسی کی طرف فائر کروں گا۔ گولی میری کرسی کی پُشت پر لگے گی۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم یہاں آ کر مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے میں نے جواباً تم پر گولی چلائی تھی۔“

ستارہ کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”نعیم! ابھی تمہارے نشانے پر جواد نہیں ہے‘ میری بیٹی ہے۔ ریوالور نیچے کرو۔ گولی چل جائے گی۔“

”اپنی بیٹی کو وہاں سے ہٹاؤ۔ گولیاں اندھی ہوتی ہیں۔ کسی رشتے کو‘ کسی دوست اور دشمن کو نہیں پہچانتی ہیں۔“

ستارہ نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں۔ قسم کھا کر کہتی ہوں‘ جواد تم سے دشمنی نہیں

کرے گا۔ تمہیں جانی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ کسی طرح کا بھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ہمیں یہاں سے جانے دو۔''

نعیم نے انٹرکام کے ذریعے سیکورٹی افسر کو بلایا۔ پھر جواد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم بہت بڑے سرکاری عہدیدار ہو۔ تمہارے پاس قانون کی طاقت ہے۔ میں ٹریڈ اینڈ کامرس کے ڈائریکٹرز میں سے ایک ہوں۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا آتا رہتا ہوں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا ہوں۔ بھانت بھانت کے مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں سے بہت کچھ سیکھتا رہتا ہوں۔ تمہارے قانونی شکنجوں سے نکلنے کا ہتھکنڈہ بھی خوب جانتا ہوں۔ آئندہ تم نے اِدھر کا رُخ کیا یا مجھے کسی طرح کی دھمکی دی تو اپنی اس داشتہ کے ساتھ جہنم میں پہنچ جاؤ گے۔''

سیکورٹی افسر نے آکر اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے جواد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص کو اچھی طرح پہچان لو۔ ابھی اس کے پاس اسلحہ ہے۔ اسے باہر پہنچادو۔ آئندہ یہ کبھی جبراً آنا چاہے تو گولی ماردو۔''

ان تینوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ چپ چاپ جانے میں ہی خیریت تھی۔ وہ فوراً ہی سیکورٹی افسر کے پیچھے وہاں سے چلے گئے۔ جواد اکبر کبھی کسی کی دھونس میں نہیں آتا تھا۔ پہلی بار نعیم صدیقی اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر دھونس میں لے آیا تھا۔ وہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ باہر آکر مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

ستارہ نے کہا۔ ''خواہ مخواہ طیش میں نہ آؤ۔ اسے چیلنج نہ کرو۔ وہ بہت ہی مکار ہے۔ اس نے ہماری دولت لوٹی ہے۔ تمہیں جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ فی الحال اس سے دشمنی بھول جاؤ۔ پہلے میری ضرورت پوری کرو۔''

اسے ایک بچے کی ضرورت تھی۔ جو بھی بچا کھچا کاروبار رہ گیا تھا اور جتنی دولت و جائیداد رہ گئی تھی' اس کے لئے ایک وارث ضروری تھا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ مگر جواد اکبر باپ بن سکتا تھا۔

وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اپنی محبوبہ کی خواہش پوری کرنا بھی ضروری تھی۔ کسی عورت کو عارضی طور پر ہی سہی' زندگی میں لانا تھا۔ ان

ہی دنوں صبارانی اس کی ہوس کی سیج پر آگئی۔

اس نے ستارہ سے کہا۔ ''میں نے ایک قیدی لڑکی کو اپنی کوٹھی میں ملازمہ کی حیثیت سے رکھا ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ اگر ماں بنے گی تو اپنی جیسی خوبصورت اولاد پیدا کرے گی۔ کیا ایک قیدی عورت کے بچے کو گود لینا چاہوگی؟''

وہ بولی۔ ''مجھے کسی کی سماجی حیثیت کا حساب نہیں کرنا ہے۔ میں تو صرف تم سے ہونے والی اولاد کو اپنے کلیجے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہوں۔''

ستارہ نے یہ بات اپنی ماں کو بتائی۔ اس نے کہا۔ ''اولاد قیدی عورت سے ہو یا کسی بازاری عورت سے...ولدیت میں ماں کا نہیں باپ کا نام آتا ہے۔ وہ اولاد جواد کی ہوگی۔''

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ہمیں کسی قیدی عورت کو اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ اہمیت اولاد کو دو۔ وہ جائز ہو۔ ناجائز نہ ہو۔ جواد سے کہو' چپ چاپ نکاح پڑھائے۔ جب اولاد ہوجائے تو اس عورت سے بچہ لے کر اسے طلاق دے دے۔''

ستارہ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے' وہ طلاق نہ لے۔ میں عورت ہوں اور عورتوں کی فطرت کو خوب سمجھتی ہوں۔ جب شادی ہوجائے گی تو وہ جواد کے گلے کا پھندہ بن جائے گی۔ کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔''

ماں نے کہا۔ ''بلا سے پیچھا نہ چھوڑے۔ تمہیں اس سے کیا لینا ہے؟ جواد اگر اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے گا تو گزارتا رہے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں کسی سوکن کو برداشت نہیں کروں گی۔''

ماں نے بیٹی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کس رشتے سے اسے سوکن سمجھوگی؟ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تم جواد کی دیوانی ہو۔ مگر اس کی شریکِ حیات نہیں ہو۔''

''بے شک۔ میں اس کی دیوانی ہوں۔ مگر نادانی نہیں کررہی ہوں۔ ذرا حساب کریں۔ اسی شہر میں اس کی چالیس کروڑ کی ایک کوٹھی ہے اور بھی زمینیں خریدتا رہتا ہے۔ کوئی دوسری عورت اس کی زندگی میں شریکِ حیات بن کر آئے گی تو میرا حق مارا جائے گا۔''

اس نے بیٹی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ ماں کی آنکھوں میں جھانکتے

ہوئے بولی۔ ’’کیا میری بات سمجھ رہی ہیں؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ستارہ نے کہا۔ ’’میں اسے رنگ رلیاں منانے کی کھلی چھٹی دیتی ہوں۔ لیکن شادی نہیں کرنے دیتی اور نہ ہی وہ کرے گا۔‘‘

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ’’تم ان معاملات میں بہت چالاک ہو۔ پہلے یہ معلوم کرو کہ اس عورت کو عمر قید کی سزا ہو چکی ہے یا نہیں۔ ایک سزا یافتہ عورت سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ نہ وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے سے کبھی باہر آسکے گی' نہ جواد کی دولت و جائیداد کی حق دار بن سکے گی۔‘‘

ستارہ نے جواد اکبر کے پاس آ کر کہا۔ ’’میں تمہاری جائز اولاد چاہتی ہوں۔ تم اس قیدی عورت سے عارضی طور پر نکاح پڑھاؤ۔ جب وہ ماں بنے تو بچہ میرے پاس لے آؤ اور اس کی چھٹی کر دو۔‘‘

وہ اسے آغوش میں بھرتے ہوئے بولا۔ ’’میری جان...! میں یہی کروں گا۔‘‘

’’مگر اس سے نکاح پڑھاؤ گے تو وہ تمہارے گلے کا ہار بن جائے گی۔ کبھی تمہیں چھوڑنا نہیں چاہے گی۔‘‘

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ’’تم شاید بھول رہی ہو' وہ ایک قیدی عورت ہے۔ میں اسے جیل سے نکلنے ہی نہیں دوں گا۔ نہ وہ کبھی رہائی پائے گی' نہ بیوی بن کر اپنا کوئی حق جتا سکے گی۔‘‘

صبا رانی اس کی کوٹھی میں بظاہر ایک ملازمہ تھی۔ مگر داشتہ بن کر رہتی تھی۔ جب کبھی اطلاع ملتی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا فلاحی تنظیموں کے رہنما کارکن جیل کا معائنہ کرنے آرہے ہیں تو وہ اسے جیل میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ وہاں وہ ایک قیدی عورت کی حیثیت سے حاضر رہتی تھی۔ جب معائنہ کرنے والے چلے جاتے تو جیلر اسے جواد اکبر کی کوٹھی میں پہنچا دیا کرتا تھا۔

وہ حسب معمول اسی کوٹھی میں ایک ملازمہ کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ جواد نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر بولا۔ ’’تجھے پتہ ہے' میں تیرا کیسا دیوانہ ہو گیا ہوں؟‘‘

وہ بولی۔ ’’اگر آپ میرے دیوانے ہوتے تو مجھے اس جیل سے ہمیشہ کے لئے باہر لے آتے۔‘‘

’’تُو قانونی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھتی ہے۔ شہباز درّانی نے تجھ پر چالیس ہزار کے زیورات کی چوری کا الزام لگایا ہے۔‘‘

’’وہ جھوٹ کہتا ہے۔ اس کا ایک بھی زیور چوری نہیں ہوا ہے۔‘‘

’’وہ جھوٹ بولیں گے۔ مگر سچے کہلائیں گے۔ تُو سچ بولتی رہے گی اور جھوٹی کہلاتی رہے گی۔ وہ بڑے لوگ ہیں۔ انہیں جھوٹا اور فریبی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ’’تو کیا میں اسی طرح جیل میں ساری زندگی گزار دوں گی؟‘‘

’’تجھ پر الزام ہے کہ تُو کوٹھیوں میں کام کرتی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ مل کر چوریاں کرتی تھی۔ اگر تُو یہ بیان دے کہ واقعی تیرے باپ نے چوری کی تھی اور سارا مال چرانے کے بعد وہ کہیں چلا گیا تھا تو...‘‘

وہ فوراً ہی اس کے بازوؤں سے اُترتے ہوئے بولی۔ ’’نہیں۔ میرے ابا مر چکے ہیں۔ میں ان پر چوری کا جھوٹا الزام نہیں لگاؤں گی۔‘‘

’’تو پھر ساری زندگی جیل میں سڑتی رہے گی۔‘‘

’’آپ بڑے آدمی ہیں۔ میری عزت سے کھیلتے رہتے ہیں۔ میں کوئی شکایت نہیں کرسکتی۔ آپ میری عزت لوٹ رہے ہیں۔ اس لوٹ مار میں مجھے تھوڑا سا تو فائدہ پہنچائیں۔‘‘

’’آج میں تجھے اتنا بڑا فائدہ پہنچانے والا ہوں کہ تُو سنے گی تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔‘‘

اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے مقدر کے موجودہ مالک کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’میں تجھ سے شادی کرنے والا ہوں۔‘‘

وہ ایکدم سے اچھل پڑی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔

’’میں ابھی تجھ سے نکاح پڑھواؤں گا۔‘‘

وہ مارے خوشی کے اس سے لپٹ کر بولی۔ ’’مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ آپ پھر ایک بار بولیں۔‘‘

’’میں کیا بولوں؟ ابھی ایک گھنٹے کے اندر قاضی صاحب آنے والے ہیں۔ تُو جا

اور نہادھو کر اچھا سا لباس پہن لے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔" آپ.....آپ مجھے اپنی شریکِ حیات بنائیں گے۔ اپنے گھر کی عزت بنائیں گے۔ اب کبھی میری بے عزتی نہیں کریں گے۔ میں جا رہی ہوں۔ وضو کر رہی ہوں۔ شکرانے کی نماز ادا کروں گی۔ یا اللہ.....! بے شک تُو ہی عزت دینے والا ہے۔ تُو ہی ذلت دینے والا ہے۔ اتنی ذلتیں اٹھانے کے بعد مجھے عزت دے رہا ہے۔ تیرا شکر ہے.....لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

وہ بولتی ہوئی بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ یہ کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ تقدیر اس سے کتنا بڑا مذاق کرنے والی ہے؟ اسے سہاگ کا جوڑا پہنا کر دلدلی راستوں پر لے جانے والی ہے۔ وہ شہباز درانی کی کوٹھی سے جواد اکبر کی کوٹھی تک اسی طرح کے فریب کھاتی آ رہی تھی۔

وہ دلہن بن گئی۔ قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ دینی احکامات کے مطابق وہ سچ مچ ایک بہت بڑے صاحب کی شریکِ حیات بن گئی تھی۔ اس خوش فہمی میں تھی کہ بیگم صاحبہ بن کر آئندہ قیدی عورت نہیں کہلائے گی۔ لیکن جواد اس کی اوقات کے مطابق کبھی کبھی اسے جیل کی چار دیواری میں بھیجنے لگا۔ تب عقل نے سمجھایا کہ اس کی حیثیت نہیں بدلے گی۔ وہ ان عورتوں میں سے ہے' جو مٹی میں رُلتے رہنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔

چار ماہ بعد وہ بیمار رہنے لگی۔ اس نے جواد سے کہا۔" میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے' ماں بننے والی ہوں۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائیں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔" اگر ماں بننے والی ہے تو میں بہت اچھی اور مہنگی لیڈی ڈاکٹر سے تیرا علاج کراؤں گا۔"

جواد اپنی ستارہ کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ بچہ اس کے لئے بہت ضروری تھا۔ اس نے صبا رانی کا علاج کرانے اور اس کی برابر نگرانی کرتے رہنے کے لئے ایک لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر لیں۔ اس بدنصیب کو پہلی بار ماں بننے کی خوشیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ یہ احساس بڑا ہی خوش کن تھا کہ وہ ایک بھرپور قابلِ قدر عورت بن چکی ہے اور وہ آنے والا بچہ اس کی قدر و قیمت بڑھا رہا ہے۔

جواد نے ستارہ کے پاس آ کر اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔" میری جان.....! تقریباً آٹھ ماہ بعد تم ایک بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

اس نے خوش ہو کر اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔" ہائے سچ کہہ رہے ہو نا؟ وہ تمہارا ہی بچہ ہوگا نا؟"

وہ اسے گود میں بٹھاتے ہوئے بولا۔" خالص دودھ اور شہد کی طرح وہ بچہ بھی خالص میرا ہی ہے۔ صبا رانی جب جیل میں آئی تو چودہ برس کی تھی۔ ابھی پندرہ برس پورے نہیں ہوئے ہیں۔ کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ وہ صرف میرے استعمال میں رہی ہے۔"

وہ بولی۔" میں اس بچے کو سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ وہ میرا اور تمہارا ہوگا اور ہم دونوں کی جائیداد کا وارث ہوگا۔"

پھر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔" اگر نعیم ہم سے دھوکا نہ کرتا تو آج ہمیں کروڑوں روپے کا منافع ہوتا رہتا۔"

اس نے ناگواری سے کہا۔" میں اس ذلیل دھوکے باز کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

" تم اسے مار ڈالو گے تو میرا کیا فائدہ ہوگا؟"

" اس نے ہمیں ذلیل کر کے اپنے دفتر سے نکالا تھا۔ میں کم از کم اس ذلت کا بدلا تو لے سکوں گا۔"

" اس کا بزنس ہمارے مقابلے میں زیادہ پھیل رہا ہے۔ وہ زیادہ منافع حاصل کر رہا ہے۔ اس کے مر جانے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ وہ زندہ رہے اور ہم اس کا سب کچھ چھین کر اسے کنگال بنا دیں۔"

" اس کی کوئی بڑی کمزوری ہاتھ نہیں آ رہی ہے۔ جس دن ہتھے چڑھے گا' میں اسے کنگال بنا کر تمہارے قدموں میں جھکا دوں گا۔"

" وہ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا نمک حرام بہت ہی خوش نصیب ہے۔ میرے ڈیڈ کی دولت لوٹ کر عیاشی کر رہا ہے۔ اوپر سے باپ بننے والا ہے۔ آفرین کے پاؤں بھاری ہیں۔ وہ اس کے لئے ایک وارث پیدا کرنے والی ہے۔"

وہ خوش ہو کر اسے چومتے ہوئے بولا۔" تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ ''تم خوش ہو رہے ہو؟''

''تمہیں بھی خوش ہونا چاہئے۔ اس کی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آ رہی ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں...؟''

''ابھی کچھ نہ سمجھو۔ بس دیکھتی رہو۔ میں آفرین اور اس کے ہونے والے بچے کے ذریعے اسے توڑ کر رکھ دوں گا۔ آج وہ بہت کامیاب بزنس مین کہلاتا ہے۔ کل اسے فٹ پاتھ پر لے آؤں گا۔''

نعیم صدیقی نادان نہیں تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سانپ ڈسنے سے باز نہیں آتا ہے۔ جواد کبھی نہ کبھی اپنی ذلت کا بدلا ضرور لے گا۔ مگر کیسے لے گا' یہ نہیں جانتا تھا۔

وہ آفرین کے ساتھ ایک اچھی ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ اتوار کے دن کاروباری معاملات سے چھٹی ملتی تھی۔ وہ سارا دن اسی کے ساتھ گزارتا تھا۔ کہیں نہ کہیں آؤٹنگ کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس روز وہ چھٹی منانے ہاکس بے کے ایک کاٹیج میں آئے۔ وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ ساحل پر مرد' عورتیں اور بچے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں بڑی دیر تک وہاں ٹہلتے رہے۔ پھر آفرین نے کہا۔ ''میں تھک گئی ہوں۔ کاٹیج میں چلو۔''

وہ ادھر جانے لگے۔ ایسے ہی وقت ایک شناسا سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کاروباری معاملات میں بہت اہم گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ نعیم نے کہا۔ ''آفرین! تم اندر جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ اپنے کاروباری شناسا کے ساتھ اُس کے کاٹیج کی طرف چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس کا خیال تھا' وہ اپنے محبوب شوہر سے عارضی طور پر جدا ہو رہی ہے۔ مگر تقدیر نے دائمی جدائی لکھ دی تھی۔ وہ جیسے ہی کاٹیج میں داخل ہوئی اچانک ہی جواد اکبر اس کے پیچھے دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی گھبرا کر بولی۔ ''تم...؟''

اس نے ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ تم چپ رہو گی تو یہ بھی چپ رہے گا اور جب بولے گا' تب بھی آواز باہر تک نہیں جائے گی۔''

وہ سہم کر بولی۔ ''تم۔ تم یہ ریوالور کیوں دکھا رہے ہو؟ تمہارے ارادے کیا ہیں؟''

''تم نادان نہیں ہو۔ سمجھ سکتی ہو' ارادہ نیک نہیں ہے۔ اگر میرے ساتھ چپ

چاپ چلو گی تو زندہ رہو گی۔ ورنہ یہیں ماری جاؤ گی۔''

''مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''کوئی سوال نہ کرو۔ یہ ریوالور میرے کوٹ کی جیب میں رہے گا اور تم نشانے پر رہو گی۔ ابھی میرے ساتھ گاڑی میں چل کر بیٹھو گی۔ جہاں لے جاؤں گا۔ وہاں چلو گی۔ چپ چاپ میرے احکامات کی تعمیل کرتی رہو گی تو زندہ واپس آ سکو گی۔''

وہ بولی۔ ''تم نے ٹھیک کہا ہے' میں نادان نہیں ہوں۔ تمہارے ارادے کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ یہاں سے کہیں دور لے جا کر مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔''

وہ پیچھے ہٹتی ہوئی بیڈ کے پاس آ گئی۔ پھر بولی۔ ''جو کہنا ہے' یہیں کہو۔ کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے ہو تو بولو... میں وعدہ کرتی ہوں' میرا نعیم تمہاری کسی بات سے' کسی سمجھوتے سے انکار نہیں کرے گا۔''

''مجھے باتوں میں نہ الجھاؤ۔ میں جانتا ہوں' وہ کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہے۔ آخری بار پوچھ رہا ہوں' میرے ساتھ چلو گی یا نہیں؟''

''میں سمجھ رہی ہوں' تم میرے ذریعہ نعیم کو بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ اس سے اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں' تمہارے مطالبات یہیں پورے ہوں گے۔''

وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''میں پھر ایک بار پوچھ رہا ہوں' میرے ساتھ چلو گی یا نہیں؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں... تم جو چاہو گے' وہ تمہیں یہیں ملے گا۔ پھر کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟''

بات ختم ہوتے ہی جواد نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کا نشانہ لیا۔ پھر گولی چلا دی۔ فائر کی دھیمی سی آواز کاٹیج کے باہر تک نہیں گئی۔ آفرین کے حلق سے بھی چیخ نہ نکل سکی۔ بس ایک کراہ نکلی اور وہ بیڈ پر گر پڑی۔

ایک گولی سے ایک وقت میں کسی ایک ہی کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مگر اس نے ایک ہی گولی سے ماں اور بچے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ وہ مر چکی ہے۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا کاٹیج سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نعیم صدیقی واپس آیا تو آفرین کی لاش دیکھتے ہی چند لمحوں کے لئے سکتے میں رہ گیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اسے چھو کر' جھنجھوڑ کر آوازیں دینے لگا۔ مگر وہ موت کی نیند سو چکی تھی۔

ایک محبوبہ' ایک شریکِ حیات کی موت اسے صدمہ پہنچا رہی تھی۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا.... یہاں کون آیا تھا؟ کس نے اسے قتل کیا ہے؟

وہ تلملاتا ہوا کاٹیج سے باہر آیا۔ دور دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ کتنے ہی محبوب اپنی محبوباؤں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کوئی مشکوک شخص دور بھاگتا ہوا یا کار میں جاتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کسی پر شبہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے موبائل فون کے ذریعے اپنے ایک شناسا پولیس افسر کو اس واردات کی اطلاع دی۔ پھر اس کا انتظار کرنے لگا۔

کاٹیج میں آفرین کا بیگ اور دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ ان چیزوں کی تلاشی لینے لگا۔ نقدی اور زیورات کے علاوہ آفرین کا قیمتی موبائل فون بھی وہاں موجود تھا۔ کوئی چور یا ڈاکو آیا ہوتا تو پہلے ان چیزوں پر ہاتھ صاف کرتا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا.... جو بھی آیا تھا' وہ صرف قتل کی نیت سے آیا تھا۔

اس نے جواد اکبر کے متعلق سوچا' کیا وہ اس حد تک گزر سکتا ہے؟ کیا خون خرابے پر اتر آیا ہے؟

نعیم کو یہ اندازہ تو تھا کہ وہ کبھی انتقامی کارروائی کرے گا۔ لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ جان لیوا دشمنی پر اتر آئے گا۔

اس کا دوست پولیس افسر طفیل احمد چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایمبولینس بھی لایا تھا۔ آفرین کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ایک ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ نعیم صدیقی نے پولیس افسر سے کہا۔ "طفیل....! مجھے جواد اکبر پر شبہ ہے۔ تم اسے طلب کرو۔ کسی بھی طرح اس سے حقیقت اگلواؤ۔ یقیناً یہ اسی کا کام ہے۔"

طفیل احمد نے کہا۔ "ہوں.... کوئی قاتل اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتا۔ لیکن بیان دیتے وقت کسی بھی مجرم سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی ہے۔ جس کے باعث وہ پکڑا جاتا ہے۔ میں اسے گرفت میں لینے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اس کا سیل نمبر بتاؤ۔"

نعیم صدیقی نے نمبر بتایا۔ اس نے اپنے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جواد اکبر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو... کون؟"

طفیل احمد نے پوچھا۔ "کیا تم جواد اکبر ہو؟"

"ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔ مگر تم کون ہو؟"

"میں ایس پی طفیل احمد ہوں۔ ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ فوراً میرے آفس میں چلے آؤ۔"

"سوری آفیسر...! میں فوراً ہی نہیں آ سکتا۔ حیدر آباد میں ہوں۔ بائی داوے... آپ مجھے اپنے آفس میں کیوں طلب کر رہے ہیں؟"

"مجھ سے سوال نہ کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔ کیا تم ثابت کر سکتے ہو' اس وقت حیدر آباد میں ہی ہو؟"

"آف کورس ثابت کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہونا چاہئے' معاملہ کیا ہے؟ کیا میرا فون نمبر دینے والے نے صرف میرا نام بتایا ہے؟ یہ نہیں بتایا کہ میں ضلع کے تمام جیل خانوں کا انسپکٹر جنرل ہوں؟"

طفیل احمد نے سوالیہ نظروں سے نعیم صدیقی کو دیکھا۔ پھر فون پر کہا۔ "جی ہاں۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا تھا۔ میں نے آپ کو زحمت دی ہے۔ معذرت چاہتا ہوں"

"کوئی بات نہیں۔ میں شام تک واپس آؤں گا۔ تم رات آٹھ بجے تک میری کوٹھی میں آ کر مجھ سے مل سکتے ہو۔ کسی طرح کا شک و شبہ ہو تو اسے دور کر سکتے ہو۔"

جواد اکبر نے رابطہ ختم کر دیا۔ طفیل احمد نے نعیم صدیقی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمام جیل خانوں کا انسپکٹر جنرل ہے؟ خواہ مخواہ اسے قاتل کیوں سمجھ رہے ہو؟ کیا تمہاری اس سے کوئی دشمنی ہے؟"

نعیم صدیقی نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جواد اکبر کبھی میرا رشتہ دار تھا۔ میری سابقہ بیوی ستارہ کا کزن ہے۔"

وہ دشمنی کی وجوہات اور واقعات بتانے لگا۔ طفیل احمد نے ساری روداد سننے کے بعد کہا۔ "یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم اسے اپنی بیوی کا قاتل ثابت کر سکو گے۔ وہ قانون

سے کھیلنے والا شخص اپنے بچاؤ کے ہتھکنڈے خوب جانتا ہوگا۔“

واقعی اس نے ٹھوس پلاننگ کے مطابق واردات کی تھی۔ یہ ثابت کردیا کہ آفرین کے قتل کے وقت وہ حیدرآباد میں تھا۔ چار ماہ بعد نعیم صدیقی کاروبار کے سلسلے میں لندن آیا۔ وہاں ایک ہوٹل میں لنچ کے لئے پہنچا تو جواد اکبر اچانک ہی اس کے سامنے آگیا۔ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہائے نعیم...! اکیلے ہو؟ کیا آفرین کو ساتھ نہیں لائے؟“

پھر خود ہی چونک کر بولا۔ ”او... میں تو بھول ہی گیا۔ اس کا مرڈر ہو چکا ہے... سو سیڈ۔“

نعیم نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اظہارِ افسوس کر چکے ہو تو یہاں سے جاؤ۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے اپنے دفتر سے نکال دیا تھا۔ یہ تمہارے باپ کا ہوٹل نہیں ہے۔ ویسے چلا جاؤں گا۔ میں نے اس روز بھی تم سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ آج بھی نہیں کروں گا۔“

نعیم اسے گھور کر دیکھ رہا تھا اور وہ بول رہا تھا۔ ”اس روز میں نے آفس میں مطالبہ کیا تھا کہ تم نے ستارہ کے مرحوم باپ کی جو دولت و جائیداد لوٹی ہے۔ ان کے کاروبار کو جو نقصان پہنچایا ہے۔ ان سب کی تلافی کرو اور لوٹا ہوا مال واپس کردو۔“

”جاؤ.... پہلے یہ ثابت کرو کہ میں نے لوٹ مار کی ہے۔“

”مجھے کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں عدالت کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔ اپنے برے وقت کو سمجھو.... ازدواجی اور گھریلو معاملات میں بہت بڑا نقصان اٹھا چکے ہو۔ ایک بیوی کے ساتھ ہونے والے بچے کو بھی کھو چکے ہو۔“

نعیم نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کیا قاتل کا سراغ مل رہا ہے؟ بائی داوے... سراغ مل جائے گا‘ تب بھی تم قاتل کے خلاف کیا کرلو گے؟ تمہیں سنجیدگی اور ذہانت سے یہ سوچنا سمجھنا چاہئے کہ کسی سے دشمنی نہ بڑھائی جائے۔“

نعیم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”بڑے کام کی باتیں سمجھا رہے ہو... آگے بولو؟“

”میں تو بول چکا۔ سمجھدار کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔“

”میں سمجھدار نہیں ہوں۔ مجھے سمجھاؤ۔ تم سے دشمنی کر کے اپنی بیوی اور بچے کو داؤ پر لگا چکا ہوں۔ اگر لوٹی ہوئی دولت واپس نہ کی تو آگے میرا کیا بنے گا؟“

جواد اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ تمہاری جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ جو تم نے کاروبار پھیلا رکھا ہے۔ اس کی تمام آمدنی پر ستارہ کا حق ہے۔ اگر تم اب بھی اس کے حقوق ادا کرنے سے انکار کرو گے تو بہت جلد ہاتھ میں کانسہ لے کر فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤ گے۔“

”اپنی پلاننگ بتاؤ کہ سمجھوتا کس طرح ہوسکتا ہے؟“

”بہت آسان سی بات ہے۔ تم نے ستارہ کو طلاق دی ہے۔ یہ بات خاندان کے چند ہی افراد جانتے ہیں۔ باقی سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ تم دونوں کے درمیان عارضی علیحدگی ہوئی ہے۔ تم ستارہ سے رجوع کرو گے۔ پھر اس کے ساتھ ایک شوہر کی حیثیت سے زندگی گزارو گے تو تمام دشمنی ختم ہو جائے گی۔“

نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اوہ سمجھ گیا... ستارہ پھر سے میری بیوی کہلائے گی۔ اس کے بعد میرا مرڈر ہوگا تو نعیم صدیقی کی بیوہ میری تمام دولت اور جائیداد کی مالک بن جائے گی۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”میں کہہ چکا ہوں‘ تمہاری جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنی زندگی سے بہت محبت ہے۔ یہ ایک ہی بار ملتی ہے۔ مرجاؤں گا تو پھر لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ لہٰذا ابھی جاؤ اور مجھے سوچنے دو۔ ہوسکتا ہے‘ پاکستان آکر ستارہ کو اپنی شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول کرلوں۔“

وہ مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہی کرنا چاہئے۔ اسی میں تمہارے کاروبار کی بہتری اور تمہاری سلامتی ہے۔ میں اس یقین کے ساتھ جارہا ہوں کہ تم ایسا ہی دانشمندانہ فیصلہ کرو گے۔“

وہ وہاں سے چلا گیا۔ نعیم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے پہلے ہی شبہ تھا کہ وہی اس کی آفرین اور ہونے والے بچے کا قاتل ہے۔ آج اس کی باتوں سے شبہ یقین میں بدل رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ بھوک اُڑ گئی تھی۔ وہ ہوٹل سے باہر آکر فون کے

ذریعہ کسی سے رابطہ کرتے ہوئے بولا۔"ہیلو میں لندن میں ہوں۔ تین روز بعد واپس آؤں گا۔ میرے آنے سے پہلے ایک بہت بڑا کام کرنا ہے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔"سر! آپ کے لئے جان بھی حاضر ہے۔ حکم کریں؟"

"میری سابقہ شریکِ حیات ستارہ کو جانتے ہو؟"

"یس سر...! اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اسے اغوا کرنا ہے۔ پورے ایک لاکھ دوں گا۔"

"کام ہو جائے گا سر! میڈم کو کہاں پہنچانا ہے؟"

"میں نے شہر سے باہر ایک نیا فارم ہاؤس خریدا ہے۔ اس کے بارے میں صرف تم ہی جانتے ہو کہ وہ میری ملکیت ہے۔"

"او کے سر...! میں سمجھ گیا۔ میڈم کو وہیں پہنچاؤں گا۔"

"ستارہ کو کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ وہ چیخنا چلانا چاہے۔ فرار ہونا چاہے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ پر ٹیپ لگا دینا۔ مگر کسی قسم کی زیادتی نہ کرنا۔"

"ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں سر...!"

"ہاں۔ ضرور پوچھو۔"

"آپ میڈم سے دشمنی بھی کر رہے ہیں اور ان کا اتنا خیال بھی رکھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ میرے محسن کی بیٹی ہے۔ میں تمہارا محسن ہوں۔ کیا تم کبھی مجھے یا میرے کسی عزیز کو نقصان پہنچانا چاہو گے؟"

"ہرگز نہیں سر! میں میڈم کو بڑی عزت سے رکھوں گا۔"

"یہ کام میرے آنے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔"

نعیم نے جواب سن کر مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔ وہ تین دنوں کے بعد پاکستان جانے والا تھا۔ جواد اکبر اس سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ ستارہ نے فون پر کہا تھا کہ وہ اس سے ملنے ائیر پورٹ آ رہی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر قرار نہیں آتا تھا۔ آندھی طوفان بھی آ جاتا' تب بھی وہ اپنے عاشق سے ملنے ائیر پورٹ ضرور آتی۔

مگر وہ نہیں آئی...جواد اکبر نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ اس دیوانی کو آنے

سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ پھر بھی وہ نہیں آئی۔ اس نے فون کے ذریعے اس سے رابطہ کرنا چاہا۔ مگر ٹیپ سے بار بار یہی آواز سنائی دیتی رہی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

اس نے پریشان ہو کر اس کی ماں سے رابطہ کیا۔"پھوپھی جان..! میں یہاں آ گیا ہوں۔ ستارہ کہاں ہے؟ اس نے ایئر پورٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

اس نے کہا۔"وہ تو یہاں سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل چکی تھی۔ کیا تم نے اسے فون کیا ہے؟"

"کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ اینی وے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ وہ یہیں بھیڑ میں کہیں ہو گی۔"

وہاں مسافروں کا اور ان کے رشتے داروں کا ہجوم تھا۔ وہ اسے دور دور تک تلاش کرتا رہا۔ بار بار فون کرتا رہا۔ مایوسی کہہ رہی تھی کہ اسے آسمان کھا گیا ہے یا پھر زمین نگل چکی ہے۔

اگر چہ وہ مختلف معاملات میں مکار اور خود غرض تھا۔ مگر ستارہ سے دلی لگاؤ رکھتا تھا۔ پھر یہ کہ صبا رانی کی کوکھ سے جنم لینے والا بچہ ستارہ کی گود میں پرورش پا کر اس کی دولت اور جائیداد کا حقدار بننے والا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

ایسے وقت فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے ننھی سی اسکرین پر ستارہ کا نام پڑھا پھر فوراً ہی فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔"کہاں ہو تم؟ میں ائیر پورٹ پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

فون پر سسکیاں سنائی دیں۔ وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔"ستارہ! میری جان! کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ کہاں ہو تم؟ مجھے بتاؤ۔ میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔"میں کسی بات کا جواب نہیں دے سکوں گی۔ ابھی ایک ہی بات کہتی ہوں۔ میری گمشدگی کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ پولیس کی مدد لو گے تو یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

اس نے پوچھا۔"وہ کون لوگ ہیں؟ ان سے میری بات کراؤ۔ ہیلو....ہیلو...."

اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ پریشان

ہوکر سوچنے لگا۔ ”یہ اچانک کیا ہوگیا ہے؟ ستارہ کو کس نے اغوا کیا ہے؟“

اس نے اس کی ماں کے پاس آکر کہا۔ ”اپنا دل مضبوط کریں اور بری خبر سنیں۔ ہماری ستارہ کو اغوا کیا گیا ہے۔“

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”ہائے میری بچی! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے؟“

”اس نے مجھے فون کیا تھا۔ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ ہم اس کی گمشدگی کا اعلان نہ کریں۔ اگر پولیس سے مدد لیں گے تو وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔“

”آخر وہ کون لوگ ہیں؟ ہم سے کیوں دشمنی کر رہے ہیں؟“

”کوئی ہم سے خاص طور پر دشمنی نہیں کر رہا ہے۔ یہ ایک مجرمانہ واردات لگتی ہے۔ وہ یقیناً ہمیں فون کریں گے اور ستارہ کی واپسی کے لئے بھاری رقم کا مطالبہ کریں گے۔“

وہ دوسروں پر جبر کرنے والا بڑی بے بسی سے صبر کرنے لگا۔

نعیم صدیقی کو لندن میں اطلاع مل گئی تھی کہ اس کی پلاننگ کے مطابق ستارہ کو نئے فارم ہاؤس میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس نے فون کے ذریعے جواد اکبر کو مخاطب کیا۔

”ہیلو جواد! آرام اور سکون سے ہو؟“

وہ ستارہ کے لئے پریشان تھا۔ بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ فون پر بھی اپنی معشوقہ سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے وقت نعیم سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے طنزیہ لہجے نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”سیدھی سی ایک بات کہہ رہا ہوں۔ آفرین کی ہلاکت کے بعد میرا آرام اور سکون غارت ہوگیا ہے۔ اس لئے تم سے پوچھ رہا ہوں' آرام سے تو ہونا...؟“

اس نے ایکدم سے تڑپ کر پوچھا۔ ”ستارہ کہاں ہے؟“

”آرام سے ہے۔ مگر تمہارے بغیر اسے سکون نہیں مل رہا ہے۔“

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔“

”مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ کیا بیماری پیوگے؟“

”تم بہت پچھتاؤ گے۔ میں تمہیں تباہ و برباد کر دوں گا۔“

”پہلے اپنی بربادی سے تو نمٹ لو۔“

”دیکھو! تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ کسی بھی لمحے میں ایک اندھی گولی تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گی۔“

”میں اس اندھی گولی کا انتظار کروں گا۔“

وہ غصے کے مارے کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ ایک جگہ سکون سے بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ستارہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ایک بار کر چکے ہو۔ دوسری بار بات کرنے کی بے چینی کو برقرار رہنے دو۔“

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ”تم چاہتے کیا ہو؟ کیا مطالبہ ہے تمہارا؟“

”پہلے تم نے مطالبہ کیا تھا کہ میں ستارہ کی دی ہوئی دولت واپس کر دوں۔“

”تم ستارہ کو واپس کرو۔ میں کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔“

”اتنی جلدی ہتھیار ڈال رہے ہو۔ تم تو مجھے کنگال بنا کر فٹ پاتھ پر پہنچانے والے تھے؟“

‘فضول باتیں نہ کرو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مجھ سے سمجھوتہ کرو۔“

”سمجھوتہ ایک ہی صورت میں ہوگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا چھینا ہوا مال واپس کریں گے۔“

”میں نے تم سے کچھ نہیں چھینا ہے۔“

”تمہاری یادداشت کمزور ہوگئی ہے۔ ابھی بحال ہو جائے گی۔ یہ بتاؤ' میں نے تم سے کیا چھینا ہے؟“

وہ پھر دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”میری ستارہ کو... کیوں بچکانہ سوال کر رہے ہو؟“

”یعنی تمہاری محبوبہ کو چھینا ہے؟ اب بتاؤ' میری بیوی' میرے ہونے والے بچے کی ماں کہاں ہے؟“

یہ ایسا سوال تھا کہ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”وہ۔ وہ۔ تمہارا معاملہ ہے۔ تم جانتے ہوگے۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

"اس لئے کہ اپنی آفرین اور ہونے والے بچے کی واپسی چاہتا ہوں۔ یہ مطالبہ پورا کردو۔ پھر تمہارا مال تمہیں واپس مل جائے گا۔"

"یہ کیسا مطالبہ ہے؟ جانتے ہو وہ مرنے والے واپس نہیں آئیں گے۔"

"ستارہ بھی مرے گی تو واپس نہیں آسکے گی۔"

وہ ایکدم سے تڑپ کر بولا۔ "نہیں۔ تم اسے قتل نہیں کرو گے۔ جتنی رقم چاہو گے تمہیں ملے گی۔"

"مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ میں تم سے زیادہ دولتمند ہوں۔ چپ چاپ بیٹھ کر سوچو کہ وہ زندہ کیسے رہے گی؟ کیسے واپس آئے گی؟ کیا اس سلسلے میں مجھ پر کسی طرح کا الزام عائد کرسکو گے؟"

پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم نے آفرین کے مرڈر کے وقت ثابت کیا تھا کہ حیدرآباد میں ہو۔ اب ستارہ کو اغوا کیا گیا ہے اور میں لندن میں ہوں۔ یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جائے واردات سے سات سمندر دور ہوں۔ تمہارا حربہ تم ہی پر آزما رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ جوادا کبر چیخنے لگا۔ "ہیلو ہیلو....فون بند نہ کرو۔ میری بات سنو...ہیلو ہیلو"

پھر اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ جب فون بند ہو چکا ہے تو وہ بات کیسے سنے گا؟ یوں کسی سمجھوتے کے بغیر رابطہ ختم کرنے کا مطلب یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ ستارہ کو واپس نہیں کرے گا۔ انتقاماً اسے مار ڈالے گا۔

اس نے فوراً ہی نعیم کے نمبر پنچ کئے۔ پھر رابطہ ہوتے ہی کہا۔ "دیکھو! فون بند نہ کرنا۔ پہلے میری بات سن لو۔ ستارہ کو قتل کر کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کوئی ایسا راستہ نکالو کہ تمہیں بہت کچھ حاصل ہو جائے اور وہ خواہ مخواہ ماری نہ جائے۔"

"ہاں۔ ایسا ایک راستہ نکل سکتا ہے۔ تم پکے کاغذ پر لکھو کہ میں کبھی قتل یا کسی حادثے میں مارا جاؤں یا میری موت خودکشی ثابت ہو تو وہ ہرگز خودکشی نہیں ہوگی۔ میری غیر طبعی موت میں تمہارا ہاتھ ہوگا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ تو تم مجھے پھنسانے کی بات کر رہے ہو؟ کبھی سچ مچ کسی

حادثے میں مارے جاؤ گے تو مجھے سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔"

"میں بحث نہیں کروں گا۔ تمہارے سامنے ایک ہی راستہ ہے۔ میری مرضی کے مطابق کاغذ لکھ کر رکھو پاکستان آؤں گا تو جیتی جاگتی ستارہ کو تمہاری جھولی میں ڈال دوں گا۔"

اس نے پھر رابطہ ختم کردیا۔ اس بار جوادا کبر کو ذرا اطمینان ہوا کہ سمجھوتے کی اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں۔ وہ نعیم صدیقی کا انتظار کرنے لگا۔ نعیم دوسرے ہی دن پاکستان آگیا۔ مگر اس نے اپنی آمد کو راز میں رکھا۔ ایئرپورٹ سے سیدھا فارم ہاؤس میں آیا۔ ستارہ کو ایک کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو اس نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "تم....؟ نعیم! تم مجھے یہاں سے لے جانے آئے ہو؟"

اسے رہائی پانے کی امید تھی۔ وہ قریب آکر بولی۔ "ہاں۔ میں تمہارے محسن کی بیٹی ہوں۔ تم احسان فراموش نہیں ہو۔ مجھے دشمنوں سے نجات دلانے آئے ہو۔"

"ہاں۔ پہلے میں احسان فراموش نہیں تھا۔ مگر تم نے بنا دیا۔ اپنے یار کے بچے کو پیٹ میں رکھ کر مجھے دھوکہ دینا چاہتی تھیں۔ اگر آفرین بھید نہ کھولتی تو میں تم ماں بیٹی کا فرمانبردار اور احسان مند رہ کر فریب کھاتا رہتا۔"

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "پلیز۔ جو ہو چکا ہے' اسے بھول جاؤ۔ تم بھی میرے ڈیڈی کی دولت لوٹ کر' اپنا کاروبار جما کر مجھ سے انتقام لے چکے ہو۔ میں اب بھی تمہیں اپنا مجازی خدا مانتی ہوں۔"

نعیم نے اسے دھکا دیا۔ وہ پیچھے چلی گئی۔ اس نے حقارت سے کہا۔ "میں باسی ہانڈی کو منہ نہیں لگاتا۔"

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "تم بزنس مین ہو۔ سیکنڈ ہینڈ مال خرید کر اسے چمکاتے ہو' اس سے منافع حاصل کرتے ہو۔ میں بھی سیکنڈ ہینڈ ہوں۔ تم مجھ سے اور میں تم سے منافع حاصل کرسکتی ہوں۔"

نعیم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "وہ کیسے....؟"

"کوئی نہیں جانتا' تم مجھے طلاق دے چکے ہو۔ ہمارے رشتے دار یہی سمجھتے ہیں

کہ ہم نے عارضی طور پر علیحدگی اختیار کی ہوئی ہے۔ ہم پھر میاں بیوی بن کر ایک دوسرے کے کاروبار میں شریک رہیں گے۔ ایک دوسرے کے منافع میں شیئر کریں گے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آئیڈیا اچھا ہے۔''

وہ پھر قریب ہو کر گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''اچھا ہے تو پھر مجھے گلے لگاؤ۔''

وہ اسے دور ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''لگاؤں گا۔ پہلے معاملات طے ہو جائیں۔ تم میری بیوی بن کر رہو گی تو ایک بڑا نقصان ہوگا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیسا نقصان....؟''

''تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ پھر اتنی ساری دولت اور جائیداد کا وارث کہاں سے آئے گا؟''

''میری خاطر ایک سمجھوتہ کرو گے تو وارث بھی مل جائے گا۔''

''کیا کسی لاوارث بچے کو گود لینے کی بات کرو گی؟''

''وہ لاوارث نہیں ہوگا۔ جواد ایک بچے کا باپ بننے والا ہے۔ تم اعتراض نہیں کرو گے تو وہ اپنا بچہ مجھے دے دے گا۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''یار کے نطفے کو کلیجے سے لگا کر رکھنے کا بڑا شوق ہے۔ بائی داوے اس نے شادی نہیں کی ہے۔ پھر تمہارے لئے بچہ کہاں سے لائے گا؟''

''اس نے میری خاطر ایک لڑکی سے عارضی طور پر نکاح پڑھوایا ہے۔''

نعیم نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے جھانسا دے کر بہت سی معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو ہمارے درمیان سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ مگر.....''

''مگر کیا....؟''

''ہم پھر سے میاں بیوی بن کر جس بچے کی پرورش کریں گے' اس کی ماں کے متعلق مجھے معلوم ہونا چاہئے۔''

''ماں کوئی بھی ہو۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا کیا ضروری ہے؟''

''اگر ہم میاں بیوی ایک دوسرے کے راز دار بن کر نہیں رہیں گے۔ تم مجھ سے

باتیں چھپاؤ گی تو میں تم سے سمجھوتہ نہیں کروں گا۔''

''پلیز۔ ایسا نہ کہو۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ ہم جواد کے ساتھ بیٹھ کر سارے معاملات طے کریں گے۔''

''وہ تو میں طے کر چکا ہوں۔ ہم اس کے بچے کو گود لیں گے۔ جب اتنی بڑی بات مان رہا ہوں تو پھر مجھ سے اس عورت کی کوئی بات کیوں چھپا رہی ہو؟ کیا پھر مجھے دشمن بنانا چاہتی ہو؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں۔ میں اپنے ڈیڈی کی دولت تقسیم نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری بیوی بن کر رہوں گی۔''

''تو پھر بتاؤ' ہم کس عورت کے بچے کو گود لیں گے؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے نعیم کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''وہ۔ دراصل ایسی عورت ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ جواد کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ وہ قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔''

نعیم نے اسے پگھلانے کے لئے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ پیار مانگ رہی تھی۔ اس نے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں ہی جواد کے راز دار بن کر رہیں گے۔ اس طرح میری اور جواد کی دشمنی بھی ختم ہو جائے گی۔ ہم تینوں یک جان تین قالب بن کر رہیں گے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ مگر ایک بار مجھے فون پر اس سے بات کرنے دو۔''

''یعنی تم مجھے نہیں' اسے اہمیت دے رہی ہو؟ جبکہ ہم تینوں کی برابر اہمیت ہونی چاہئے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات سمجھا رہا ہوں کہ پہلے میرا اعتماد حاصل کرو۔ پھر ہم جواد کو اپنے اعتماد میں لیں گے۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں ہے تو میں جا رہا ہوں۔''

وہ جانے کے لئے پلٹ رہا تھا۔ وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ''رک جاؤ۔ تم درست کہہ رہے ہو۔ پہلے تمہارا اعتماد حاصل کرنا چاہئے۔ آؤ... یہاں آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔''

وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ ''تم میرے ڈیڈی کو اپنا محسن مانتے ہو۔ مجھے یقین ہے' دھوکہ نہیں دو گے۔ ہم تینوں سمجھوتہ کر کے پیار محبت سے رہیں گے۔''

"پلیز۔ مجھ پر بھروسہ کرو اور اصل بات بتاؤ؟"

وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ پھر بولی۔ "وہ سینٹرل جیل کی ایک قیدی عورت ہے۔ اس کا نام صبارانی ہے۔"

نعیم نے کہا۔ "ہوں۔ جواد اس ضلع کی تمام جیلوں کا انسپکٹر جنرل ہے۔ بڑی آسانی سے کسی قیدی عورت کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

"اس نے صبارانی کو مجبور نہیں کیا ہے۔ وہ راضی خوشی اس کے نکاح میں آئی ہے۔"

یہ نکاح یقیناً رازداری سے ہوا ہوگا؟"

"ظاہر ہے۔ جواد ایک اعلیٰ عہدیدار ہے۔ کسی سزا پانے والی عورت سے نہ کھل کر شادی کر سکتا ہے' نہ اس کا مستقل شوہر بن کر رہ سکتا ہے۔ بچہ ہونے کے بعد وہ اس عورت کو چھوڑ دے گا۔"

"کیا وہ صبارانی اس بات پر راضی ہے؟"

"راضی کیسے نہیں ہوگی؟ اسے امید ہے' بڑے صاحب کا حکم مانتی رہے گی تو ایک دن رہائی مل جائے گی۔"

وہ ذرا سوچنے کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے۔ مگر ایک عورت اپنے خاوند کو چھوڑ سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک ماں اپنے بچے سے الگ نہیں ہوتی۔ وہ تو اس کی جان ہوتا ہے۔ اس کی ممتا..."

"ممتا کو مارو گولی.....وہ بچہ کسی بھی طرح مل جائے گا۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ اس کے بعد درخت کٹ کر گر جائے ہماری بلا سے..."

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "رائٹ یو آر...ہمیں تو ایک بچہ چاہئے۔ صبارانی جائے جہنم میں مگر...."

ستارہ نے پوچھا۔ "مگر کیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ لفظ مگر بھی کیا ہے؟ بات بنتے بنتے اچانک مگر آجائے تو بنتی ہوئی بگڑ جاتی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا کہ صبارانی جیل کے جہنم میں رہے گی یا نہیں مگر.....جواد جہنم میں پہنچ جائے گا۔"

وہ ایکدم سے اچھل پڑی۔ ذرا دور ہو کر بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میری بات توجہ سے سنو۔ تم نے جواد کے بچے کو جنم دینے کے لئے مجھ سے شادی کی۔ مجھے دھوکہ دیا۔ میں نے بھی انتقاماً کاروباری معاملات میں تمہیں دھوکہ دیا۔"

"کیوں اس بات کو دہرا رہے ہو؟ حساب برابر ہو چکا ہے۔"

"جواد سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔ اس نے میری آفرین کو ہونے والے بچے سمیت قتل کیا ہے۔ اس کا انتقام تو مجھے لینا ہی ہوگا۔"

وہ فوراً ہی قریب آکر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ "پلیز نعیم! ایسا نہ کہو۔ ابھی ہم پیار و محبت سے مل جل کر رہنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ جواد نے دشمن بن کر ایک غلطی کی۔ تم دوست بن کر معاف کر دو۔ یہ انتقامی رویہ ہم سب کو تباہ کر دے گا۔ تم بھی تباہی سے بچ نہیں پاؤ گے۔"

"تم میری نہیں' اپنے یار کی فکر کرو۔ خون کا بدلہ خون۔ آفرین کے بدلے تمہیں مرنا ہوگا یا پھر وہ مرے گا۔"

وہ جیسے جنون میں مبتلا ہو گئی۔ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "میں مروں گی۔ مجھے مار ڈالو۔ میں اپنے جواد کو مرنے نہیں دوں گی۔ تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ انتقام کی آگ بجھاؤ۔ مجھے مار ڈالو..."

وہ اسے دھکا دے کر الگ کرتے ہوئے بولا۔ "واہ...کیا دیوانگی ہے اس کے لئے....اسے بچانے کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہی ہو۔ مگر افسوس! میں اپنے محسن کی بیٹی کو جانی یا جسمانی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

"تو پھر اس کی جان کی قیمت بتاؤ' تم جو مانگو گے۔ وہ دوں گی۔"

"تم مجھ سے زیادہ دولتمند نہیں ہو۔ مجھے کیا دے سکو گی؟"

"میرے پاس جتنی بھی دولت ہے' وہ سب تمہارے نام کر دوں گی۔"

"میں مال و زر نہیں چاہتا۔ اپنی سلامتی چاہتا ہوں۔ اگر جواد کچے کاغذ پر لکھ دے

کہ کبھی میں قتل کیا جاؤں یا حادثے میں مارا جاؤں یا خودکشی کروں تو ایسی تمام واردات میں اس کا ہاتھ ہوگا۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں اسے راضی کرلوں گی۔ وہ یہ کاغذ لکھ دے گا۔"

نعیم نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس سے کبھی یہ نہیں کہو گی کہ تم نے مجھے صبا رانی کے متعلق بہت کچھ بتایا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں اس سلسلے میں تمہارا رازدار بن گیا ہوں۔"

وہ نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ "میرے لئے جواد کی سلامتی اہم ہے۔ تم جو کہہ رہے ہو۔ وہی کروں گی۔"

رابطہ ہوتے ہی اس نے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو... جواد! میں بول رہی ہوں۔"

اس نے بڑی سے محبت سے پوچھا۔ "میری جان! تم خیریت سے ہونا...؟"

"میری فکر نہ کرو۔ ہم نعیم کی شرط مان لیں گے تو مجھے ابھی رہائی مل جائے گی۔"

وہ اس کی شرط بیان کرنے لگی۔ جواد نے کہا۔ "اس نے مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔ میں نے پکے کاغذ پر لکھ دیا ہے کہ وہ غیر طبعی موت مرے گا تو میں اس کا قاتل کہلاؤں گا۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "واقعی تم مجھے دل وجان سے چاہتے ہو۔ مجھے رہائی دلانے کے لئے تم نے اتنی بڑی بات لکھ دی ہے۔ خدانخواستہ نعیم کسی حادثے میں مارا جائے گا تو قانون کا پھندہ تمہارے ہی گلے میں پڑے گا۔"

"میری پرواہ نہ کرو۔ میں یہ کاغذ لکھنے کے بعد بھی اپنے بچاؤ کی تدبیر کرلوں گا۔ تم اس سے رہائی کی بات کرو۔"

ستارہ نے نعیم سے کہا۔ "میرے جواد نے تمہاری مرضی کے مطابق سب کچھ لکھ دیا۔ اب تو مجھے یہاں سے جانے دو۔"

وہ بولا۔ "اس سے کہو ایک گھنٹے بعد وہ کاغذ لے کر میری کوٹھی میں آجائے۔ میں اسے پڑھنے کے بعد تمہیں یہاں سے جانے دوں گا۔"

اس نے فون پر جواد سے یہ بات کہی۔ نعیم نے اس سے فون چھین کر اسے بند کردیا۔ پھر وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ "انتظار کرو۔ اس نے میری مرضی کے مطابق لکھا ہوگا تو دو گھنٹے کے اندر یہاں سے رہائی مل جائے گی۔"

وہ دروازے پر رک گیا۔ وہاں سے پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "صبا رانی.... جواد کی یہ کمزوری میرے ہاتھوں میں رہے گی۔ اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ یہ بات اسے معلوم نہیں ہونی چاہئے۔ اگر ہوگی اور وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے گا تو.... تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا اور میری ہلاکت کے جرم میں جواد قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔ میں وہ کاغذ لینے جارہا ہوں۔"

اس نے باہر جاکر دروازے کو لاک کردیا۔ ستارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جواد وہ کاغذ لکھ کر بری طرح پھنسنے والا تھا۔ اب وہ اس سے رابطہ نہیں کرسکتی تھی۔ اسے ایسا بیان لکھنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ آئندہ جواد کی سلامتی اسی میں تھی کہ ستارہ اسے صبا رانی کے سلسلے میں کچھ نہ بتائے۔ اپنے رازدار عاشق سے اس بات کو چھپانا لازمی ہوگیا تھا۔

دو گھنٹے بعد دو افراد دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ایک نے کہا۔ "تمہیں رہائی مل رہی ہے۔ مگر ہم یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائیں گے۔"

ستارہ نے اعتراض نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ اسے اٹھا کر ایک گاڑی کی سیٹ پر ڈالا گیا۔ وہ بند آنکھوں کی تاریکی میں چپ چاپ پڑی رہی۔ گاڑی دیر تک چلتی رہی پھر ایک جگہ رک گئی۔

اس کی آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو اس نے خود کو شہر کے ایک پسماندہ علاقے میں دیکھا۔ ایک شخص نے اس کا موبائل فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ "گاڑی سے اترو۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔"

وہ اتر گئی۔ اسے وہاں پہنچانے والے چلے گئے۔ اس نے فون کے ذریعے جواد سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

اس نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں سرجانی ٹاؤن کے ڈی اے فلیٹ کے سامنے کھڑی ہوں۔ فوراً آؤ۔"

"بس ابھی آیا۔ پریشان نہ ہونا۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔"

معشوقہ کو رہائی ملی تھی۔ وہ آندھی طوفان کی طرح چلا آیا۔ ستارہ اسے دیکھتے ہی رونے لگی۔ کار کے اندر آ کر اس سے لپٹ گئی۔ کار کے شیشے کلرڈ تھے۔ کوئی انہیں باہر سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو چومتے رہے اور نعیم کو گالیاں دیتے رہے۔ یہی دستور ہے۔ ہارنے کے بعد جیتنے والے کو گالیاں دی جاتی ہیں۔

ستارہ نے کہا۔ "تم نے میری خاطر جو تحریری بیان دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعیم سے تمہاری دشمنی ہے اور وہ دشمنی کے نتیجے میں مارا جا سکتا ہے۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بیشک۔ اس نے مجھے پھنسایا ہے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ میں جلد ہی اس پھندے سے نکل جاؤں گا۔"

ستارہ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ اس نے نعیم کو صبا رانی کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ مگر وہ الجھی ہوئی تھی۔ نعیم نے سختی سے منع کیا تھا۔ اگر جواد کو معلوم ہو جاتا کہ اس کی ایک اور کمزوری دشمن کے ہاتھ آ گئی ہے تو وہ ادھر سے بھی اپنے بچاؤ کہ تدبیر کرتا اور جب نعیم کو یہ بات معلوم ہوتی تو وہ جواد کے تحریری بیان کو اس کے خلاف ہتھیار بنا لیتا۔

ستارہ کی عقل نے یہی سمجھایا کہ جواد پہلے اس تحریری بیان کے پھندے سے نکل آئے۔ پھر وہ صبا رانی کی بات اسے بتائے گی۔ وہ بولی۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ تمہیں ایسا کاغذ نہیں لکھنا چاہئے تھا۔ وہ دشمن کسی وقت بھی انتقامی کارروائی کر سکتا ہے۔"

"میری جان! میں نے کہا نا... فکر نہ کرو۔ میرے پاس بچاؤ کی تدبیر ہے۔"

"تم کیا کر سکو گے؟"

اس نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد پوچھا۔ "نعیم کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟"

"جیسا غلاموں کا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔ میرے ڈیڈی کا احسان مند ہے۔ بڑی شرافت سے پیش آ رہا تھا۔"

"جب وہ احسان مند ہے تو دشمنی بھلا کر دوستی کر سکتا ہے۔"

"میں نے اس سے یہی کہا تھا اور وہ ہم سے دوستی کے لئے راضی ہو گیا تھا۔ تم جو کاغذ لکھا ہے' اس کے بعد تو اسے دوست بن کر ہی رہنا چاہئے۔"

"تم اس سے دوستی کرو۔ اس کے لئے میٹھا زہر بن جاؤ۔ اگر آج رات اس کے ساتھ ڈنر کی فرمائش کرو گی تو کیا وہ راضی ہو جائے گا؟"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو؟"

"راضی ہو سکتا ہے۔ صرف میں ہی نہیں ممی بھی اسے مدعو کریں گی۔ وہ ضرور آئے گا۔"

"میں چاہتا ہوں' وہ آج رات چند گھنٹوں تک اپنی کوٹھی میں نہ رہے۔ میں اپنا لکھا ہوا کاغذ وہاں سے چرا لاؤں گا۔"

"پھر تو میں جی جان سے اسے گھر بلاؤں گی۔ بلکہ ممی کے ساتھ خود اس کے گھر جاؤں گی۔"

"اس کے پاس جاؤ گی تو وہ اپنے ہی گھر میں تمہارے ساتھ ڈنر کرے گا۔ اس سے دور رہ کر اسے اپنے پاس بلاؤ۔"

"آل رائٹ.... میں یہی کروں گی۔"

دوسری طرف نعیم اپنے طور پر سوچ رہا تھا۔ "جب تک میں صبا رانی کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل نہ کر لوں اور اس قیدی عورت کو اپنے لئے مہرہ نہ بنا لوں' تب تک جواد کو اس بات سے بے خبر رہنا چاہئے۔ مگر ستارہ ضرور اپنے عاشق کو بتا دے گی کہ مجھے ان کا یہ راز معلوم ہو چکا ہے۔"

اس سے پہلے کے جواد اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کرتا۔ نعیم اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا لینا چاہتا تھا۔ وہ اسی روز ایک بہت بڑی فلاحی تنظیم کے سربراہ ایڈووکیٹ امجد غوری کے پاس پہنچ گیا۔ ایڈووکیٹ سے دیرینہ شناسائی تھی۔ اس نے کہا۔ "سینٹرل جیل میں ایک قیدی عورت سے ناانصافی ہو رہی ہے۔ میں اسے انصاف دلانا چاہتا ہوں۔"

امجد غوری نے کہا۔ "مجھے اس عورت کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ؟ تم یقیناً اس کا مقدمہ لڑنے کے بھاری اخراجات برداشت کر سکو گے۔"

"اخراجات کی پرواہ نہ کرو۔ مقدمہ ایک بہت بڑے سرکاری افسر کے خلاف لڑنا ہے۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''اچھا؟ کون ہے وہ سرکاری افسر؟''

''تم اسے جانتے ہو۔اس کا نام جواد اکبر ہے۔''

''اوہ۔وہ تو بہت بڑا مہرہ ہے۔یعنی شطرنج کی بساط پر ایک شاہ کو مات دینی ہوگی۔میں نے اور میری تنظیم کے کارکنوں نے سنا ہے' وہ کم بخت قیدی عورتوں سے منہ کالا کرتا رہتا ہے۔اسی لئے اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔''

''مگر ایک ناجائز بچہ پیدا کرنے کے لئے صبارانی نام کی ایک قیدی عورت سے نکاح پڑھوایا ہے۔''

''کیا واقعی؟ کیا وہ نکاح نامہ ہمیں مل سکے گا؟''

نعیم نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''وہ بہت چالاک ہے۔ہم نکاح نامہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔لیکن صبارانی کو اپنے اعتماد میں لے کر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش کر سکیں گے۔''

''اگر وہ ماں بننے والی ہے تو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کتنے عرصے سے جیل میں ہے؟ وہاں آنے سے پہلے حاملہ تھی یا بعد میں ہوئی ہے؟ اسے عدالت سے سزا مل چکی ہے یا ابھی مقدمہ چل رہا ہے؟ میں یہ سب کچھ سپرنٹنڈنٹ جیل سے مل کر رجسٹر دیکھ کر معلوم کر سکوں گا۔''

''جیل کا عملہ جواد کا فرمانبردار اور اطاعت گزار ہوگا۔تم سے اہم باتیں چھپائی جائیں گی۔ایسی کارروائی کرو کہ جواد اکبر کو بچ نکلنے کا موقع نہ ملے۔''

''ہوں...جیل کا ڈاکٹر لالچی ہے۔اگر ہم اسے قابو کریں گے تو بڑی رازداری سے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''وہ اپنی بولی لگائے گا۔جتنی بھی لگائے' اسے [illegible]ن کرو۔ میں نقد رقم ادا کروں گا۔اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔پلیز۔ابھی اس ڈاکٹر سے رابطہ کرو۔''

ایڈووکیٹ امجد غوری نے اپنے ایک ماتحت کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔یہ معلوم ہوا کہ وہ شام کو پانچ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جیل سے گھر آتا ہے۔آج کل کچھ پریشان رہتا ہے۔ملازمت چھوڑنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

نعیم ایک بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ کر امجد غوری کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔وہ حیرانی سے بولا۔ ''ایڈووکیٹ صاحب! آپ میرے غریب خانے میں تشریف لائے ہیں۔مجھے بلا لیا ہوتا۔''

امجد نے کہا۔ ''پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے۔اس لئے آیا ہوں۔شائد تم بھی پیاسے اور پریشان ہو۔معلوم ہوا ہے' جیل کی ملازمت چھوڑنے والے ہو؟ کیا کوئی خاص وجہ ہے؟''

وہ ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ڈاکٹر نے کہا۔ ''بس کیا بتاؤں؟ اس ملازمت میں پیسہ ہے۔مگر عزت نہیں ہے۔جبکہ زندگی کے ہر شعبے میں ڈاکٹر کی عزت کی جاتی ہے۔دراصل جیل ایسی جگہ ہے' جہاں بد دماغ مجرموں سے نمٹنے والے جیلر اور اعلیٰ عہدیدار بھی بد دماغ اور بد مزاج ہو جاتے ہیں۔ہم جیسے ماتحت ڈاکٹرز کے ساتھ بھی گالیوں سے بات کرنے لگتے ہیں۔''

''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔ہم یہاں ایک قیدی عورت کے متعلق معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔اگر تم صحیح انفارمیشن دو گے تو یہ نعیم صاحب ابھی تمہیں پچاس ہزار روپے پیش کریں گے۔''

ڈاکٹر کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا ہوئی۔نعیم نے بریف کیس کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''کیش موجود ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

نعیم نے پوچھا۔ ''کیا وہاں صبارانی نام کی کوئی عورت ہے؟''

''ہاں ہے...ماں بننے والی ہے۔آج رات یا کل کسی وقت ڈلیوری ہو سکتی ہے۔''

''وہ کتنے عرصے سے وہاں ہے؟''

''گیارہ ماہ پہلے آئی تھی۔اس وقت چودہ برس کی بہت ہی خوبصورت سی بچی تھی۔اس کتے جواد اکبر نے اسے پکی عورت بنا دیا ہے۔''

''تم ایک بڑے عہدیدار کو کتا کہہ رہے ہو۔''

''وہ بھی ہمیں کتا سمجھتا ہے۔اس کے دماغ میں ہمیشہ چولہا جلتا رہتا ہے۔کل اس

نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دی ہیں۔ اسی لئے ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

نعیم نے میز پر رکھے ہوئے بریف کیس کو اس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "تم ملازمت نہیں چھوڑو گے۔ اس میں ایک لاکھ روپے ہیں۔ میں پچاس ہزار دینے آیا تھا۔ لیکن اب یہ ساری رقم تمہاری ہے۔ تم جیل میں رہو گے۔ صبارانی کی زچگی خیر خیریت سے ہونی چاہیئے۔ میں اس بچے کو جواد کے خلاف جیتا جاگتا ثبوت بنانا چاہتا ہوں۔"

وہ بریف کیس کھول کر ایک ایک گڈی اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ خوش ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں ماں اور بچے کا پورا خیال رکھوں گا۔ مگر جواد سے آپ دونوں کو نمٹنا ہوگا۔"

امجد غوری نے کہا۔ "جواد نے رازداری سے نکاح پڑھایا ہے۔ وہ نکاح نامہ ہمارے ہاتھ نہیں لگے گا۔ تم صبارانی سے ہمدردی کرتے رہو۔ اسے سمجھاؤ کہ جواد کبھی اسے رہائی نہیں دلائے گا۔"

نعیم نے کہا۔ "اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ وہ بچے کو اس سے چھین کر لے جائے گا۔ اگر ایک ماں کو یہ یقین ہو جائے کہ تم اس کی گود اجڑنے نہیں دو گے۔ اس کا مقدمہ لڑو گے اور اسے بچے کے ساتھ رہائی دلاؤ گے تو وہ ہماری طرف سے جواد کے خلاف گواہ بن جائے گی۔"

وہ خوب سوچ سمجھ کر یہ طے کر رہے تھے کہ آئندہ انہیں جواد کی مخالفت میں کیسی کارروائی کرنی ہوگی؟ تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد نعیم اپنی کوٹھی میں آگیا۔ ستارہ نے فون پر اسے مخاطب کرتے ہوئے۔ "تم کہاں تھے؟ شام پانچ بجے سے کال کر رہی ہوں۔ یہی معلوم ہوتا رہا کہ ابھی رابطہ نہیں ہو سکے گا۔"

اس نے کہا۔ "میں بہت زیادہ مصروفیات کے دوران اپنا سیل آف رکھتا ہوں۔"

"ایسی بھی کیا مصروفیت تھی کہ رات کے دس بج گئے؟ کیا کسی سے فلرٹ کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ آفرین کے بعد اب کسی پر دل نہیں آتا۔ تم بتاؤ' کس لئے فون کر رہی تھیں؟"

"ممی تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ ماضی کی تمام رنجشوں کو بھلا کر پہلے کی طرح ایک ہی چھت کے نیچے تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں۔ آج وہ تمہیں ڈنر پر بلانے والی تھیں۔ کیا ابھی آسکو گے؟"

"میں نے تو پیٹ بھر کر کھا لیا ہے۔ صرف چائے پی سکوں گا۔"

"تو پھر ہم سی سائیڈ چلیں گے۔ ساحل پر صبح تک رونق رہتی ہے۔ آدھی رات کے بعد واپس آئیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آرہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ ستارہ نے فون کے ذریعے جواد سے کہا۔ "میں نعیم کے ساتھ سی سائیڈ جا رہی ہوں۔ گیارہ بجے کے بعد تمہیں اس کی کوٹھی خالی ملے گی۔ کوشش کرنا' دو گھنٹے کے اندر تمہارا کام ہو جائے۔"

دوستی کے بھیس میں دشمنی ہو رہی تھی۔ نعیم اور جواد اپنے اپنے طور پر چالیں چل رہے تھے اور ایک دوسرے کی چالوں سے بے خبر تھے۔ وہ ان ماں بیٹی کے ساتھ ساحل سمندر پر آیا تو ستارہ نے پہلے شاپنگ میں ایک گھنٹہ صرف کیا۔ پھر وہ تینوں ایک ریسٹورنٹ میں آکر آئسکریم کھاتے اور کولڈ ڈرنک پیتے رہے۔

ستارہ کی ماں نے نعیم سے وعدہ کیا کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے' اس کا الزام کوئی کسی کو نہیں دے گا۔ اب وہ پھر سے اس کی ساس بن کر رہے گی۔ وہ ماں بیٹی ہر معاملے میں اس پر اعتماد کرتی رہیں گی۔

ان کی باتیں' ان کی قسمیں سن کر نعیم کو یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ ماں بیٹی ابھی حج کر کے آئی ہیں یا اب سانپوں نے ڈسنا چھوڑ دیا ہے۔ جب وہ ان سے رخصت ہو کر رات دو بجے اپنی کوٹھی میں آیا تو باہر نائٹ چوکیدار نہیں تھا۔ اندر ایک ملازم رہتا تھا۔ وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ نعیم نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا اپنے بیڈروم میں آیا تو دروازہ کھولتے ہی ٹھٹھک گیا۔

الماری کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اندر کا تمام سامان باہر بکھرا پڑا تھا۔ الماری کا سیف ٹوٹا ہوا تھا۔ وہاں سے اہم کاغذات نکال کر ادھر ادھر پھینکے گئے تھے۔ اس نے انہیں سمیٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ ان میں جواد کا لکھا ہوا کاغذ نہیں تھا۔

بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ ملازم کو ہوش آرہا تھا۔ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اسے ٹھنڈا جوس پلایا' تب وہ بتانے لگا کہ دو گن

مین منہ پر ڈھاٹا باندھے آئے تھے۔انہوں نے اس کے چہرے کے پاس کوئی دوا اسپرے
کی تھی۔اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ گن مین وہاں سے کیا چرا کر لے
گئے ہیں؟

نعیم نے موبائل فون پر ستارہ کے نمبر پنچ کیے۔دوسری طرف فون بند پڑا تھا۔وہ
جواد کے ساتھ کامیابی کا جشن منا رہی ہوگی۔اس نے ماں کو فون کیا۔وہ نیند سے اٹھ کر
جھنجھلاتے ہوئے بولی۔"کیا بات ہے؟ کیوں ہماری نیند خراب کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔"جاگتے رہنے میں بہتری ہے۔میرے آدمی کسی بھی وقت ستارہ کو گولی
مارنے پہنچ جائیں گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ایسی کوئی واردات کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔محض
ان کی نیندیں اڑانے کی خاطر ایسا کہا گیا تھا۔وہ آرام سے سو گیا اور وہ ماں بیٹی خوف کے
مارے صبح تک جاگتی رہیں۔جواد ان کی سکیورٹی کے لئے آیا تھا۔پھر بھی وہ سو نہ سکیں۔

صبح سویرے جواد کو اطلاع ملی کہ سول کورٹ کا مجسٹریٹ ڈپٹی کمشنر اور فلاحی تنظیم کا
ایڈووکیٹ امجد غوری اپنی ٹیم کے ساتھ معائنے کے لئے جیل میں آرہا ہے۔

وہ فوراً ہی بھاگم بھاگ سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس آیا۔اچانک معائنے کے لئے
ٹیم آرہی تھی۔جیل میں سب ہی اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی کوششوں میں لگے
ہوئے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔"سر! آپ فکر نہ کریں۔صبا رانی کی جگہ دوسری عورت کو
پیش کیا جائے گا۔کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

دو ماہ پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔معائنے کے لئے جو ٹیم آئی تھی' اسے معلوم نہیں ہو سکا
تھا کہ وہاں ایک حاملہ قیدی عورت کو کہیں چھپایا گیا ہے۔انہوں نے رجسٹر میں قیدی عورتوں
کے نام پڑھے تھے۔چند عورتوں سے سوالات کیے تھے۔پھر مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

اس بار ایڈووکیٹ امجد نے رجسٹر میں نام پڑھتے ہوئے پوچھا۔"ان قیدیوں میں
صبا رانی کون ہے؟"

اسسٹنٹ جیلر نے ان عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"صبا رانی آگے آؤ۔"

ایک جوان عورت دو قدم آگے آگئی۔

امجد نے مجسٹریٹ سے کہا۔"یہاں اندراج کے مطابق چالیس قیدی عورتیں
ہیں۔آپ ان کی گنتی کرائیں۔"

مجسٹریٹ کے حکم کے مطابق ایک ایک عورت کے نام کے ساتھ گنتی ہونے
لگی۔آخر میں پتہ چلا کہ انتالیس عورتیں ہیں۔حمیدہ نام کی ایک عورت کم ہے۔

جواد اکبر اور سپرنٹنڈنٹ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ قیدی عورتوں کے نام کے
ساتھ گنتی ہوگی۔ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔"قیدی حمیدہ کہاں ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔"سر! وہ بیمار ہے۔"

امجد نے کہا۔"ہم اس بیمار کی عیادت کے لئے جائیں گے۔"

جواد نے پریشان ہو کر سپرنٹنڈنٹ کو دیکھا۔وہ بولا۔"یہ تو اچھی بات ہے
سر! آپ اس بیچاری کی مزاج پرسی کریں گے۔ہمارے ساتھ آئیں۔"

معائنہ کرنے والی ٹیم جواد اور سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ جیل کے دور افتادہ حصے میں
آگئی۔وہاں ایک کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا۔اندر صبا رانی لحاف اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی
تکلیف سے کراہ رہی تھی۔اس کے سرہانے ایک زنانہ کانسٹیبل اور ایک بوڑھی عورت کھڑی
ہوئی تھی۔

مجسٹریٹ نے پوچھا۔"تم بیمار ہو؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ لوگ بڑے برے وقت میں معائنے کے لئے آئے تھے۔پچھلی رات سے یہ
توقع کی جارہی تھی کہ اب تب میں زچگی ہونے والی ہے۔بار بار درد زہ اٹھ رہا تھا۔صبا رانی
برداشت کر رہی تھی۔جواب نہیں دے پا رہی تھی۔امجد نے کہا۔"چلو نام نہ بتاؤ۔یہ لحاف
اپنے اوپر سے ہٹاؤ۔"

سپرنٹنڈنٹ نے جلدی سے کہا۔"ڈاکٹر نے تاکید کی ہے' اسے لحاف میں ہی رکھا
جائے۔ٹھنڈ لگنے کا خدشہ ہے۔"

امجد غوری نے کہا۔"میں ڈاکٹروں کا ڈاکٹر ہوں۔ابھی اس کی ساری بیماری دور

کر دوں گا۔"

اس نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا۔"اس کا لحاف ہٹاؤ۔"

ماتحت نے آگے بڑھ کر حکم کی تعمیل کی۔لحاف کے ہٹتے ہی سب نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو حیرانی سے دیکھا۔مجسٹریٹ نے سپرنٹنڈنٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔"یہ تو حاملہ ہے؟"

وہاں کھڑی ہوئی بوڑھی عورت نے کہا۔"آپ لوگوں کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔باہر چلے جائیں۔اس کا ٹائم قریب ہے۔"

وہ سب باہر آگئے۔مجسٹریٹ نے کہا۔"اس کا ریکارڈ پیش کرو۔یہ جیل میں کب آئی؟ کیا آنے سے پہلے حاملہ تھی؟"

جواد اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتری کمرے میں پہنچنے تک حیلے بہانے کرتے رہے۔یہ بھی کہا کہ اس قیدی عورت کی زچگی ہونے کے بعد اس معاملے کی انکوائری کی جائے گی۔لیکن امجد نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔انہیں صبارانی کا ریکارڈ پیش کرنا پڑا۔یہ بھید کھلا کہ وہ گیارہ ماہ سے جیل میں ہے اور وہاں آنے کے بعد حاملہ ہوئی ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے پوچھا۔"اس کا ذمہ دار کون ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔"سر!اس عورت نے ایک قیدی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ہمیں چار ماہ بعد معلوم ہوا تو دیر ہو چکی تھی۔نہ ہم اسے سزا دے سکتے تھے، نہ اس کا حمل ضائع کر سکتے تھے۔"

امجد نے کہا۔"یعنی آج سے پانچ ماہ پہلے آپ کو معلوم ہوا۔کیا آپ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو تحریری اطلاع دی تھی؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔"نہیں۔اس معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔"

امجد غوری نے جواد اکبر کو دیکھتے ہوئے کہا۔"میں جانتا ہوں، اس عورت سے ہونے والے بچے کا باپ کون ہے؟ کیوں جواد صاحب! میں جانتا ہوں نا....؟"

وہ مٹھیاں بھینچ کر تلملاتے ہوئے بولا۔"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے کچھ کہنا نہیں پڑے گا۔ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد بھید کھل جائے گا۔اور

بھی کئی طرح سے انکوائری ہو گی۔میں مجسٹریٹ صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ انکوائری مکمل ہونے تک سپرنٹنڈنٹ کو معطل کیا جائے اور جواد اکبر صاحب تحریری بیان دیں کہ صبارانی کو یہاں کیوں چھپایا گیا تھا اور قیدی حمیدہ کو صبارانی کا نام دے کر ہمارے سامنے کیوں پیش کیا گیا تھا؟ میں یہ ثابت کر دوں گا کہ صبارانی سے ہونے والے بچے کے باپ یہ حضرت جواد اکبر صاحب ہی ہیں۔"

جواد نے گرج کر کہا۔"آپ بکواس کر رہے ہیں۔"

"آپ یہ لکھ دیں کہ میں بکواس کر رہا ہوں اور آپ اس ہونے والے بچے کے باپ نہیں ہیں۔"

وہ اچانک ہی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔بچاؤ کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔اس نے کہہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں تحریری بیان ضرور دے گا۔مجسٹریٹ نے کہا۔"جواد اکبر صاحب کو صبارانی کے معاملے میں ملزم ٹھہرایا گیا ہے۔لہٰذا انکوائری اور قانونی کارروائی جاری رہنے تک جواد اکبر اس جیل کے احاطے میں قدم نہیں رکھیں گے اور نہ ہی صبارانی سے کوئی رابطہ کریں گے۔"

یہ ایسا حکم تھا کہ جواد بالکل ہی بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔اسسٹنٹ جیلر کو وہاں کا قائم مقام سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا۔جیل کے اندر ایسے پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو تعینات کیا گیا جو جواد اکبر کے زیر اثر نہیں تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے اس کی حکمرانی ختم ہو گئی تھی۔

☆☆☆

انسان کو انسان مارتا ہے۔بدنصیبی کبھی نہیں مارتی....

صبارانی کو انسان مار رہے تھے۔جب وہ مر جائے گی تو الزام مقدر کو دیا جائے گا۔ہائے! بیچاری کو بدنصیبی نے ضائع کر دیا۔

نصیب کیا ہوتا ہے؟ بڑے لوگوں کے اچھے یا برے عمل اور ردعمل سے چھوٹے لوگوں پر جو اثرات پڑتے ہیں، اسے نصیب کا لکھا کہا جاتا ہے۔

بہزاد درانی بڑے باپ کا بیٹا تھا۔صبارانی چھوٹے باپ کی بیٹی تھی۔وہ چودہ برس کی لڑکی کسی کے لینے دینے میں نہیں تھی۔عزت آبرو سے تین وقت کی روٹی کمانے کوٹھی میں

گئی تھی۔ رئیس زادے نے اس کی کچی جوانی کو لہولہو کر دیا تھا۔

کاتب تقدیر کو یہ الزام کیوں دیا جائے کہ اس نے ایک رئیس زادے کو غریب لڑکی کی جوانی لوٹنے کا موقع فراہم کیا؟

کیوں الزام دیا جائے کہ ایک بیمار باپ کو حوالات میں مار مار کر موت کی نیند سلا دیا گیا اور بیٹی کو کسی جرم کے بغیر جیل کی چار دیواری میں پہنچا کر جواد اکبر کی رکھیل بنا دیا گیا....؟

کیا ایک مجبور کی جوانی کا لائسنس کاتب تقدیر دیتا ہے؟

سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے' گناہ ہم کرتے ہیں اور بڑی ہنرمندی سے الزام کاتب تقدیر کو دیتے ہیں کہ اس نے ایسی ہی تقدیر لکھی ہے۔ ازل سے انسانی کمینگی کا یہ کھیل جاری ہے۔ ازل سے بدترین اعمال کا الزام اپنے رب کو دیا جا رہا ہے۔

صبا رانی کو بدنصیب بنائے رکھنے والا عمل رکنے والا نہیں تھا۔ ابھی جواد کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی اس سے ایک بچہ حاصل کرنا تھا۔ ایسے وقت وہ قانون کے شکنجے میں آ رہا تھا۔ اگر صبارانی اس کی حمایتی بن کر یہ بیان دیتی کہ جواد نے اس کے ساتھ منہ کالا نہیں کیا ہے' اس سے ہونے والا بچہ کسی دوسرے قیدی بدمعاش کا ہے تو وہ با آسانی قانونی شکنجے سے نکل سکتا تھا۔

اس نے جسے داشتہ بنا کر رکھا تھا' جسے ایک بچہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ وہ صبارانی اچانک ہی بہت اہم ہو گئی تھی۔ وہی اس اعلیٰ عہدیدار کو معزز اور شریف انسان ثابت کر سکتی تھی۔ مگر جیل کے احاطے میں اس کا داخلہ بند ہو گیا تھا۔ صبارانی سے بات کرنا تو دور کی بات ہے۔ وہ اسے دور سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

ان حالات میں صبارانی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس بچے کا نصیب بھی اس کے عیاش باپ نے لکھا تھا۔ اس نومولود نے پیدائش سے پہلے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پیدائش کے بعد بھی نہیں جانتا تھا کہ گناہ اور جرائم کیا ہوتے ہیں؟ وہ زندگی کی پہلی سانس لینے کے لئے جیل کی کوٹھری میں پہنچ گیا تھا۔ اس بیچارے کا انجام کیا ہو گا؟ یہ تو اسے وہاں پہنچانے والے ہی جانتے تھے۔

سپرنٹنڈنٹ کو معطل کیا گیا تھا۔ اس کی جگہ اسسٹنٹ جیلر کو عارضی طور پر

سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا تھا۔ جواد نے فون پر اس سے کہا۔ ''تم ہمیشہ میرے وفادار رہے ہو۔ آج بھی میرے کام آؤ۔''

اس نے جواب دیا۔ ''سوری جواد صاحب! صبارانی کو بڑی سخت نگرانی میں رکھا گیا ہے۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آسکوں گا۔''

''تم موجودہ سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے جب چاہو' اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔ اسے میرے خلاف بیان دینے سے روک سکتے ہو۔''

''میں جب بھی اس کے پاس جاتا ہوں۔ انٹیلی جنس کا کوئی نہ کوئی بندہ وہاں موجود رہتا ہے۔ میں آپ کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کر سکوں گا۔''

''وہ کبھی تو تنہا رہتی ہو گی؟''

''ہاں۔ جب ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتے آتا ہے تو کمرے میں اور کوئی نہیں جاتا۔ آپ ڈاکٹر سے معاملات طے کر لیں۔''

جواد نے ڈاکٹر کو فون پر مخاطب کیا۔ بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''ہیلو ڈاکٹر فاروق! میں جواد اکبر بول رہا ہوں۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''ہاں۔ میں سن رہا ہوں۔''

''تمہیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ میں نے تمہاری تنخواہ بڑھانے کی منظوری حاصل کر لی ہے۔''

''اچھا۔ میں بہت خوش ہو رہا ہوں پھر...؟''

''تم ابھی میری کوٹھی میں آؤ۔ تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''وہ ضروری باتیں فون پر کہہ دیں۔ میں نہیں آسکوں گا۔''

''تم میرا حکم سنتے ہی دوڑے چلے آتے ہو۔ آج کیوں نہیں آؤ گے؟''

''اس لئے کہ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ سالے! دو کوڑی کے لاٹ صاحب! تو نے مجھے ماں بہن کی گالیاں دی تھیں۔ کیا سمجھتا ہے' میں تیرے آگے دم ہلاؤں گا؟ ارے کتے! میں تو تجھے اور تیرے حامیوں کو صبارانی کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دوں گا۔ تجھے تو تیرا باپ بھی نہیں بچا سکے گا۔ کیونکہ نعیم صدیقی صاحب تیرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ جواد نے چونک کر زیرلب کہا۔ ''اوہ گاڈ! مجھ پر یہ حملہ نعیم نے کیا ہے؟''

وہ فوراً ہی ستارہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''بہت پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟''

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''نعیم کو صبارانی کے متعلق کیسے معلوم ہو گیا؟ یہ جو مصیبتیں مجھ پر آ رہی ہیں' ان کے پیچھے اسی دشمن کا ہاتھ ہے۔''

ستارہ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ اس نے رہائی پانے کے لئے نعیم کو گھر کا بھیدی بنایا تھا اور یہ بات اب تک اپنے یار سے چھپاتی آئی تھی۔ اب بھی اس سلسلے میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ بہت پریشان اور جھنجھلایا ہوا تھا۔ حقیقت معلوم ہوتی تو یقیناً اس سے ناراض ہو جاتا۔ قطع تعلق کر لیتا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولی۔ ''ذرا ایزی ہو جاؤ۔ پریشانیوں کو اندر سے نکالو۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ تم نے کبھی کسی سے مات نہیں کھائی ہے۔ نعیم کو بھی مات دے سکو گے۔ آرام سے بیٹھو۔ میں بوتل اور گلاس لاتی ہوں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر پینے کا سامان لے آئی۔ ایک پیگ بنا کر اسے پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''لو پیو۔ میں ممی کے پاس جا کر کہتی ہوں۔ وہ یہاں نہیں آئیں گی۔''

وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آئی۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے موبائل فون کے ذریعے نعیم سے رابطہ کرنے لگی۔ دوسری طرف سے اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے ستارہ! معلوم ہوتا ہے' عاشق کو تیر لگا ہے اور تم گھائل ہو کر مجھے مسیحا سمجھ رہی ہو۔''

''بیشک۔ تم مسیحا ہی ہو۔ دیکھو! میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق جواد کو یہ نہیں بتایا کہ تمہیں صبارانی کے بارے میں مجھ سے بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ پلیز۔ تم بھی اسے یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں تمہاری معلومات کا ذریعہ ہوں۔''

''بتانا ہوتا تو بہت پہلے تمہارے خلاف بہت کچھ کہہ دیتا۔ میں تمہیں کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ کیا اس احسان کے بدلے یہ بتاؤ گی کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کیا کر رہا ہے؟''

''وہ بہت پریشان ہے۔ اسے بچاؤ کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔''

''ابھی کہاں ہے؟''

''میرے بیڈروم میں پی رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں' وہ غم غلط کرے۔ اس کی پریشانی کچھ کم ہو جائے۔''

نعیم نے فون بند کر دیا۔ اس نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ پھر دروازہ کھول کر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگی۔ یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ زبان کا دھنی ہے۔ اسکے خلاف جواد سے کچھ نہیں بولے گا۔

وہ بیڈروم میں آئی تو جواد فون کو کان سے لگائے دھاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ ایک بار مجھے اس پھندے سے نکلنے دو۔ پھر میں تمہیں ایک کے بعد دوسری سانس نہیں لینے دوں گا۔''

''کتے کی طرح بھونکتے رہو گے تو پیتے وقت ٹھسکا لگے گا۔''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو' میں شراب پی رہا ہوں؟''

''اپنی داشتہ کے کمرے میں کوئی آب زم زم نہیں پیتا۔''

وہ خالی گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے بولا۔ ''یعنی تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس وقت ستارہ کے پاس ہوں؟ یقیناً تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہو۔''

''اور تمہارا پیچھا کرتے ہوئے تمہیں جہنم کے دروازے تک پہنچاؤں گا۔''

ستارہ کمرے میں آ کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ فون چھین کر اسے بند کرتے ہوئے بولی۔ ''اس سے جتنا بولو گے' اُتنا ہی تمہارا دماغ گرم ہو گا۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے بھول جاؤ۔ ساری دنیا کو بھول جاؤ۔ میں تمہاری مشکل کو آسان کروں گی۔ اب اسے پیتے رہو۔''

وہ دوسرا گلاس بھرنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ ''یہ آسان ہونے والی مشکل نہیں ہے۔ میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں۔ ایڈوکیٹ امجد غوری بہت ہی تیز طرار ہے۔ وہ صبارانی سے میرے خلاف تحریری بیان لے چکا ہو گا۔ عدالت میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ میں ایک قیدی عورت کی عزت سے کھیلتا رہا ہوں۔ جیل کا ڈاکٹر اور وہاں کا عملہ بھی میرے خلاف بیان دے گا۔''

"کسی چالاک اور تجربہ کار وکیل سے مشورہ کرو۔ وہ ہمیں بچاؤ کے قانونی ہتھکنڈے بتائے گا۔"

وہ ایک گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ "ایڈووکیٹ حمزہ گیلانی بہت چالباز ہے۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سیاہ کو سفید بنا دیتا ہے۔ میں کل ہی اس کی خدمات حاصل کروں گا۔"

"بس تو پھر آرام سے پیئو اور یہیں میری بانہوں میں سو جاؤ۔ پریشان ہونے کی کوئی بات مت سوچو۔"

"صبارانی میری گرفت سے نکل چکی ہے۔ میں تمہارے لئے اس سے بچہ نہیں لے سکوں گا۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "بچہ جائے جہنم میں۔ تم سلامت رہو گے تو بچے کہیں سے بھی جائیں گے۔"

اس رات اس نے خوب پی۔ بیڈ پر آ کر ستارہ کی آغوش میں سو گیا۔ دوسرے روز حمزہ گیلانی سے ملاقات کی۔ اسے اپنی روداد سنائی۔ اس نے توجہ سے سننے کے بعد کہا۔ "آپ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے باعث گرفت میں آ رہے ہیں۔ ایک قیدی عورت کے ساتھ گناہ ثابت ہوگا تو کوڑے کھانے پڑیں گے۔ نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔ سرکاری ملازمت بھی جائے گی۔ ان سب سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔"

جواد نے اسے پرامید نظروں سے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا آپ کے پاس صبارانی سے پڑھایا ہوا نکاح نامہ ہے؟"

"ہاں۔ میرے پاس ہے۔"

"تو اپنے خلاف ہونے والی قانونی کارروائی سے پہلے ہی نکاح نامہ عدالت میں پیش کر دیں۔ یہ بیان دیں کہ صبارانی ایک مظلوم قیدی ہے۔ اس کے خلاف چوری کا جھوٹا الزام ہے۔ آپ نے اس شریف لڑکی پر ترس کھا کر اسے اپنی شریک حیات بنایا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کرتے، نعیم صدیقی کی سازش کے تحت زوجہ صبارانی سے آپ کو دور کر دیا گیا۔"

"یہ تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہے۔ بیشک۔ مجھ پر سے سارا الزام ڈھل جائے گا۔ مگر دو کوری کی لڑکی میری گردن سے ڈھول کی طرح لٹک جائے گی۔ ہمارا ایک اعلیٰ خاندان ہے۔ ہم لوگ....."

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ اپنے خاندان کا قصیدہ نہ پڑھیں۔ پہلے سزا سے بچیں۔ اپنی ملازمت کو بچائیں۔ جب کیس ختم ہو جائے، آپ کے دامن سے گناہ کا دھبہ ڈھل جائے تو صبارانی کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیں۔"

جواد اپنا سر سہلاتے ہوئے قائل ہو کر بولا۔ "زبردست آئیڈیا ہے۔ میں اس داشتہ کو شریک حیات تسلیم کر کے سارے الزامات سے بری ہو سکتا ہوں۔ بعد میں اس کا بچہ لے کر اسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ نعیم صدیقی ناکام ہو کر سوچتا اور دیکھتا ہی رہ جائے گا کہ سوچا کیا تھا اور کیا ہو گیا؟"

جواد نے دیر نہیں کی۔ اس نے اسی روز اپنے اوپر والوں کو ایک تحریری بیان دیا۔ ان کے سامنے اپنا اور صبارانی کا نکاح نامہ پیش کیا۔ اس سے پوچھا گیا۔ "تم نے اب تک اس نکاح کو راز میں کیوں رکھا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میری شریک حیات پر چوری کا جھوٹا الزام تھا۔ میں اسے جھوٹ ثابت کرنے کے لئے ثبوت اور گواہوں کی تلاش میں تھا۔ جب اسے باعزت طور پر بری کیا جاتا، تب اعلان کرتا کہ صبارانی میری شریک حیات ہے اور وہ چور نہیں، ایک معزز خاتون ہے۔"

اس سے طرح طرح کے سوالات کئے گئے۔ وہ ہر سوال کا سوچا سمجھا، نپا تلا جواب دیتا رہا۔ اس ضمن میں بنیادی بات یہ تھی کہ وہ ایک ایسی بے یار و مددگار قیدی عورت کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔ جس کا مقدمہ اب تک عدالت میں پہنچایا نہیں گیا تھا اور نہ ہی قانوناً سزا سنائی گئی تھی۔

ایک اور بات جواد کے حق میں تھی کہ اس نے اپنی نیک نیتی اور دیانتداری ثابت کرنے کے لئے اس بے سہارا عورت کو اپنی منکوحہ بنایا تھا۔ دینی اور دنیاوی قانون کے مطابق نہ اسے گرفتار کیا جا سکتا تھا، نہ سرکاری ملازمت سے معطل کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کے

خلاف عدالتی کارروائی کی جاسکتی تھی۔

یوں دیکھا جائے تو اس نے خود کو محاسبے سے اور مطعون ہونے سے بچالیا تھا۔ مگر نعیم صدیقی پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کی طرف سے ایڈووکیٹ امجد غوری ہر دوسرے تیسرے دن جیل میں جا کر صبارانی سے ملتا تھا۔ اسے سمجھاتا تھا کہ جواد اکبر شاطر ہے۔ وہ قانونی گرفت سے بچنے کے لئے اسے اپنی شریک حیات تسلیم کر رہا ہے۔

صبارانی نے کہا۔ ''دیر سے سہی' تسلیم تو کر رہا ہے۔ میرے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ وہ مجھے عزت آبرو سے اپنے گھر میں رکھے گا۔ میرے بچے کو باپ کا نام دے گا۔''

''تم اس کی چالبازیوں کو نہیں سمجھ رہی ہو۔ وہ کبھی یہ ثابت نہیں ہونے دے گا کہ تم بے گناہ ہو۔ تم پر چالیس ہزار روپے کے زیوارات کی چوری کا الزام رہے گا۔ تمہیں دو چار برس قید بامشقت کی سزا سنائی جائے گی۔ تب وہ تمہارے خلاف بیان دینے پر حق بجانب ہوگا کہ وہ مجرمانہ واردات کرنے والی عورت کو طلاق دے رہا ہے۔ یوں وہ مکار تم سے پیچھا چھڑالے گا۔ عدالت بچے کو ایک مجرم ماں کے پاس رہنے نہیں دے گی۔ جواد اس بچے کو لے جائے گا۔ اس کی ایک جھلک بھی تم دیکھ نہیں پاؤ گی۔''

''آپ نعیم صدیقی کی طرف سے میرا کیس لڑنا چاہتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ صاحب کون ہیں؟ میں کسی کو نہیں جانتی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک ماں تھی۔ وہ بھی نہ جانے کہاں ہوگی؟ پچھلے سات ماہ سے کبھی ملنے نہیں آئی۔ اس جیل کے اندر اور باہر صرف جواد صاحب کو جانتی ہوں۔ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر چکی ہوں۔ ان کے بچے کی ماں بھی بن چکی ہوں۔ اپنے بچے کے باپ کے خلاف کبھی کوئی بیان نہیں دوں گی۔''

''تم بہت بھولی ہو۔ جس نے نکاح پڑھانے کے بعد بھی تمہیں داشتہ بنا کر رکھا۔ کبھی تمہارے کیس کو عدالت میں جانے نہیں دیا۔ اس پر بھروسہ کر رہی ہو کہ وہ آئندہ تمہیں عزت آبرو سے اپنے گھر میں رکھے گا؟''

''نہیں رکھے گا تو لات مار کر گھر سے نکال دے گا۔ پھر کبھی بلائے گا تو اس کی چھاؤں میں چلی جاؤں گی۔ میرے جیسی کتنی ہی عورتیں اپنے مردوں کے لات جوتے کھاتی

ہیں۔ میں بھی کھاتی رہوں گی۔ اسے چھوڑ کر کبھی کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی۔''

امجد غوری نے نعیم کے پاس آ کر کہا۔ ''میں اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ وہ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں ہے کہ جواد اسے ٹھکرا کر بچے کو چھین کر لے جائے گا۔ جو عورت ایک ظلم کرنے والے کو اپنی اچھی بری تقدیر کا مالک سمجھ لے اور اس کے آگے دنیا کے کسی دوسرے مرد کو ترجیح نہ دے۔ اس کے ارادوں کو بدلا نہیں جاسکتا۔ وہ کبھی جواد اکبر کے خلاف کوئی بیان نہیں دے گی۔''

نعیم نے کہا۔ ''نچلے طبقے کی جاہل عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک ہی مرد کے قدموں سے لپٹی رہ جاتی ہیں۔ جواد کے نصیب اچھے ہیں۔ صبارانی کی عاقبت نا اندیشی اسے بچالے گی۔''

امجد نے کہا۔ ''ہم نے اتنی بھاگ دوڑ کی۔ یہ ساری محنت رائیگاں جائے گی۔''

''رائیگاں تو نہیں جائے گی۔ میں جواد کی تاک میں رہوں گا۔ صبارانی کے بچے کو ستارہ کی گود میں جانے نہیں دوں گا۔ جب اس پر چوری کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ اسے سزا ہوگی تو جواد طلاق دینے میں حق بجانب ہوگا۔ لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اسے سارے الزامات سے باعزت طور پر بری کرائیں گے۔''

انتقام لینے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ جواد نہ اسے چور ثابت کرے اور نہ طلاق دے سکے۔ اسے شریک حیات بنا کر ساتھ رکھنے پر مجبور ہو جائے۔ پھر وہ بچے کو بھی ماں سے چھڑا کر ستارہ کے پاس نہیں پہنچا سکے گا۔

اس سلسلے میں پہلے یہ معلوم کیا گیا کہ صبارانی کو چوری کے الزام میں گرفتار کر کے کس تھانے میں لایا گیا تھا؟ نعیم نے اس تھانیدار کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیا۔

اس نے شہباز درانی کو سمجھایا۔ ''آپ نے بیٹے کو بدنامی سے بچانے کے لئے صبارانی پر چوری کا الزام لگایا۔ میں نے آپ کی خدمت کی۔ اسے حوالات میں پہنچایا۔ پھر جیل میں پہنچادیا۔ اب ایک برس گزر چکا ہے۔ بیچاری نے بدترین مجرم سے بھی زیادہ سزا پالی ہے۔ اس کی عزت کی دھجیاں ایسے اڑائی گئی ہیں کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بن گئی ہے۔ اب آپ اس پر رحم کریں۔''

شہباز درانی نے کہا۔"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ چوری کا الزام واپس لیں۔ یہ بیان دیں کہ چرایا ہوا مال کسی دوسری جگہ سے برآمد ہو چکا ہے۔"

"مگر مال کہاں سے برآمد ہوگا؟"

"جب آپ کے گھر میں چوری ہوئی ہی نہیں تھی تو کہاں سے برآمد ہوگا؟ آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ بس یہ بیان لکھ دیں کہ چرایا ہوا مال واپس مل گیا ہے۔ صبارانی پر غلط شبہ کیا گیا تھا۔"

شہباز درانی نے اس کی مرضی کے مطابق بیان لکھ کر دستخط کر دیئے۔ ان دنوں ایک ڈاکو گرفت میں آیا تھا۔ اس کے خفیہ اڈے سے لاکھوں روپے نقد اور زیورات برآمد ہوئے تھے۔ شہباز درانی کے تعاون سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ صبارانی نے نہیں اس ڈاکو نے زیورات چرائے تھے۔

قانون سے کھیلنے والوں نے خوب کھیل دکھایا تھا۔ پہلے سفید کو سیاہ بنایا' پھر سیاہ کو سفید بنا دیا۔ صبارانی کے ساتھ خوب زیادتی کی گئی تھی۔ پھر مہربانی بھی کی گئی۔ ایک برس دو ماہ بعد اسے عدالت میں پہنچا کر تمام الزامات سے بری کرا لیا گیا۔

جواد اکبر نے اپنے طور پر بہت کوششیں کی تھیں کہ اس پر سے چوری کا الزام ختم نہ ہونے پائے۔ مگر اس معاملے میں وہ ناکام رہا۔ جب وہ باعزت طور پر بری ہو کر عدالت سے باہر آئی تو جواد کو ایک شوہر کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہنا پڑا۔ وہاں پریس اور ٹی وی کے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کا ہجوم تھا۔ مختلف چینلز کے لئے نیوز تیار کی جا رہی تھیں۔ ان دونوں سے طرح طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ صبارانی خوش تھی۔ چہک چہک کر جواب دے رہی تھی۔ جواد کیمروں کے سامنے جبراً مسکرا رہا تھا۔ بہت مجبور ہو کر یہ بیان دے رہا تھا کہ صبارانی ایک اچھی اور خدمت گزار بیوی ہے۔ وہ اسے جیل سے اپنے گھر لے جانے پر فخر کر رہا ہے۔

تمام میڈیاز کے ذریعے دنیا والوں کے سامنے اتنا کچھ کہنے کے بعد وہ آئندہ کبھی طلاق دینے کے لئے اپنی شریک حیات کی کوئی کمزوری اور خامی نہیں نکال سکتا تھا۔ ستارہ بھی

نیوز چینلز پر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ صبارانی ایسی سوکن بن گئی تھی' جسے وہ جواد کی زندگی سے کبھی نکال نہیں سکتی تھی۔

اس نے فون پر جواد سے کہا۔"اس میں شبہ نہیں ہے کہ تم نے اپنی ملازمت بھی بچائی ہے اور ایک قیدی عورت کے ساتھ گناہ گار بھی نہیں کہلائے۔ تمہیں نیک نامی مل رہی ہے۔ مگر یہ صبارانی زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارے ساتھ کینسر کی طرح لگی رہے گی۔"

"ہاں۔ یہ ایسی مصیبت بن گئی ہے' جس سے پیچھا چھڑانے میں ایک عرصہ لگے گا۔ میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرتا۔ کسی دوست یا دشمن کو اپنے مزاج کے خلاف برداشت نہیں کرتا۔ یہ بیوی بن کر نہیں' چیلنج کر میری کوٹھی میں آئی ہے۔ مجھے سوچنے دو کہ میں کس طرح اسے ٹھکانے لگا سکتا ہوں؟"

وہ ذرا توقف سے بولا۔"تم میرا یہ بچہ گود نہیں لے سکو گی۔ میں اسے اغوا کراؤں گا۔ اس کی ماں سے چھپا کر لاؤں گا تو نعیم بھید کھول دے گا۔"

"بچے کو رہنے دو۔ پہلے اس بلا کو اپنی زندگی سے نکالو۔ وہ کم بخت مرے گی تو وہ بچہ ہمارا ہی ہوگا۔"

وہ صبارانی کی ہلاکت کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا۔ دشمن نعیم اس کی غیر طبعی موت کو جواد کے گلے کا پھندہ بنا سکتا تھا۔ ستارہ نے کہا۔"وہ کم بخت گلے میں ہڈی بن گئی ہے۔ نہ نگل سکو گے' نہ اگل سکو گے۔ اسے آفرین کی طرح ختم کرنے کی غلطی نہ کرنا۔"

"ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ مگر کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ نعیم نے پھانسی کا پھندہ نہ سہی' لیکن مجھے پھولوں کے پھندے میں کس دیا ہے۔ اس دو ٹکے کی قیدی عورت کو دیکھ کر میرا دم الجھتا رہے گا۔"

وہ غم غلط کرنے کے لئے پی رہا تھا اور فون پر بول رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر تھا کہ صبارانی بڑے پیار سے آئی تھی اور اس کی باتیں سن کر ٹھٹک گئی تھی۔ ستارہ کہہ رہی تھی۔

"ادھر تمہارا دم الجھ رہا ہے۔ ادھر میرا سکون غارت ہو رہا ہے۔ اللہ کرے نعیم مر جائے۔ پھر ساری رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی۔"

وہ چونک کر بولا۔"واہ میری جان! کیا آئیڈیا دیا ہے؟ واقعی نعیم کو ٹھکانے لگانے

کے بعد تمہاری اس سوکن کو بھی ٹھکانے لگا سکوں گا۔"

"پلیز جواد! اس معاملے میں جلد بازی نہ کرنا۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ نعیم بہت چالاک ہے۔ تمہارا وار خالی جائے گا تو اس کے جوابی وار سے بچ نہیں پاؤ گے۔"

"تم اطمینان رکھو۔ میں اس سلسلے میں جلد بازی نہیں کروں گا۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہوشیار رہنے والوں پر کب اور کس طرح جھپٹنا چاہئے؟"

اس نے فون بند کر دیا۔ صبا رانی وہاں سے دبے قدموں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یہ تو جانتی تھی کہ جواد اسے دل سے نہیں چاہتا ہے۔ پہلے کی طرح داشتہ سمجھ کر اپنی ٹھوکروں میں رکھتا ہے۔ مگر یہ حقیقت اب معلوم ہوئی تھی کہ وہ اسے گلے کا پھندہ سمجھتا ہے' اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ صرف یہی نہیں' اس کے بچے کو بھی کسی سوکن کی گود میں پہنچانا چاہتا ہے۔

ایک ماں کو اپنی جان سے زیادہ اپنے بچے کی سلامتی کی فکر رہتی ہے۔ عقل نے سمجھا دیا کہ بچہ اس کوٹھی میں محفوظ نہیں رہے گا۔ ایسے وقت امجد غوری یاد آیا۔ اس نے کہا تھا' نعیم نے اس کا کیس لڑ کر اسے رہائی دلائی ہے۔ ورنہ جواد کبھی اسے جیل سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ وہ جواد پر بھروسہ کرتی تھی۔ اس وقت اس سچائی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اب سوچ رہی تھی۔ امجد غوری اور نعیم صدیقی سے کس طرح رابطہ کرے؟ کس طرح اپنے بچے کے لئے حفاظتی انتظامات کرے؟

جواد اسے کوٹھی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ کسی کا فون نمبر بھی نہیں جانتی تھی۔ بڑی رازداری سے کوٹھی کے باہر جا کر اپنے مددگاروں کا پتہ ٹھکانہ اور فون نمبرز معلوم کرنا چاہتی تو بھٹکتی رہ جاتی۔ پھر جواد اکبر کے ہتھے چڑھ جاتی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رونے لگی۔ اس پر جب بھی کوئی مصیبت آتی تو وہ رو دھو کر صبر کر لیا کرتی تھی۔ مصائب سے لڑنے کے لئے نہ اس کے پاس کبھی عقل رہی نہ کہیں سے سہارا ملا۔ لیکن اس بار وہ صبر نہیں کر رہی تھی۔ بچے کو دودھ پلاتی تھی۔ اسے چومتی تھی اور سوچتی تھی' جگر کے ٹکڑے کو کہاں لے جا کر چھپائے؟ اتنی بڑی دنیا میں ایک ننھے سے بچے کو سوکن سے دور زندہ سلامت رکھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ جواد اس سے جانوروں کی طرح سلوک کرنے لگا تھا۔ اسے صوفوں پر بیٹھنے اور بیڈ پر لیٹنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ ننگے فرش پر سوتی اور بیٹھتی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ وہ دو پیروں سے نہ چلے۔ اس کے سامنے چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک کر جانوروں کی طرح چلتی پھرتی اور گھر کا تمام کام کرتی رہے۔

اور بھی کچھ ایسی شرمناک حرکتیں کرتا تھا کہ اسے گھن آتی تھی۔ وہ جان چھڑا کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر بچہ وہاں آرام سے تھا۔ چونکہ جواد کا بیٹا تھا۔ اس لئے رئیس زادوں کی طرح پرورش پا رہا تھا۔ وہ اسے لے کر فرار ہونا چاہتی تو اپنے ساتھ اس ننھے کو بھی فاقوں سے مارتی۔ جہاں بھی اسے لوٹنے والے ملتے' وہاں اس بچے کی بھی شامت آ جاتی۔

وہ بار بار کہتا۔ "اگر آرام اور سکون سے انسانوں جیسی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو بچے کو میرے حوالے کر کے طلاق لے۔ یہ بیان لکھ دے کہ تو بچے کو بوجھ سمجھتی ہے اور میرے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔ راضی خوشی طلاق لے کر جا رہی ہے۔ میری بات مانے گی تو پچاس ہزار دے کر یہاں سے رخصت کروں گا۔"

وہ کہتی تھی۔ "میں تمہاری تمام باتیں مان لوں گی۔ پچاس ہزار بھی نہیں لوں گی۔ مگر اپنے بچے کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ جیوں گی تو اس کے ساتھ ورنہ..... یہیں اس کے ساتھ رہ کر مر جاؤں گی۔"

وہ ضدی تھی۔ بری طرح مار کھاتی تھی۔ لہولہان ہو جاتی تھی مگر بچے کو چھوڑنے کے لئے راضی نہیں ہوتی تھی۔ جواد نے ستارہ کے پاس آ کر کہا۔ "وہ سور کی بچی بہت ڈھیٹ ہے۔ میں مارتے مارتے تھک گیا ہوں۔ مگر وہ مار کھاتے نہیں تھکتی۔ جیل کی چار دیواریوں میں رہ کر سخت جان ہو گئی ہے۔"

ستارہ نے کہا۔ "کیوں اس کے پیچھے ہلکان ہو رہے ہو؟ اس کم بخت کی وجہ سے گنہگار کہلانے والے تھے۔ کوڑوں کی سزا مل سکتی تھی۔ تمہاری برسوں کی ملازمت جانے والی تھی۔ اگر نکاح نامہ پیش نہ کرتے تو ذلت کی پستی میں گر جاتے۔ وہ عورت تمہارے لئے منحوس ہے۔ اس سے پیچھا چھڑا لو۔ بچہ دے کر نجات حاصل کر لو۔ تم آج بھی تگڑے جوانوں جیسے ہو۔ تم سے ایک نہیں دس بچے حاصل ہو جائیں گے۔"

وہ اس رات ستارہ کے پاس رہ کر پیتا رہا اور صبارانی کو گالیاں دیتا رہا۔ ادھر وہ کوٹھی میں تھی۔ یہ بات عقل میں آئی کہ جواد کی ٹیلی فون ڈائری پڑھے۔ اس میں دوستوں کے ہی نہیں نعیم جیسے دشمنوں کے نمبر بھی درج ہوں گے۔

اس نے کوٹھی کے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ تا کہ جواد اچانک نہ چلا آئے۔ پھر ڈائری کھول کر نام اور نمبر پڑھنے لگی۔ این کے خانے میں پہلے ہی صفحے پر نعیم صدیقی کا نمبر مل گیا۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر وہ نمبر پنچ کئے۔

دوسری بیل جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی نعیم صدیقی کی طنزیہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو جواد! یہ دشمن کیسے یاد آگیا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''میں۔ میں صبارانی بول رہی ہوں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''صبارانی؟''

''ہاں۔ وہ گھر میں نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے آپ کا نمبر ملا ہے۔ میں اس سے چھپ کر فون کر رہی ہوں۔''

''تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ بات کیا ہے؟''

''میرے بچے پر مصیبتیں آنے والی ہیں۔ ایک وکیل صاحب نے کہا تھا' آپ میرا کیس لڑ رہے ہیں۔ مجھے چوری کے الزام سے بری کرا رہے ہیں۔''

''ہاں۔ میں نے ہی تمہیں جیل سے رہائی دلائی ہے۔''

''کیا آپ میرے جگر کے ٹکڑے کو کہیں چھپا کر رکھ سکتے ہیں؟ میں یہاں اپنی جان دے سکتی ہوں۔ مگر اس کی سلامتی اور بہتری کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے میری مدد کریں۔''

''میں تمہاری پریشانیوں کو سمجھ گیا ہوں۔ ابھی تم نے بتایا' جواد گھر میں نہیں ہے۔ کیا آدھے گھنٹے بعد بچے کے ساتھ کوٹھی سے باہر آسکتی ہو؟''

''آجاؤں گی۔ آپ کہاں ہیں؟''

''گھر سے نکل رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔''

''میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟''

''میں سفید ٹویوٹا کار میں آؤں گا۔ تمہیں بچے کے ساتھ پہچان لوں گا۔ بس تیار رہو۔ میں آرہا ہوں''

وہ ریسیور رکھ کر واش روم میں آئی۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر حلیہ درست کیا۔ اپنا اور بچے کا لباس تبدیل کیا۔ پھر اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا کر باہر آگئی۔ بڑے آہنی گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کہیں بھی جارہی ہوں۔ تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟''

''میں اپنے مالک کا وفادار ہوں۔ ان کا حکم ہے' تمہیں کوٹھی سے باہر نہ جانے دیا جائے۔''

''سامنے سے ہٹو۔ میں جاؤں گی۔''

دونوں میں 'تو تو میں میں' ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت سفید ٹویوٹا وہاں آکر رکی۔ نعیم نے کار سے باہر آکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

صبارانی نے کہا۔ ''یہ مجھے باہر جانے سے روک رہا ہے۔ جواد نے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔''

نعیم نے ایک الٹا ہاتھ چوکیدار کو رسید کیا۔ پھر ریوالور نکال کر نشانہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تیری بیوی بچے ہیں؟''

اس نے سہم کر ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''تو پھر گولی چلنے سے پہلے بھاگتا ہوا ان کے پاس چلا جا۔ وہ تجھے زندہ سلامت دیکھنا چاہیں گے۔''

وہ فوراً ہی ایک طرف بھاگنے لگا۔ نعیم نے ماں اور بچے کو کار میں لا کر بٹھایا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ وہ بولی۔ ''میں جلدی میں آئی ہوں۔ بچے کی دوائیں اور دوسری چیزیں وہیں چھوڑ آئی ہوں۔''

''فکر نہ کرو۔ تمہارے اور بچے کی تمام ضروری چیزیں مل جائیں گی۔ ابھی جلد سے جلد محفوظ پناہ گاہ میں پہنچنا چاہئے۔''

''آپ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟''

''یہاں سے پچیس میل دور میرا ایک فارم ہاؤس ہے۔ وہاں تم بچے کے ساتھ

آرام سے رہو گی۔"

"جواد بہت بڑا سرکاری افسر ہے۔ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر لے جا سکتا ہے۔"

"اس کا باپ بھی تمہارے سائے تک نہیں پہنچ پائے گا۔ تمہاری طرف سے عدالت میں ایک عرضی پیش کی جائے گی۔ تم جواد کے بارے میں تحریری بیان دو گی کہ اس نے الزامات سے بچنے اور اپنی نیک نامی قائم رکھنے کے لئے تمہیں شریک حیات مان لیا تھا۔ مگر گھر لے جا کر ظلم کرتا رہا۔ اپنی پھوپھی زاد سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے۔ تمہارے سامنے شرمناک حرکتیں کرتا ہے۔"

"آپ جو کہیں گے' وہی بیان دوں گی۔ وہ میرے بچے کو تو چھین نہیں سکے گا نا...؟"

"قانون کے مطابق بچہ کم از کم پانچ برس تک ماں کے پاس رہتا ہے۔ پھر باپ اس کی پرورش کا حقدار ہوتا ہے۔"

وہ بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ "کیا وہ پانچ برس بعد اسے لے جائے گا؟"

"میں لے جانے نہیں دوں گا۔ وہ میرے بیوی اور بچے کا قاتل ہے۔ اس کے خلاف ثبوت اور گواہ تلاش کر رہا ہوں۔ اسے عمر قید ہو گی یا سزائے موت پھر یہ بچہ صرف تمہارا ہی رہے گا۔"

وہ جواد کو اپنی بیوی آفرین کا قاتل ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ہی اسے سزا دلا سکتا تھا۔ مگر یہ طے کر چکا تھا کہ اس بچے کو جواد اور ستارہ تک کبھی پہنچنے نہیں دے گا۔

جواد اپنی عادت کے مطابق خوب پی رہا تھا۔ پھر ٹُن ہو کر ستارہ کی آغوش میں سو گیا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ لنچ کے بعد کوٹھی میں آیا تو چوکیدار نے بتایا کہ صبارانی بچے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ اسے روک نہ سکا۔ کیونکہ اسے لے جانے والے کے پاس ریوالور تھا۔

اس نے سفید ٹویوٹا کار کا نمبر بتایا۔ جواد نے فوراً ہی نعیم کے خلاف رپورٹ درج کرائی اور اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرا دیا۔ امجد غوری صبح دس بجے ہی صبارانی کا تحریری بیان اور طلاق کا مطالبہ عدالت میں پیش کر کے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر چکا تھا۔

صبارانی کی جانب سے یہ عرضی بھی پیش کی گئی تھی کہ وہ جواد سے خوفزدہ ہے۔ اسے قتل کیا جا سکتا ہے یا ٹارچر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا طلاق کا عدالتی فیصلہ ہونے تک وہ

نعیم صدیقی کی پناہ میں رہنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ عرضی بھی منظور کر لی گئی تھی۔

جواد غصے سے تلملا رہا تھا۔ اس نے فون پر نعیم کو مخاطب کرنا چاہا۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ پھر گھر کے نمبر پر کوشش کی۔ رابطہ ہوتے ہی اسے گالیاں دینے لگا۔

نعیم نے کہا۔ "فون پر بھونکتے ہی رہو گے۔ میری شرافت دیکھو کہ جواباً گالیاں نہیں دے رہا ہوں۔ مجھے اطمینان ہے' صبارانی عدالت میں تمہارا کچا چٹھا بیان کرے گی۔ تمہارے اور ستارہ کے ناجائز تعلقات کی چشم دید گواہ بنے گی۔ تب تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس اپنی سانسیں گنتے رہو۔"

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ ہمت والوں کے کام ہیں۔ کیا تمہارے باپ نے بھی کبھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

"تم بھول رہے ہو۔ تمہاری چہیتی آفرین کو میں نے ہی ہاکس بے کے کاٹیج میں موت کی نیند سلایا تھا۔ تم بھی میرے ہاتھوں حرام موت مرو گے۔"

وہ بولا۔ "پلیز۔ اپنی باتیں پھر سے دہراؤ۔ میرے اس فون سے ریکارڈر منسلک ہے۔ یہ بات اچھی طرح ریکارڈ ہوتی رہے گی کہ تم نے میری بیوی آفرین کو قتل کیا ہے اور اب مجھے ہلاک کرنے والے ہو۔"

اس نے فوراً ہی گھبرا کر فون بند کر دیا۔ ستارہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "وہ بہت مکار ہے۔ میری تمام باتیں ریکارڈ کر رہا تھا۔"

وہ بڑے پیار سے ڈانٹنے کے انداز میں بولی۔ "جواد! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ غصے میں اتنے پاگل کیوں ہو جاتے ہو؟ دشمن سے بات کرتے وقت محتاط کیوں نہیں رہتے؟ اب بولو... کیا ہو گا؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ "میں نہیں جانتا' کیا ہو گا؟ مگر اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بھلے مجھے پھانسی ہو جائے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تمہارے بغیر میں کیسے جی سکوں گی؟ یہ دشمنی ختم کرو۔ کسی

بھی طرح اس سے سمجھوتہ کرو۔"

"وہ دشمنی کبھی نہیں بھولے گا۔ مجھ سے آفرین کا انتقام لیتا رہے گا اور میں اس کے سامنے جھکنے والا نہیں ہوں۔"

وہ غصے میں نعیم کو چیلنج کر رہا تھا۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی پوزیشن کمزور ہے۔ اگر وہ راضی خوشی صبارانی کو طلاق نہیں دے گا تو وہ عدالت میں اس کے خلاف بہت کچھ بولے گی۔

ایک مظلوم قیدی عورت کو بیوی بنا کر جو نیک نامی حاصل کی تھی۔ اس سے زیادہ بدنامیاں مل سکتی تھیں۔ پھر یہ کہ نعیم کے پاس اس کی آڈیو ریکارڈنگ موجود تھی۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ وہ اسے اور صبارانی کو قتل کرنے والا ہے۔

اس نے کسی حیل وحجت کے بغیر اسے طلاق دے دی۔ وہ فارم ہاؤس سے نکل کر نعیم کی کوٹھی میں آ کر رہنے لگی۔ ستارہ نے فون پر نعیم سے کہا۔"جواد نے طلاق دے دی ہے۔ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بچہ ماں کے پاس رہے گا۔ وہ کبھی اس پر اپنا حق نہیں جتائے گا۔ اب تو ہمیں صلح صفائی اور امن وامان سے رہنا چاہئے۔"

اس نے کہا۔"بیشک۔ میری آفرین مجھے واپس مل جائے گی تو میں امن وامان سے رہوں گا۔"

"تم پھر دشمنی کی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ میں تو صرف اپنی مقتولہ شریک حیات کو یاد کر رہا ہوں اور اسے واپس بلا رہا ہوں۔"

"کیا تم جواد کو قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"توبہ کرو۔ میں نے آج تک ایک چیونٹی نہیں ماری اور تم ایک بندے کو قتل کرنے کی بات پوچھ رہی ہو؟ پھر ایک بار توبہ کرو۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا۔ نعیم نے ستارہ کے موبائل نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہونے پر وہ جھنجلا کر بولی۔"اب کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔"کیا میری بات ریکارڈ کرنے کا فائدہ حاصل نہیں ہوا؟ اب

تمہارے اس موبائل فون پر کہہ رہا ہوں۔ جواد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ انگارے چباتی رہو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ ستارہ نے ٹیلی فون سیٹ کو ایک لات ماری۔ اس سے منسلک رہنے والا ریکاڈر دور فرش پر گر پڑا۔ جواد نے کہا۔"میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا' وہ محتاط رہے گا۔ کبھی فون پر غصہ نہیں دکھائے گا۔ گرفت میں آنے والی کوئی بات نہیں کرے گا۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی ادھر سے ادھر جا رہی تھی۔ اس کے پاس آ کر بولی۔"وہ کتا دشمنی سے باز نہیں آئے گا۔ مر ہی جائے تو اچھا ہے۔"

"وہ مرے گا۔ تم اسے کتا کہہ رہی ہو۔ کتے کی موت ہی مرے گا۔ اپنا موڈ ٹھیک کرو میری جان! میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔"

وہ اسے پیار سے تھپکنے لگا۔ دو ہفتے بعد نعیم بزنس کے سلسلے میں لندن چلا گیا۔ جواد ایسے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ اس نے کرائے کے دو قاتلوں کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ دو لاکھ روپے دیتے ہوئے کہا۔"یہ پیشگی رقم ہے۔ اسے موت کی نیند سلا کر آؤ گے تو چار لاکھ اور دوں گا۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔"ہم ایک ہفتے کے اندر واپس آئیں گے۔ خوشخبری سنائیں گے۔ آپ رقم تیار رکھیں۔"

وہ انہیں رخصت کر کے ستارہ کے پاس آ گیا۔ اسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے بولا۔"میں نے کرائے کے قاتلوں کو اس کے پیچھے بھیجا ہے۔ دو چار دن میں خبر ملے گی۔ وہ کم بخت مرے گا تو صبارانی بے سہارا ہو جائے۔ پھر اس سے نمٹ لیا جائے گا۔ میرا بچہ جلد ہی تمہاری گود میں آنے والا ہے۔"

نعیم دشمن کی چال سے بے خبر تھا۔ بے خبری میں یقیناً مارا جانے والا تھا۔ لندن میں کاروباری مصروفیت ایسی تھی کہ کسی دشمن کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں ڈنر کے بعد اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ لباس تبدیل کر کے سونا چاہتا تھا۔ ایسے وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔"کون ہے؟"

باہر سے آواز سنائی دی۔"میں ہوں رستم بابا..."

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔"تم پاکستان سے یہاں آئے ہو؟ کیا کسی کی سپاری ملی ہے؟"

وہ دونوں اندر آ گئے۔ انہوں نے اپنا اپنا ریوالور نکالا۔ رستم بابا نے کہا۔ ”جواد اکبر نے آپ کے نام کی سپاری دی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”وہ الو کا پٹھا نہیں جانتا کہ ہم آپ کے لئے کام کرتے ہیں۔“

نعیم نے کہا۔ ”تم لوگوں نے ستارہ کو اغوا کیا تھا۔ وہ تو تمہیں پہچانتی ہے۔“

”وہ موجود ہوتی تو پہچان لیتی۔ پھر وہ ہمیں دو لاکھ نہ دیتا۔ آپ کو قتل کرنے کے بعد چار لاکھ دے گا۔“

نعیم نے کہا۔ ”یعنی کہ چھ لاکھ... اس میں اور چھ لاکھ میری طرف سے جوڑ دو اور جا کر خوشخبری سناؤ کہ میرا کام تمام ہو چکا ہے۔ اسے مطمئن کرنے کے بعد میرا انتظار کرو۔ میں وہاں آ کر بتاؤں گا کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟“

وہ دونوں اسے سلام کر کے واپس چلے گئے۔ جس کی موت نہ آئی ہو۔ تقدیر اسے ایسی ہی ہیرا پھیری سے بچاتی ہے۔ جواد کی شامت آئی تھی۔ اسی لئے اس نے رستم بابا کو واردات کے لئے وہاں بھیجا تھا۔ انہوں نے واپس آ کر نعیم کا شناختی کارڈ اور موبائل فون پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اسے قتل کر کے دریائے ٹیمز میں پھینک دیا ہے۔“

یہ ثبوت کافی تھے۔ اسے یقین ہو گیا۔ اس نے بقیہ چار لاکھ روپے ادا کر دیئے۔ کرائے کے قاتل خوش ہو کر چلے گئے۔ دوسرے ہی دن لندن آفس سے اطلاع ملی کہ نعیم صدیقی پچھلے دو دن سے لاپتہ ہے۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ پاکستان بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے؟

ستارہ اور جواد مطمئن تھے۔ یہی سمجھ رہے تھے' اس کی لاش کبھی کسی کو نہیں ملے گی۔ وہ دریائے ٹیمز میں بہتی ہوئی نہ جانے کہاں چلی گئی ہو گی؟

صبارانی بہت پریشان تھی۔ اچانک بے سہارا ہو گئی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں جواد کے خلاف بیان دیا۔ جسے بے سروپا سمجھا گیا۔ کیونکہ جواد اس عرصے میں لندن نہیں گیا تھا۔ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

نعیم نے ایک وصیت لکھی تھی کہ اسے کچھ ہو جائے تو صبارانی کو اس کی کوٹھی سے بے دخل نہ کیا جائے۔ اسے ماہانہ پچاس ہزار روپے دیئے جائیں اور جواد کی دشمنی سے محفوظ

رکھنے کے لئے اس کے دو مسلح گارڈز کو بھی تنخواہیں دی جاتی رہیں۔

ستارہ نے ایک روز اس سے فون پر پوچھا۔ ”کیا تم نے نعیم کو اپنا یار بنا لیا تھا؟ وہ مرنے سے پہلے تمہارے لئے ایسے زبردست انتظامات کر گیا ہے۔“

صبارانی نے پوچھا۔ ”تمہیں مرچیں کیوں لگ رہی ہیں؟“

”میں تو بہت خوش ہوں۔ میرے کاروبار کو برباد کرنے والا اور بے ایمانی سے میری دولت اور جائیداد لوٹنے والا حرام موت مر گیا ہے۔“

صبارانی نے کہا۔ ”مجھے تیری شرمناک زندگی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر... تُو دودھ شریک بھائی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہتی ہے۔ نعیم صاحب میرے محسن ہیں۔ انہیں اپنے ناجائز بچے کا باپ بنانا چاہتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آفرین نے یہ بھید کھولا تو تیرے یار جواد نے اس بیچاری کو ہاکس بے کے کاٹج میں قتل کر دیا۔“

ستارہ نے کہا۔ ”وہ تو مر گئی۔ تُو اپنی خیر منا۔ آگے تیرا کیا بنے گا؟“

”تیرے اس سوال کا جواب آنے والا کل دے گا۔“

ستارہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ادھر سے فون بند ہو گیا۔ جواد اسے آغوش میں لئے بیٹھا تھا۔ اس کے فون سے کان لگا کر صبارانی کی باتیں سن رہا تھا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”اچھا تو سوال کا جواب آنے والا کل دے گا۔ کل کیا وہ قیامت ڈھائے گی؟ کمال ہے... ایک بلی شیر کو للکار رہی ہے۔“

وہ پھر قہقہہ لگانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اصل مہرے کو مار چکا ہے۔ اب سے پہلے ذلت بھری زندگی گزارنے والی صبارانی تنہا رہ گئی ہے۔ وہ بس میاؤں میاؤں ہی کرتی رہے گی۔

صبارانی نے کہا تھا۔ ”آنے والا کل جواب دے گا...“ اور وہ کل آ گیا... جواد دس بجے ناشتہ کر کے کوٹھی سے باہر گیا تھا۔ ستارہ نے دو گھنٹے بعد فون ریسیو کیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی سی' بھرائی ہوئی سی آواز سنی۔ ”ستارہ...! میں بول رہا ہوں۔ اور شاید آخری بار بول رہا ہوں۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہو تم...؟“

”جہاں ہوں' وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ یہاں چاروں طرف قبریں ہی

قبریں ہیں۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟ جلدی بتاؤ....."

"بتانے سے پہلے ہی یہ گولی ماردیں گے۔"

"کچھ تو اشارہ دو۔"

"اشارہ تو دیا ہے۔ سمجھتیں کیوں نہیں؟"

"ہاں ہاں سمجھ گئی۔ تم کسی قبرستان میں ہو۔ مگر اس شہر میں کتنے ہی قبرستان ہیں۔ میں کہاں آؤں؟"

جواب میں ایک بھاری بھرکم سی آواز سنائی دی۔ "آؤ گی تو تمہیں بھی یہیں سلا دیا جائے گا۔ یہاں اپنے یار کے ساتھ سوتی رہو گی تو کیڑے کھاتے رہیں گے۔"

"کون ہو تم....؟ کیوں ہم سے دشمنی کر رہے ہو؟"

"یہ کتا جو ہمارے گن پوائنٹ پر ہے۔ ایک غریب بے سہارا لڑکی سے دشمنی کرتا رہا۔ اسے ساری عمر جیل کی چار دیواری میں رکھنے کی کوششیں کرتا رہا۔ جب قانون کی گرفت میں آنے لگا تو اسی لڑکی کے ذریعہ نیک نامی کماتا رہا۔ جب نیک نامی ملی تو اسے گھر لے جا کر اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتا رہا۔ ایک دودھ پیتے بچے کو اس سے چھین لینا چاہا۔"

وہ ایک ذرا توقف سے غرانے کے انداز میں بولا۔ "کیا قصور تھا صبا رانی کا اور آفرین کا...؟ مردہ بہ دست زندہ... آدمی مرنے کے بعد زندہ لوگوں کے رحم و کرم پر رہتا ہے۔ اسے مٹی میں ملا دیں، چتا میں جلا دیں یا دریا برد کر دیں۔ مگر تیرے یار جیسے لوگ تو مرنے سے پہلے ہی زندہ رہنے والوں کو ہر لمحہ مارتے رہتے ہیں۔ مگر نہیں.... تیرا یہ یار مرنے کے بعد زندہ لوگوں کے ہاتھوں خوار ہوتا رہے گا۔ آج کے بعد تو یہ تماشہ دیکھے گی.... یہ لے آواز سن... یہ مرنے کے بعد بہ دست زندہ رہنے والا ہے۔"

جواد کی چیخ سنائی دی۔ "ستارہ! مجھے بچاؤ..."

اس کے ساتھ ہی ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر بالکل خاموشی چھا گئی۔ ستارہ کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اس نے چیختے ہوئے آوازیں دیں۔ "جواد....! جواد....! بولو... تم بولتے کیوں نہیں؟"

وہی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "یہ کبھی نہیں بولے گا۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتی ہو تو قانون کے محافظوں سے بولنے کی غلطی نہ کرنا۔ تمہیں اس کی لاش مل جائے گی۔ مگر ذرا صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔ اپنے فون سے لگی رہو۔ میں کسی وقت بھی کال کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے دھمکی دی گئی تھی کہ اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرے گی تو جان سے جائے گی۔ اور وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ جبکہ مرنے والے کے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا چکی تھی۔ زندگی میں سب ہی قسمیں کھاتے ہیں مگر کوئی کسی کے ساتھ قبر میں نہیں جاتا۔"

ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ اس نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ وہی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "اس دنیا میں تیرے یار جیسے کتنے ہی کمینے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے لاش کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ واپس آ کر دیکھا تو یہ ننگا ہو گیا تھا۔ یقیناً چرسی موالی آئے ہوں گے۔ اس کا لباس اتار کر لنڈے بازار لے گئے ہوں گے۔ انہیں پڑیا خریدنے کے پیسے مل گئے ہوں گے۔"

وہ ایکدم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "تمہیں رونا نہیں چاہئے۔ یہ اپنی زندگی میں قیدی عورتوں کو ننگا کرتا رہا۔ اب مرنے کے بعد یہ ننگا ہوا ہے تو روتی کیوں ہو؟"

وہ روتے ہوئے، سسکتے ہوئے بولی۔ "اب تو اُسے میرے حوالے کر دو۔"

"یہ تمہیں ضرور ملے گا۔ اگلی کال کا انتظار کرو۔"

رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وہ روتی رہی، آنسو پونچھتی رہی، آہیں بھرتی رہی اور اپنے یار کو تصور میں برہنہ دیکھتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد پھر وہی آواز سنائی دی۔ "آہ... مردہ بدست زندہ.... یہ ہماری دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ جرائم پیشہ افراد انسانی اعضاء کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے گئے تھے۔ پھر واپس آ کر دیکھا تو تیرے یار کے دونوں گردے نہیں تھے۔ اگر یہ زندہ ہوتا تو کبھی کسی کو زندگی دینے کے لئے اپنے گردے پیش نہ کرتا۔ چلو مرنے کے بعد نیکی کما رہا ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ میرے جواد کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟"

"وہی جو یہ زندگی میں زندہ لوگوں کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ اب آنسو پونچھو اور جاؤ۔ وہ نیو کراچی چھ نمبر والے قبرستان میں پڑا ہے۔ اب تم اس کے قتل کی رپورٹ درج کرا سکتی ہو۔"

ان ماں بیٹی نے بھاگم بھاگ رپورٹ درج کرائی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا۔ اپنے تحریری بیانات دیئے۔ فون پر کال کرنے والے نے تاکید کی تھی کہ صبارانی پر شبہ ظاہر نہ کیا جائے۔ ستارہ کو اپنی سلامتی عزیز تھی۔ لہٰذا اس سارے معاملے میں صبارانی کا ذکر نہیں آیا۔

ستارہ نے رودھو کر اس کی آخری رسومات ادا کردیں۔ رات کو آکر سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو فون کی گھنٹی نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ وہی سفاک آواز سنائی دی۔ "تم شاید آرام سے سو رہی ہو۔ مگر وہ آرام سے نہیں ہے۔ دو بندے اس کی قبر کھود رہے ہیں۔"

وہ ایکدم سے روتے ہوئے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تم کون ہو؟ دل و دماغ میں یہی بات آرہی ہے کہ تم نعیم ہو۔ اگر ہو تو خدا کے واسطے.... میرے جواد کو معاف کردو۔ اب اس سے انتقام نہ لو۔"

"ایسے ظالموں سے قیامت تک انتقام لیا جاتا رہے، تب بھی ہماری دنیا میں کسی کو عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ سیدھی سی بات ہے، ظلم کبھی ختم نہیں ہوگا اور انتقام کا سلسلہ جاری رہا کرے گا۔ رات کا ایک بجا ہے۔ اپنے یار سے محبت ہے تو جاؤ اور اس کی قبر کی حفاظت کرو۔"

وہ اتنی رات کو تنہا نہیں جاسکتی تھی۔ پولیس والوں کے ساتھ جانا چاہتی تو سوال کیا جاتا کہ اسے کیسے خبر ہوئی، وہاں قبر کھودی گئی ہے؟ وہ فون پر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "ارے.... یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟"

"وہ ہو رہا ہے، جس کی توقع نہیں کرسکتے تھے۔ ہم سمجھ رہے تھے، قبر کھودنے والے کفن چور ہیں۔ کفن اتار کر لے جائیں گے اور مردے کو وہیں چھوڑ دیں گے۔ مگر...."

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "مگر کیا...؟"

"کیا کہا جائے؟ ہماری دنیا میں مجرمانہ تجارت کی انتہا ہو چکی ہے۔ تم نے بڑے

بڑے ہسپتالوں کے ڈی سیکشن ہال میں مکمل انسانی ڈھانچے دیکھے ہوں گے۔ ایسے ڈھانچے اچھی قیمت پر خریدے جاتے ہیں۔ وہ قبر کھودنے والے تمہارے یار پر تیزاب ڈال کر گوشت گلا رہے ہیں۔"

وہ ایکدم سے چیخ پڑی۔ "نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"تم جھوٹ سمجھ رہی ہو، ہم سے بحث کررہی ہو اور ادھر سارا گوشت گل چکا ہے، صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ پتہ نہیں وہ لوگ اسے کہاں لے جائیں گے؟ میں معلوم کروں گا۔ پھر تمہیں اطلاع دوں گا۔ فون سے لگی رہو۔"

اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ شاید کسی نے کسی دشمن سے ایسا انتقام نہیں لیا ہوگا۔

ایک ہفتے بعد اسے فون پر صبارانی کی آواز سنائی دی۔ "میں بہت بیمار ہوں۔ سخی عبداللہ ہوسپٹل میں پڑی ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ مرنے سے پہلے اس شخص کا نام بتانا چاہتی ہوں، جو موت کے بعد بھی جواد سے انتقام لیتا رہا ہے۔ کیا ابھی آسکتی ہو؟"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی آرہی ہوں۔"

وہ جس حلیے میں تھی، اسی حلیے میں کوٹھی سے باہر آئی۔ پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتی ہوئی ہوسپٹل کے مطلوبہ وارڈ میں پہنچ گئی۔ وہاں صبارانی دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک کر بولی۔ "تم تو اچھی بھلی نظر آرہی ہو؟"

"ہاں۔ تمہارا جواد اچھا بھلا نہیں ہے۔ کیا اس سے ملنا چاہو گی؟"

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ...؟ مگر وہ تو مر چکا ہے...."

"شیطان کبھی نہیں مرتا۔ یقین نہ ہو تو آکر دیکھ لو۔"

وہ ایک طرف جانے لگی۔ ستارہ بھی متجسس سی ہو کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس ہال میں آئی، جہاں سرجری کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ ایک جانب ایک مکمل انسانی ڈھانچہ اسٹینڈ پر لٹک رہا تھا۔ ستارہ اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک گئی۔ فون پر اس سے کہا گیا تھا، انسانی ڈھانچوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

اسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔ "غور سے دیکھو... یہی تمہارا یار ہے۔"

اس نے چونک کر سر گھماتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پیچھے نعیم صدیقی مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''تم اسے اچھے داموں خرید کر لے جاسکتی ہو۔ اس کے ساتھ اپنی زندگی کی تمام راتیں گزار سکتی ہو۔''

وہ صبا رانی کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے بولا۔ ''مجھے میری آفرین بچے سمیت مل گئی ہے۔''

ستارہ چکرا کر گر پڑی تھی۔ اس کے سر کے قریب ہی جواد بتیسی نکالے لٹک رہا تھا۔

(ختم شد)

اورنگِ خاروحشت

شہزادہ خرم (شاہجہاں) اور نور جہاں میں ٹھن گئی تھی۔ نور جہاں آگ تھی اور شہزادہ خرم پانی۔ وہ پانی بھڑکتے ہوئے شعلے کو نہیں بجھا سکتا تھا اور وہ جلا ڈالنے والی آگ اس پانی کو بھاپ بنا کر نہیں اڑا سکتی تھی۔ دونوں ہی ضدی اور ارادے کے پکّے تھے۔ ایک دوسرے سے مات کھانا کبھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی زیر ہو جاتا تو وہ آئندہ اقتدار حاصل کرنے میں ناکام رہتا۔

نور جہاں ناکامیوں کا منہ پھیرنا جانتی تھی۔ یہ اندیشہ سر اٹھا چکا تھا کہ اُس نے اپنے پسند کے شہزادے کو تاج وتخت کا جانشین نہ بنایا تو شہزادہ خرم تخت نشین ہو کر اسے اقتدار سے محروم کر دے گا۔ ایک ملکہ کو دو کوڑی کی بنا کر رکھ دے گا۔

وہ تو جہانگیر کی زندگی میں آتے ہی اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس کی پشت پر بیٹھ کر پورے ہندوستان پر حکومت کرتی تھی اور اپنے نام کا سکّہ چلاتی تھی۔ وہ شراب وشباب سے بہلنے والے بادشاہ کی کمزوریوں سے اچھی طرح کھیل رہی تھی۔ اس کے آس پاس پرانی کنیزوں

کی چھٹیاں کر کے نت نئی حسین پریوں کا میلہ لگائے رکھتی تھی۔ اس کی شراب میں کمی کر کے افیون کی مقدار بڑھاتی تھی۔ اسے ہمیشہ نشے میں ڈبوئے رکھتی تھی اور اپنی ہر جائز اور ناجائز بات منوالیا کرتی تھی۔

پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی شہزادہ خرم سے کرائے گی اور ہونے والے مستقبل کے بادشاہ کو اپنا داماد بنالے گی۔ پھر اپنی بیٹی کے ساتھ داماد کی کمزوریوں سے بھی اسی طرح کھیلتی رہے گی جس طرح ابھی جہانگیر کی کمزوریوں سے کھیل رہی تھی۔ لیکن شہزادہ خرم کو اپنا داماد بنانے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ وہ لاڈلی بیگم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر ارجمند بانو چھائی ہوئی تھی۔

ارجمند بانو، نور جہاں کے بھائی آصف جاہ کی بیٹی تھی۔ نور جہاں یہ خوب سمجھتی تھی کہ اس کا بھائی اقتدار حاصل کرنے کے لالچ میں اپنی بیٹی کو شہزادہ خرم سے ضرور منسوب کرے گا۔ دوسری طرف شہزادہ خرم کی ماں جگت گوسائیں عرف بلقیس مکانی اپنی سوکن نور جہاں کی طرح جوڑ توڑ میں ماہر تھی۔ جب اس نے اپنے بیٹے ولی عہد خرم کو ارجمند بانو کی طرف مائل دیکھا تو فوراً اسے اپنی بہو بنانے کے لئے راضی ہو گئی۔

یہ سوکنوں کے درمیان اقتدار حاصل کرنے کی جنگ تھی۔ بلقیس مکانی نے یہ دیکھا تھا کہ نور جہاں نے جہانگیر کی زندگی میں آتے ہی اسے اپنا دیوانہ بنالیا ہے۔ وہ جہانگیر کی حسن پرستی اور شراب و شباب میں مست رہنے والی عادتیں بدل نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے نور جہاں کے سحر سے نکال سکتی تھی۔ لیکن یہ اطمینان حاصل تھا کہ تاج و تخت بالآخر اس کے اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو ہی ملے گا اور اس کے ساتھ ہی نور جہاں کا زوال شروع ہو جائے گا۔

جہانگیر نے اور اس کے والد جلال الدین اکبر نے بہت پہلے ہی شہزادہ خرم کے ولی عہد ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ باپ دادا کی زبان جھوٹی نہیں پڑ سکتی تھی۔ یوں بلقیس مکانی کو اطمینان تھا کہ اس کا اپنا بیٹا شہزادہ خرم ہی مستقبل کا بادشاہ ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ نور جہاں اس سلسلے میں ولی عہد خرم کے خلاف سازشیں کرے گی۔ لہٰذا اس نے بھی نور جہاں کے خلاف سازش شروع کر دی۔ اس کے بھائی آصف جاہ کی بیٹی کو بہو بنانے کی بات بادشاہ جہانگیر کے کانوں میں پھونک دی۔

آئندہ نور جہاں کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو رہا تھا کہ بھائی کی بیٹی مستقبل کے بادشاہ سے منسوب ہو گی تو وہ موجودہ لامحدود اختیارات سے محروم ہو جائے گی اور اس کا بھائی اس پر حاوی ہو جائے گا۔ یوں بلقیس مکانی نے ارجمند بانو کو اپنی بہو بنانے کا عزم کر کے ان بہن بھائی کے درمیان رنجشیں پیدا کر دی تھیں اور یہ رنجشیں آئندہ عداوت میں بدلنے والی تھیں۔

اب صورتحال یہ تھی کہ شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی شادی کا مقدمہ جہانگیر کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ ایک طرف بلقیس مکانی نے کہہ دیا تھا کہ وہ ارجمند بانو کو ضرور اپنی بہو بنائے گی۔ دوسری طرف نور جہاں نے جہانگیر سے کہہ دیا تھا۔ ”آپ یہ رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ اگر آپ بلقیس مکانی کی حمایت کریں گے اور ارجمند بانو کو اپنی بہو بنانا چاہیں گے تو ہم ہمیشہ آپ سے ناراض رہیں گے۔“

جہانگیر نے ارجمند بانو کے باپ یعنی اپنے سالے آصف جاہ کو طلب کیا تھا۔ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ باپ اپنی بیٹی کو شہزادہ خرم سے منسوب کرنے کے لئے راضی ہے یا نہیں....؟

شہزادہ خرم اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے بہت بے چین تھا۔ جہانگیر کی خوابگاہ کے قریب ایک راہداری میں ٹہل رہا تھا۔ آصف جاہ حاضری کے لئے وہاں گیا ہوا تھا۔ خوابگاہ کے بند دروازے کے پیچھے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟ کیا فیصلے ہونے والے تھے؟ وہ نہیں جانتا تھا اور جاننے کے لئے مضطرب ہو رہا تھا۔ آصف جاہ کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

ایسے وقت ارجمند بانو اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہی تھی اور پوچھ رہی تھی۔ ”ہمارا کیا بنے گا....؟ کیا آپ نے کسی نجومی سے ہمارے بارے میں کچھ پوچھا ہے؟“

شہزادہ خرم نے زیر لب کہا۔ ”ہاں۔ پوچھا تھا وہ کہہ رہا تھا‘ ہمارے دل کی مرادیں پوری ہوں گی۔“

ارجمند بانو نے کہا۔ ”نہ جانے آپ کے دل میں کتنی مرادیں ہیں؟ کیا آپ نے نجومی سے کہا تھا‘ ہم آپ کی پہلی اور آخری آرزو ہیں؟“

”ہم نے نجومی کے سامنے تمہارا نام لیا تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ

ہماری مراد پوری ہوگی اور تم ہم سے منسوب کی جاؤ گی۔''

وہ مایوس ہو کر بولی۔ ''ہمیں یقین نہیں آتا۔ ہماری پھوپھی جان ملکہ نور جہاں ایک گہرا سمندر ہیں۔ یہ سوچ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کیا ہم اس سمندر کو عبور کر کے ایک دوسرے کی زندگی میں آسکیں گے؟''

فی الوقت یہی سوال سب سے زیادہ اہم تھا۔ وہ سر جھکائے سوچتا ہوا' وہاں سے چلتا ہوا ایک جھروکے کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر محل کے باہر دور تک دیکھنے لگا اور دور تک سوچنے لگا۔

☆☆☆

اس جنگل میں حد نظر تک رنگ برنگے خیمے ہی خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ رنگا رنگ خیمے شاہی خاندان کی بیگمات کے لئے نصب کئے گئے تھے۔ جب بادشاہ سلامت شکار کے لئے نکلتے تھے تو اپنے ساتھ بیگمات کو بھی تفریح کی غرض سے شکار گاہ کی طرف لے آتے تھے۔ یوں پردہ نشین بیگمات کو محل کی چار دیواری سے باہر جنگل میں منگل منانے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔

وہاں بیگمات کے علاوہ کنیزوں اور دیگر خادماؤں کے لئے بھی خیمے لگائے جاتے تھے۔ پھر خواجہ سرا اور کھانا پکانے والیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح دور تک خوبصورت سی شاہی خیمہ بستی دکھائی دیتی تھی۔

وہ شاہی خیمہ بستی شکار گاہ سے ذرا دور ہوا کرتی تھی۔ اس کے چاروں طرف سینکڑوں کی تعداد میں مسلح سپاہی دن رات پہرہ دیتے رہتے تھے۔ بیگمات کے خیموں کے آس پاس رنگ برنگے خوبصورت پھول کھلا کرتے تھے۔ اگر قدرتی طور پر نہ کھلے ہوں تو حسنِ نظر کے لئے پھول مہیا کئے جاتے تھے۔ سانپ' بچھو اور دیگر حشرات الارض کو نابود کرنے کے لئے گھاس اور جھاڑیوں میں دور تک دوائیں ڈالی جاتی تھیں۔ پھر ان کی ناگوار بو کا توڑ کرنے کے لئے خیموں کے اندر اور باہر طرح طرح کی خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ گھنے جنگل میں جہاں خونخوار شیروں کا ہانک کر لایا جاتا تھا' وہاں نازک مزاج بیگمات کے ناز نخرے اٹھانے کے انتظامات میں بھی کسی طرح کی کمی نہیں کی جاتی تھی۔

صرف ملکہ نور جہاں ان تمام بیگمات سے دور شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ شکار گاہ میں موجود رہا کرتی تھی۔ وہ پہلے بھی اس کے ساتھ شیروں کا شکار کر چکی تھی۔ اب سیاسی حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ شاہی محل ہو' دربار شاہی ہو یا شکار گاہ ہو۔ کہیں بھی جہانگیر کا پیچھا نہ چھوڑا جائے۔ پھر یہ کہ شیر کا شکار بھی کیا تھا' محض ایک تفریحی نمائش تھی۔ دن رات نشے میں مست رہنے والا بادشاہ ایک مچھر بھی نہیں مار سکتا تھا۔ شیر کا شکار کیا کرتا؟

وہ نور جہاں کے ساتھ شکار گاہ میں آتا تھا۔ اور درخت پر چڑھ کر مچان میں اس کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ اس مچان کے آس پاس ماہر شکاری ہوا کرتے تھے۔ جو شیر مارتے تھے اور شیر مارنے کا سہرا بادشاہ کے سر باندھ دیا کرتے تھے۔

بیگمات کی خیمہ بستی میں صرف بادشاہ اور شہزادوں کو آنے کی اجازت تھی۔ وہیں شہزادہ خرم نے پہلی بار ارجمند بانو کو دیکھا تھا اور دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ وہ ایک درخت کے سائے میں اونچی سی چوکی پر چڑھی ہوئی تھی۔ درخت کی ایک شاخ تک پہنچ کر وہاں سے سیب توڑ رہی تھی۔ اس کی بلندی' دراز قامتی اور اس کا سراپا ایسا تھا کہ شہزادہ خرم اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کی خادمائیں اس اونچی سی چوکی کو تھامے کھڑی ہوئی تھیں۔ شہزادے نے اشارے سے ایک خادمہ کو بلا کر پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

خادمہ نے کہا۔ ''یہ ملکہ نور جہاں کے برادر آصف جاہ کی بیٹی ارجمند بانو ہیں۔''

کچھ فاصلے سے گیت گانے والیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شہزادے نے پوچھا۔ ''کیا یہاں اور بھی بیگمات آئی ہوئی ہیں؟''

خادمہ نے کہا۔ ''جی ہاں۔ ادھر درختوں پر جھولے ڈالے گئے ہیں۔ بیگمات جھول رہی ہیں اور ناچنے گانے والیاں ان کا دل بہلا رہی ہیں۔''

شہزادہ تیزی سے چلتا ہوا ارجمند بانو کے پاس آیا۔ پھر خادماؤں کو اشارے سے سمجھایا کہ وہاں سے ذرا دور ہو جائیں۔

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ارجمند بانو سر اٹھائے سیب توڑنے میں مصروف تھی۔ اسے پتہ نہ چلا کہ نیچے کون آیا ہے؟

شہزادے نے اس اونچی سی چوکی کو ذرا ہلایا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ پھر وہ نیچے گرنے لگی۔ اس سے پہلے ہی شہزادے نے اسے دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔

وہ نیچے گرتے وقت اس قدر سہم گئی تھی کہ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جب یہ محسوس ہوا کہ وہ محفوظ ہے اور کسی نے اسے تھام لیا ہے تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر ایک اجنبی کو اس قدر قریب دیکھ کر بدحواس ہو گئی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لئے مچلنے لگی۔

وہ بولا۔ ''ہم نے آپ کو سنبھالا ہے۔ یونہی سنبھالے رہنے دیں۔''

وہ عاجزی سے بولی۔ ''خدارا! ہمیں چھوڑ دیں۔ ایسی جرات نہ کریں۔''

''کیا آپ ہمیں جانتی ہیں؟''

''شہزادے لاکھوں میں پہچانے جاتے ہیں۔ پھر یہ تیور بتا رہے ہیں کہ آپ ولی عہد ہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ آپ مستقبل کے اس بادشاہ سے منسوب ہونے والی ہیں۔''

وہ حیا سے سرخ ہونے لگی۔ نظریں جھک گئیں۔ پھر کسمساتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو خدا کا واسطہ.... حیا کا پاس رکھیں۔ خادمائیں دیکھ رہی ہیں۔''

اس نے دور کھڑی ہوئی خادماؤں کو دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ''کوئی ادھر نہ دیکھے۔''

تمام خادماؤں نے حکم کی تعمیل کی۔ دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اسی لمحے میں شہزادے نے ایسی جرات کی جس کی وہ توقع نہیں کر سکتی تھی۔ احتجاجاً کچھ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ ہونٹوں پر مہر لگا دی گئی تھی۔ اسے بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا گیا تھا اور بولتی بھی کیا؟ دل تو پاگل ہو گیا تھا۔ دھڑک دھڑک کر سینے کی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔

جب ذرا نجات ملی تو وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ اگرچہ بازوؤں کے حصار میں تھی۔ لیکن اندر سے بکھر رہی تھی۔ جیسے تنکا تنکا ہو کر ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔ شرم سے آنکھیں کھولی نہیں جا رہی تھیں۔

اور شہزادہ تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں سے دانہ چگ رہا تھا۔ وہ حیا سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''خدارا! ہماری عزت اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ خادمائیں ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گی؟''

''ہم ایک شرط پر جانے دیں گے۔''

''آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ مگر خدا کا واسطہ ہے۔ ہمیں چھوڑ دیں۔ جانے دیں۔''

''وعدہ کریں' آج رات پہلے پہر کے بعد یہاں اسی جگہ آئیں گی۔ ہم آپ کے منتظر رہیں گے۔''

اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ''رات کے وقت....؟ یہاں....؟ تنہائی میں....؟''

''جب ہم ہوں گے تو تنہائی نہیں ہو گی۔ اپنے دل سے خوف نکال دیں۔ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو کوئی ہم پر انگلی اٹھانے کی جرات نہیں کر سکے گا اور ہم تو محبت سے بلا رہے ہیں۔ کوئی جرم نہیں کر رہے ہیں۔''

اس نے بازوؤں سے اسے اتارا۔ وہ اترتے ہی الگ ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے کھینچ کر دھڑکنوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے وعدہ کریں' آج رات پہلے پہر کے بعد یہاں آئیں گی؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''ہماری سمجھ میں نہیں آتا' ہم کیسے آئیں؟ جب بھی رات کو خیمے سے باہر نکلیں گے تو مسلح اُردہ بیگنیاں ہمارے ساتھ ہوں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ انہیں ساتھ آنے دیں۔ ہم ان سے نمٹ لیں گے۔''

اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے وعدہ کیا۔ پھر خادماؤں کے ساتھ وہاں سے خیموں کی طرف چلی گئی۔ لیکن جانے کے بعد بھی نگاہوں کے سامنے ہی رہی۔ عجیب نازک اندام دوشیزہ تھی۔ چھونے اور سمیٹنے کے بعد یوں لگا' جیسے مکھن کو تراش کر اسے وجود میں لایا گیا ہو۔

ایسا نہیں تھا کہ اس نے پہلی بار کسی حسینہ کو ہاتھ لگایا ہو۔ اس کی ایک شادی ایران کے شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ دو چار انتہائی حسین کنیزیں

بھی کلیاں بن کر اس کی زندگی میں آئی تھیں اور پھول بن کر گئی تھیں۔ لیکن ارجمند بانو میں کوئی ایسی بات تھی جو اسے بالکل ہی منفرد بنا رہی تھی۔

وہ فی الحال تجزیہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ جانے والی کس طرح اسے سحر زدہ کر گئی ہے؟ نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

وہ دن اس نے بڑی بے چینی سے گزارا۔ رات ہوئی تو ناسازیٔ طبیعت کا بہانہ کر کے شکارگاہ کی طرف نہیں گیا۔ جہاں ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ اس طرف چلا آیا۔ وہاں نہ مخملی آرام دہ تخت تھا اور نہ ہی پھولوں کی سیج تھی۔ دور تک ہری بھری گھاس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ بیگمات اور شہزادیاں رفع حاجت اور دوسری ضروریات کے لئے رات کو خیمے سے باہر نکلا کرتی تھیں۔ ارجمند بانو بھی اسی بہانے سے ادھر آئی تو اس کے آگے پیچھے چار اردہ بیگیاں بندوقیں اور ننگی تلواریں لئے ہوئی تھیں۔

وہ سب مشعلوں کی روشنی میں شہزادے کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ شہزادہ خرم نے کہا۔ ''ارجمند بانو کو ہم نے طلب کیا ہے۔ یہ راز یہیں تک محدود رہے۔ آگے کسی خیمے تک نہ پہنچے۔''

چاروں نے سر جھکا لیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''شہزادہ ولی عہد کا اقبال بلند ہو۔ یہ راز، راز ہی رہے گا۔''

خرم نے کہا۔ ''یہ مشعلیں لے کر دور چلی جاؤ۔ ہم پھر کسی وقت طلب کریں گے۔''

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ارجمند بانو کو وہاں چھوڑ کر مشعلیں اپنے ساتھ لے گئیں۔ وہاں صرف ایک ہی مشعل رہ گئی۔ ان کے جاتے ہی شہزادے نے قریب آنا چاہا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''خدارا! ہم سے فاصلہ رکھیں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''خلوت میں فاصلہ نہیں رہتا۔ صرف اہم فیصلے رہ جاتے ہیں۔ آؤ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں۔''

وہ پھر ذرا قریب آیا۔ وہ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''ذرا رک جائیں۔ ذرا سوچیں وہ اُردہ بیگیاں عورتیں ہیں۔ وہ چاروں ایک عورت کو یہاں تماشہ بنتے دیکھنا چاہیں گی۔ کہیں دور جا کر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔''

''درست کہتی ہیں۔ ہم آپ کو تماشہ نہیں بنائیں گے۔''

اس نے مشعل بجھا دی۔ پہلے تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر ستاروں کی روشنی میں وہ دونوں سائے سائے کی طرح ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگے۔ ارجمند بانو نے کہا۔ ''ہم آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''آپ عرض نہ کریں۔ فرمائیں۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔''

شہزادے کی جذباتی قربت کچھ ایسی تھی کہ اس کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی سی بولی۔ ''ہر کنواری کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد اس کی تقدیر لکھتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ صاحب عالم ہمارے لئے کیا لکھنے آئے ہیں؟ کیا ہمیں ایک رات کی شمع بنا کر روشن کریں گے؟ پھر زندگی کی باقی تمام راتیں بجھنے کے لئے چھوڑ دیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''ہیرا اپنی قدر نہیں جانتا۔ جوہری جانتا ہے اور ہم نے آپ کو پرکھ لیا ہے۔ یہ ہمارا حتمی فیصلہ ہے کہ آپ ہماری شریک حیات بنیں گی اور مستقبل میں ہندوستان کی ملکہ معظمہ....''

''گستاخی معاف۔ کہیں ہم سبز باغ تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟ کیا آپ ہمارا شک و شبہ دور فرمائیں گے؟ ہمیں یقین ہونا چاہئے کہ ہماری پارسائی کے عوض آپ کی وفا صرف ہمارے لئے ہوگی۔''

''شاہوں کی زندگی میں بیگمات اور کنیزیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ہم قسم کھاتے ہیں، وعدہ کرتے ہیں کہ ان آنے جانے والیوں کے درمیان ہماری محبت اور وفا صرف آپ کے لئے ہوگی۔''

''ہم اس سلسلے میں ضمانت چاہتے ہیں۔''

''جیسی ضمانت چاہیں گی۔ ملے گی۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''لذت جب تک سامنے رہے۔ تب تک للچاتی رہتی ہے۔ اسے چکھ لیا جائے تو پھر اس کی طلب میں پہلے جیسی شدت نہیں رہتی۔ آپ ہمیں سہاگ کی پہلی رات تک ایسی ہی رہنے دیں۔ جیسی ماں کے پیٹ سے جنم لینے کے بعد اب

تک ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔"تاریکی ہے۔تنہائی ہے اور ایسے میں قیامت سے بھرپور ایک سانس لیتا ہوا بدن ہے اور آپ ہیں کہ ہمیں آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں۔"

"اگر طلب سچی ہو۔صرف ہوس نہ ہو تو سچے عاشق ہر آزمائش سے گزر جاتے ہیں۔"

وہ ذرا دیر چپ رہا۔پھر اس نے وہاں سے پلٹ کر ذرا دور ہو کر اسے دیکھا۔ستاروں کی مدھم روشنی میں وہ قیامت خیز بدن پکار رہا تھا۔وہ کہہ رہی تھی۔"آپ بااختیار ہیں۔جس چیز کو چھولیں۔وہ آپ کی ہو جاتی ہے۔آپ ہم پر جبر کر سکتے ہیں۔لیکن محبت اور لگن سچی ہے تو صبر بھی کر سکتے ہیں۔ہمیں فخر حاصل ہوگا کہ مستقبل کے شہنشاہ نے اپنے ہماری بات رکھی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر قریب آگیا۔پتہ نہیں کیا ارادے تھے؟ ارجمند بانو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔اس نے کہا۔"ہم آپ کی محبت ہی نہیں۔اعتماد بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔بے شک۔آپ کو یہ فخر حاصل ہونا چاہئے کہ ہم نے آپ کو کھلونا نہیں سمجھا ہے۔آپ ٹوٹنے والی نہیں۔جوڑنے والی ہستی ہیں۔تمام عمر ہمارے ساتھ ایسے ہی رہیں گی۔جیسے یہ سانسیں ساتھ رہتی ہیں۔جب سانس چھوٹے گی' تب ہی آپ کا ساتھ چھوٹے گا۔"

ارجمند بانو نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے کہا۔"خدا نہ کرے کہ آپ کی سانس چھوٹے۔ہماری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔"

شہزادے نے اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔"آج کی رات آپ نہ سہی۔یہ ہاتھ تو ہمارا ہو سکتا ہے۔"

ارجمند بانو نے سر جھکا لیا۔شہزادہ بولنے لگا اور اس ہاتھ سے کھیلنے لگا۔دوسرے لفظوں میں بہلنے لگا۔اس رات اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ارجمند بانو کے سلسلے میں ہوس پرست نہیں ہے۔وہ اسے صرف محبت ہی نہیں عزت بھی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دور سے مشعلوں کی روشنی آتی ہوئی دکھائی دی۔ارجمند بانو نے کہا۔"ہماری مادر پریشان ہوں گی کہ اتنی دیر کہاں لگا دی؟ ہمیں جانا چاہئے۔"

روشنی قریب آرہی تھی۔کچھ زیادہ کہنے سننے کا موقع نہیں تھا۔شہزادہ الوداع کہہ کر

ہاں سے چلا گیا۔ذرا دور تاریکی میں چھپ کر ارجمند بانو کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔وہ پاروں اُردہ بیگنیاں مشعلیں لے کر آگئی تھیں اور اسے اپنے ساتھ لے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ پہلی ملاقات بہت ہی مختصر سی رہی۔اس کے بعد پھر دوسری تیسری ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔معشوق کی جدائی نے اسے اس قدر انمول بنا دیا تھا کہ وہ اسے حاصل کرنے کی لگن میں مصروف ہو گیا۔اس نے اپنی والدہ بلقیس مکانی سے استدعاء کی کہ وہ اسے اپنی بہو بنائے۔پھر اس رشتے کی بات اس نے اپنے والد شہنشاہ جہانگیر تک بھی پہنچائی اور اب محبت کا یہ مقدمہ جہانگیر کی عدالت میں پیش تھا اور شہزادہ اپنے حق میں فیصلہ سننے کے لئے بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

وہ جھروکے کے پاس بیٹھا دور تک دیکھ رہا تھا۔اور دور تک ارجمند بانو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ایسے ہی وقت خیالات سے چونک گیا۔اس نے سر گھما کر دیکھا۔ارجمند بانو کے باپ آصف جاہ نے پیچھے سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔"آپ کسی تمہید کے بغیر فوراً ہی ایک لفظ میں بابا جانی کا فیصلہ سنائیں۔ہاں یا نہ....؟"

آصف جاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔"ہاں۔مگر....؟"

وہ خوش ہو کر بولا۔"فیصلہ ہمارے حق میں ہو چکا ہے۔ہم کسی اگر مگر کی پرواہ نہیں کریں گے۔اس خوشی کے موقع پر آپ کو بھی پریشان نہیں ہونا چاہئے۔"

وہ بولا۔"ہم اُمورِ سلطنت کو ایک طویل عرصے سے دیکھتے آرہے ہیں۔یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور ہماری ہمشیرہ کے ہاتھوں میں ہے۔جہاں پناہ کا یہ فیصلہ ان کے مزاج اور ان کے ناپاک عزائم کے خلاف ہے۔آج کے بعد وہ ہم سے اور آپ سے مخالفتوں اور عداوتوں کی انتہا کر دیں گی۔"

"وہ زیادہ سے زیادہ کیا کریں گی؟"

"سب سے پہلے تو وہ ہمیں اہم اختیارات سے محروم کر دیں گی۔اس کے بعد شہزادہ شہریار کو آپ کی جگہ تخت و تاج کا جانشین بنانے کے سلسلے میں ایسی چالیں چلیں گی'

جن کے متعلق نہ ہم ابھی کچھ سوچ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔"

شہزادہ خرم نے پریشان ہو کر کہا۔" نہ جانے بابا جانی کو کیا ہو گیا ہے؟ ہمیشہ نشے میں ڈوبے رہتے ہیں۔ مادر ملکہ کی چالوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ خدا کا شکر ہے' ان حالات میں بھی انہوں نے آپ کی صاحبزادی کو ہم سے منسوب کرنے کا فیصلہ سنایا ہے۔"

آصف جاہ نے کہا۔" جہاں پناہ نے بہت مجبور ہو کر آپ کے حق میں فیصلہ سنایا ہے۔ ہمیں آج ہی پتہ چلا کہ آپ کے بابا جانی نے آپ کی والدہ بلقیس مکانی کو زبان دی تھی کہ وہ ان کی کوئی بھی تین خواہشیں پوری کریں گے۔ انہوں نے آپ کی والدہ کی پہلی خواہش یہ پوری کی کہ آپ کو تخت و تاج کا جانشین قرار دیا اور آج ان کی یہ دوسری خواہش پوری کر رہے ہیں کہ وہ ہماری بیٹی کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ جہاں پناہ بے شک عظیم ہیں۔ وہ ہماری ہمشیرہ کی ناراضی مول لے رہے ہیں۔ لیکن اپنی زبان سے نہیں پھر رہے ہیں۔"

شہزادے نے کہا۔" خدا نے چاہا تو بابا جانی تخت نشینی کے سلسلے میں بھی زبان سے نہیں پھریں گے۔ شہزادہ شہریار کو جانشین بنانے کی سازشیں ناکام ہو جائیں گی۔"

آصف جاہ نے کہا۔" ہم ایک بزرگ کی حیثیت سے مشورہ دیتے ہیں' آپ کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ حکومتی معاملات میں کسی وقت بھی حالات اچانک بدل جاتے ہیں۔ ہماری ہمشیرہ نے غضب کا شیطانی دماغ پایا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس وقت کیا کر گزریں؟ جہاں پناہ نے بے شک آپ کے حق میں فیصلہ سنایا ہے لیکن وہ ہمشیرہ کے سلسلے میں بہت پریشان ہیں۔"

" پریشانی کیا ہے؟"

" یہ تو سب ہی جانتے ہیں' وہ ہمشیرہ کے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ جبکہ وہ ناراض ہو گئی ہیں۔ جہاں پناہ نے آپ کے حق میں فیصلہ سناتے وقت یہ صاف طور پر کہا ہے کہ جب تک ملکہ اُن سے راضی نہیں ہوں گی۔ تب تک وہ آپ کی اور ارجمند بانو کی شادی کی تاریخ مقرر نہیں کریں گے۔"

شہزادے نے پریشان ہو کر کہا۔" یا خدا! یہ نئی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں محترمہ کب راضی ہوں گی؟ اس شادی کو روکنے کے لئے تو شائد کبھی راضی نہ ہوں۔"

آصف جاہ نے کہا۔" ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ ہمشیرہ بہت چالاک ہیں۔ زیادہ دن ناراض رہ کر اور جہاں پناہ سے دور رہ کر اپنا نقصان نہیں کریں گی۔ جلد ہی راضی ہو کر ہمارے خلاف محاذ آرائی شروع کر دیں گی۔"

وہ انتظار کرنے لگے کہ ملکہ نور جہاں کب راضی ہو گی اور کب شادی کے فیصلے پر عمل کیا جائے گا؟ نور جہاں جانتی تھی' بادشاہ جہانگیر اپنی زبان ہار چکا ہے۔ بلقیس مکانی سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ لہٰذا اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ جہانگیر نے اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ ناراض ہو کر اس فیصلے پر عمل درآمد کے سلسلے میں رکاوٹیں پیدا کر دے گی۔ یہ خوب جانتی تھی کہ جہانگیر کبھی اسے ناراض نہیں ہونے دیتا۔ فوراً ہی منا لیتا ہے۔ اس بار بھی یہی ہو گا۔

اب یہی ہو رہا تھا۔ نور جہاں اپنی خوابگاہ سے باہر آ رہی تھی اور نہ ہی اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بے چین ہو گیا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا۔ بے چینی یہ تھی کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اور پریشانی یہ تھی کہ اُمور سلطنت کے معاملات میں بہت سے مشورے لینے ضروری ہوتے تھے۔ نور جہاں اس سے زیادہ حکومتی سیاق و سباق اور گہرے معاملات کو دور تک سمجھتی تھی اور بڑی دور اندیشی سے فیصلے کرتی تھی۔

فی الحال یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ جہانگیر نے ایک دن اور ایک رات اس کا انتظار کیا۔ پھر دوسرے دن خود ہی چل کر اس کی خوابگاہ میں آ گیا۔ وہ فوراً ہی پردے کے پیچھے چلی گئی۔ اس نے کہا۔" ملکہ...! ایسی بھی کیا ناراضی ہے کہ ہم سے منہ چھپا رہی ہو؟"

اس نے کہا۔" شرمندہ ہونے اور منہ چھپانے کا کام آپ نے کیا ہے۔ ہمارے بھائی کی بیٹی کا رشتہ قبول کر کے ہماری انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ وہ اب تک ہم سے کمتر تھا۔ لیکن اس کا رشتہ قبول کر کے آپ نے اسے ہمارے برابر لا کھڑا کیا ہے۔"

" ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آصف جاہ کبھی آپ کی برابری نہیں کر سکے گا۔"

" آج نہیں کرے گا۔ آپ کی زندگی میں نہیں کرے گا۔ لیکن جب شہزادہ خرم تخت نشین ہو گا تو وہ اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی پشت پر رہ کر ہمارے زوال کا سبب بنے گا۔ ہم سے تمام اختیارات چھین لے گا۔"

"ہم زبان دے چکے ہیں۔ شہزادہ خرم کو ایک دن تاج وتخت سنبھالنا ہے۔ ہم نہیں جانتے' اس کے بعد وہ کیا کرے گا؟ فی الوقت آپ پورے ہندوستان کی ملکہ ہیں۔ ہمارے بعد جس علاقے کی حکمران بن کر رہنا چاہیں گی' ہم وہ علاقہ آپ کے نام کر دیں گے۔ یہ وصیت کریں گے کہ وہاں سے آپ کو کبھی دستبردار نہ کیا جائے۔"

"آپ بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔ یہ بھول رہے ہیں کہ ہر آنے والا نیا بادشاہ اپنی من مانی کرتا ہے اور پچھلے بادشاہ کے فرمان کو رَد کر دیتا ہے۔"

"ہم نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے والد مرحوم کی کبھی نافرمانی نہیں کی ہے۔"

"آپ نے کی ہے۔ آپ کے مرحوم بابا جانی نے ہمیں آپ سے چھین کر شیر افگن کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد ہماری واپسی کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ لیکن آپ نے تخت پر بیٹھتے ہی پچھلے بادشاہ کی نافرمانی کی۔ شیر افگن کو قتل کرا دیا اور یوں ہمیں حاصل کر لیا۔ بادشاہ وقت جو چاہتا ہے' وہی ہوتا ہے۔ پچھلے بادشاہ کی کوئی وصیت اور نصیحت کام نہیں آتی۔"

"چلیں۔ مان لیتے ہیں کہ ہم سے ایک غلطی ہوگئی اور وہ بھی بہ حالتِ مجبوری.....کیونکہ ہم بلقیس مکانی کو زبان دے چکے تھے۔ اس کے حق میں فیصلہ کرنا لازمی ہو گیا تھا۔ اب آپ بتائیں کہ ہم نے جو کچھ کیا اس کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے؟ ہم کس طرح آپ کو منا سکتے ہیں؟"

وہ خود جہانگیر سے زیادہ عرصے تک دور رہنا نہیں چاہتی تھی۔ آئندہ اسے شہزادہ خرم اور آصف جاہ کے خلاف بہت کچھ کرنا تھا اور وہ جہانگیر سے راضی ہو کر ہی ایسا کر سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں اسے اپنے آگے جھکاتی آئی تھی۔ اس بار بھی اسے جھکانے کے بعد راضی ہونا چاہتی تھی۔

اس نے کہا۔ "آپ نے ہماری انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ ہمارے وقار کو مجروح کیا ہے۔ ہم آسانی سے راضی نہیں ہوں گے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم مان جائیں تو آپ کو ہمارے قدموں میں سر رکھ کر منانا ہوگا۔"

جہانگیر نے چونک کر پردے کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ "کیا آپ سمجھ رہی ہیں کہ

ایک بادشاہ وقت کی شان میں کیسی توہین آمیز گفتگو کر رہی ہیں؟"

"آپ کو بھی یہ سمجھنا چاہئے' ہماری حیثیت معمولی نہیں ہے۔ ہم بادشاہ وقت کی ملکہ نور جہاں ہیں۔ اگر بادشاہ نے ہمارے سامنے سر نہ جھکایا تو رعایا کیا جھکائے گی؟ کون ہمیں مانے گا؟ بس ہم نے کہہ دیا۔ ہمیں منانے کا یہی ایک راستہ ہے۔ جب بھی آکر ہمارے قدموں میں سر رکھیں گے۔ ہم سب کچھ بھول کر آپ سے راضی ہو جائیں گے۔"

ان لمحات میں جہانگیر کو اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ نور جہاں نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ وہ غصے سے تلملاتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ ایک مرد اور وہ بھی ہندوستان کا شہنشاہ ایک عورت کے قدموں میں سر جھکائے۔ یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا تھا۔

وہ اپنی خوابگاہ میں آکر غصے سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ "یہ ہماری غلطی ہے' ہم نے ملکہ کو بہت سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ نہ ہی انہیں راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔ انہیں ضرورت ہو گی تو وہ خود ہی چل کر ہمارے پاس آئیں گی۔"

بے شک وہ نور جہاں کے لئے ضروری تھا۔ لیکن وہ بھی اس کے لئے بہت ضروری بن چکی تھی۔ دن رات اس کے قریب رہ کر صرف محبت اور نشے سے ہی نہیں بہلاتی تھی۔ بلکہ حکومتی اُمور پر بھی ایسی دانشمندانہ گفتگو کرتی تھی اور ایسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرتی تھی کہ جہانگیر اس کی دور اندیشی کا قائل ہوتا رہتا تھا۔ ایک طرح سے اب وہ اس کا عادی ہو چکا تھا۔

اس نے پہلی بار نور جہاں کے بغیر ایک رات اور دو دن گزارے۔ دوسرے دن اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس نے اسے بھلا دینے کے لئے' اپنے دل و دماغ سے نکال دینے کے لئے اس رات خوب پی اور مدہوش ہو کر گہری نیند میں ڈوب گیا۔ اس کی یہ کمزوری بتا رہی تھی کہ وہ نور جہاں کے بغیر نہیں رہ پائے گا۔

دوسرے روز سورج سر پر آ گیا۔ تب اس کی آنکھ کھلی۔ وزیر نے حاضر ہو کر چند شاہی فرمان اس کے سامنے پیش کئے۔ وہ فرمان نور جہاں کی طرف سے جاری کئے گئے تھے۔ ہمیشہ یہی ہوتا آیا تھا' وہ فرمان جاری کرتی تھی اور اس پر جہانگیر اپنی مہر لگاتا تھا۔ اس

طرح وہ شہنشاہ ہندوستان نورالدین محمد جہانگیر کا فرمان کہلاتا تھا۔

جہانگیر نے اس وزیر کے پیش کیے ہوئے فرمان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر انہیں پڑھ کر دل ہی دل میں نور جہاں کی ذہانت اور حکمت عملی سے متاثر ہوتا رہا۔ اس نے کتنے ہی پیچیدہ معاملات کو بڑی دانشمندی سے نمٹایا تھا اور دکن کے ایک علاقے سے ابھرنے والی بغاوت کو کچلنے کے لئے خاطر خواہ انتظامات کیے تھے۔

جہانگیر نے ان تمام فرمانوں پر اپنے نام کی مہر ثبت کر دی۔ وزیر کے جانے کے بعد نور جہاں کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ وہ اس کے بغیر خود کو خالی خالی اور کھوکھلا سا محسوس کرنے لگا۔ اس کے آگے دستر خوان چنا گیا۔ وہ کھانے سے انکار کرنا چاہتا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ تمام کھانا نور جہاں کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اس نے خوش ہو کر پیغام بھیجا کہ ملکہ کو اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا چاہئے۔ لیکن ملکہ نے انکار کر دیا۔

اس نے یہ سوچ کر تنہا کھا لیا کہ وہ کسی حد تک راضی ہو رہی ہے۔ آئندہ اپنے منفی ارادے میں لچک پیدا کرے گی اور اس کے پاس چلی آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسری رات بھی اس کے بغیر گزر گئی۔ وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔ پریشان ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کرے؟

محل کی بیگمات اپنی سوکنوں کے بارے میں سن گن لیتی رہتی ہیں۔ شہزادہ خرم کی ماں بلقیس مکانی نے نور جہاں کی ایک خاص خادمہ کو خرید رکھا تھا۔ وہ اس کے لئے جاسوسی کرتی تھی اور وہاں کی ہر بات بلقیس مکانی تک پہنچاتی رہتی تھی۔

اس نے بتایا تھا کہ ملکہ نور جہاں نے بادشاہ سلامت سے راضی ہونے کے لئے بہت کڑی شرط رکھی ہے۔ وہ جہانگیر کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتی ہے اور وہ ایک مرد ہو کر اس کے آگے جھکنے سے انکار کر رہا ہے۔

بلقیس نے جہانگیر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ اس کی طرف سے جواب ملا کہ وہ کسی سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا۔ بالکل تنہائی چاہتا ہے۔ پھر بلقیس مکانی نے پیغام بھیجا۔ ''ہم نور جہاں سے اپنے مجازی خدا کی صلح کرا سکتے ہیں۔''

یہ پیغام ملتے ہی جہانگیر نے اسے فوراً طلب کیا۔ اس نے حاضر ہو کر

کہا۔ ''ہمارے مجازی خدا کا اقبال بلند رہے اور تمام پریشانیاں دور ہو جائیں۔''

جہانگیر نے کہا۔ ''یہ پریشانیاں آپ ہی کی وجہ سے ہیں۔ ہم نے آپ کے حق میں فیصلہ سنا کر ملکہ کو ناراض کر لیا ہے۔ آپ جانتی ہیں بلکہ سب ہی جانتے ہیں' امور سلطنت میں ملکہ کے مشورے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ہم ان کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔''

وہ بولی۔ ''یہ سن کر افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی رگوں میں چنگیزی خون دوڑ رہا ہے۔ چنگیزی خون کسی مرد سے شکست کھانا گوارہ نہیں کرتا کجا یہ کہ آپ ایک عورت سے ہار مان رہے ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''ہمیں چنگیزی خون کا حوالہ نہ دیں۔ خواہ مخواہ ہماری غیرت کو نہ للکاریں۔ آپ نے ہمیں پیغام بھیجا تھا' نور جہاں سے ہماری صلح کرا سکتی ہیں۔ ہمیں بتائیں' یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''یہ عورتوں کی فطرت ہوتی ہے' جب مرد سے ناراض ہوتی ہیں تو ان سے راضی ہونے کے لئے اپنی کوئی نہ کوئی شرط منواتی ہیں۔ ملکہ نے بھی کوئی شرط منوائی ہوگی۔ آپ ہمیں بتائیں' وہ چاہتی کیا ہیں؟''

بلقیس مکانی اندر کی بات جانتی تھی۔ پھر بھی انجان بن کر پوچھ رہی تھی۔ جہانگیر نے کہا۔ ''ملکہ بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہیں۔ انہوں نے راضی ہونے کے لئے بہت ہی توہین آمیز شرط رکھی ہے۔''

''سر پر تو آپ ہی نے چڑھایا ہے۔ انہیں آپ ہی اتار سکیں گے۔ فی الحال یہ تو معلوم ہو کہ شرط کیا ہے؟ ہمیں معلوم ہوگا تو ہم صلح کا کوئی راستہ ضرور نکال لیں گے۔''

اس نے بلقیس مکانی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر جھجکتے ہوئے کہا۔ ''وہ چاہتی ہیں کہ ہم انہیں منانے کے لئے ان کے قدموں میں سر رکھیں۔''

بلقیس مکانی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''توبہ توبہ۔ یہ تو غرور کی انتہا ہے کہ وہ اپنے مجازی خدا کو اور بادشاہ وقت کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتی ہیں۔''

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''زیادہ نہ بولیں۔ اگر صلح کی کوئی تدبیر بتا سکتی ہیں تو بتائیں۔''

ورنہ چلی جائیں۔"

"کیسے چلے جائیں؟ آپ نے ہمارے حق میں فیصلہ سنا کر ملکہ کو ناراض کیا ہے۔اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہی آپ دونوں کی صلح کرائیں۔ہمیں اک ذرا سوچنے کی مہلت دیں۔تب تک آپ کچھ کھانے پینے سے شغل کریں۔آپ کو بھوکا نہیں رہنا چاہئے۔"

"جب تک ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ہم کچھ نہیں کھائیں گے۔"

وہ جہانگیر کی پریشانیوں کو اور بے چینی کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اور تدبیر بھی سوچ کر آئی تھی۔لیکن یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ سوچی سمجھی تدبیر کے ساتھ وہاں آئی ہے۔

اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔"ہاں۔ایک تدبیر سوجھ رہی ہے۔اگر آپ اس پر عمل کریں گے تو یقیناً کامیابی حاصل ہوگی اور وہ آپ سے راضی ہو جائیں گی۔"

پھر اس نے وہ تدبیر بتائی۔جہانگیر نے سنتے ہی خوش ہو کر کہا۔"یہ تو بڑی آسان سی تدبیر ہے۔تعجب ہے ہمارے ذہن میں کیوں نہ آئی؟ بخدا آپ ملکہ نور جہاں سے ذہانت میں کسی طرح کم نہیں ہیں۔ہم آج ہی آپ کا یہ نسخہ آزمائیں گے۔"

اسی روز سہ پہر کو نور جہاں باغ میں ٹہلنے کے لئے آئی۔جہانگیر بھی وہاں پہنچ گیا۔اس سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا۔اس نے اسے دیکھتے ہی ناراض ہونے کے انداز میں منہ پھیر لیا۔جہانگیر نے کہا۔"ناراض کیوں ہوتی ہیں؟ ہم نے آپ کی بات مان لی ہے۔آپ یہی چاہتی ہیں ناں کہ بادشاہ وقت آپ کے قدموں میں سر رکھے؟"

وہ بدستور منہ پھیرے کھڑی تھی۔اس نے کہا۔"ہاں۔ہم یہی چاہتے ہیں۔"

"تو پھر سر جھکا کر دیکھیں۔ہم نے آپ کے قدموں پر سر رکھ دیا ہے۔"

اس نے سر جھکا کر دیکھا۔سہ پہر کی دھوپ میں جہانگیر کا سایہ طویل ہو کر اس کے پیروں تک آ گیا تھا اور سر اس کے قدموں میں نظر آ رہا تھا۔نور جہاں نے حیرانی سے دیکھا اور سوچا" یہ کیسی منطق ہے کہ قدموں میں سر بھی نہیں رکھا اور سر یہاں نظر بھی آ رہا ہے؟

وہ اس بات پر اعتراض کر سکتی تھی۔لیکن خود بھی جلد سے جلد صلح کر لینا چاہتی تھی۔بادشاہ سے دیر تک ناراض رہ کر کسی بھی طرح کے نقصان میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ویسے وہ سایہ ہی سہی۔لیکن بادشاہ کا سر قدموں میں آ گیا تھا۔وہ مسکراتی ہوئی فوراً ہی اس کے قریب آ کر

قدموں میں جھکتے ہوئے بولی۔"آپ نے ہمیں بہت سر چڑھایا ہے۔ہم مغرور ہو گئے تھے۔آئندہ ایسے تکبر کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ہمیں معاف فرمائیں۔"

اس نے اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اٹھایا۔جہانگیر کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کی نور جہاں اس سے راضی ہو گئی تھی۔وہ دونوں گلے مل گئے۔پھر کسی کو کسی سے کوئی گلہ نہ رہا۔

شہزادہ خرم کی بن آئی۔انتظار کے دن ختم ہو گئے۔چند ماہ بعد ہی ارجمند بانو اس کی دلہن بن کر آ گئی۔کئی دنوں تک شادی کا جشن منایا گیا۔نور جہاں بھی بظاہر ان کی خوشیوں میں شریک ہوتی رہی۔لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت کی بساط پر شطرنجی چالیں چلنے لگی۔

اس کے بھائی آصف جاہ نے شہزادہ خرم کو اپنا داماد بنایا تو اس نے شہزادہ شہریار کو اپنا داماد بنا لیا۔وہ دونوں بہن بھائی شطرنج کی بساط پر اپنے اپنے داماد کو ایک دوسرے کے مقابل لے آئے۔اگرچہ یہ طے تھا کہ جہانگیر اپنی زبان سے نہیں پھرے گا۔شہزادہ خرم ہی تاج وتخت کا وارث ہوگا۔لیکن نور جہاں سے کچھ بعید نہیں تھی۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسی چالیں چلے گی اور کس طرح شہزادہ خرم کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے ہی اس کا تختہ کر دے گی؟

شہزادہ خرم ان دنوں ارجمند بانو کے ساتھ لاہور میں تھا اور وہاں کے اُمور سلطنت پر توجہ دے رہا تھا۔ادھر نور جہاں نے جہانگیر کے اطراف سخت پہرہ بٹھا دیا تھا۔محل کی بیگمات ہوں یا کنیزیں ہوں۔کوئی اس کی اجازت کے بغیر بادشاہ کے قریب سے گزر بھی نہیں سکتی تھیں۔اس نے بادشاہ کے وزیر کو اپنی مٹھی میں رکھا تھا۔باہر کے معاملات کو پہلے خود سمجھتی تھی۔پھر فیصلہ کرتی تھی کہ کس اہم فرد کو جہانگیر سے ملنا چاہئے اور کسے بادشاہ کے سائے تک بھی نہیں پہنچنا چاہئے۔

اس نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعہ جہانگیر تک یہ خبر پہنچائی کہ شہزادہ خرم نے شہریار کی جاگیروں پر فوج کشی کی ہے۔شہریار کے بے شمار سپاہی مارے گئے ہیں اور شہزادہ خرم کا لشکر وہاں سے اناج کا ذخیرہ اٹھا کر لے گیا ہے۔کتنی ہی حسین اور کنواری لڑکیوں کو بھی اغوا کیا گیا ہے۔

جہانگیر یہ سنتے ہی طیش میں آ گیا۔جگت گوسائیں عرف بلقیس مکانی نے کہا۔"یہ

ہمارے بیٹے شہزادہ خرم پر سراسر الزام ہے۔ وہ ایسا عاقبت نا اندیش نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اپنے بھائی کو اور اس کی جاگیروں کو نقصان پہنچائے گا۔ ہم اپنے مجازی خدا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ خود شہریار کی جاگیروں میں جا کر حقیقت معلوم کریں۔"

برسات کا موسم تھا۔ کئی کئی دنوں تک بارش کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ جہانگیر نے کہا۔ "ہم ایسے موسم میں وہاں تک نہیں جائیں گے۔ دونوں شہزادوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فوراً ہمارے حضور پیش ہو جائیں۔"

ان دنوں شہریار اپنی جاگیر میں نہیں تھا۔ وہیں دہلی میں نور جہاں کے زیر سایہ تھا۔ یہ بات جہانگیر کو معلوم نہیں تھی۔ اس نے تیسرے ہی دن جہانگیر کے سامنے پیش ہو کر کہا۔ "بابا جانی کا اقبال بلند ہو۔ ہم آپ کا حکم سنتے ہی اس موسلا دھار بارش میں پچاس کوس کا فاصلہ طے کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے شہزادہ خرم کا قاصد ایک تحریری پیغام لایا۔ خرم نے لکھا تھا۔ "بابا جانی کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہاں موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ دریا طغیانی پر ہے۔ اسے عبور کرنا ممکن نہیں ہے۔ جیسے ہی بارش کا زور کم ہوگا اور دریا اترے گا۔ ہم فوراً ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔"

نور جہاں نے جہانگیر کو بھڑکایا۔ "ہمارے داماد شہریار نے موسلا دھار بارش میں پچاس کوس کا فاصلہ طے کر کے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ خرم کیوں بہانے کر رہا ہے؟ کیوں حکم عدولی کر رہا ہے؟ اس نے شہریار کی جاگیر پر جو مظالم ڈھائے ہیں۔ اس کا انجام سمجھ رہا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ آپ نے اسے محاسبہ کے لئے یہاں طلب کیا ہے۔ اس لئے وہ حاضر ہونے سے کترا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکم عدولی کر کے باغیانہ روش اختیار کر رہا ہے۔"

ملکہ آگ لگاتی تھی' وہ بھڑک جاتا تھا۔ ملکہ اسے بجھاتی تھی' وہ فوراً ہی بجھ جاتا تھا۔ اس نے غصے سے بھڑک کر کہا۔ "وہ نافرمان سزا کا مستحق ہے۔ ہم نے اسے شاہجہاں کا خطاب دیا تھا۔ فی الحال اس خطاب کو مسترد کیا جاتا ہے۔ جب تک اس کی طرف سے صفائی پیش نہیں کی جائے گی' تب تک اسے 'بے دولت' کا نام دیا جاتا ہے۔ آئندہ اسے شہزادہ' ولی

عہد یا شاہجہاں نہیں... بلکہ بے دولت کہا جائے۔"

بلقیس مکانی نے کہا۔ "آپ ناحق اپنے فرمانبردار بیٹے سے بدگمان ہو رہے ہیں۔ اس پہلو پر غور فرمائیں کہ شہزادہ شہریار کے راستے میں کوئی دریا نہیں آتا ہے۔ جبکہ ہمارے بیٹے کی راہ میں دریا ہے اور اسے بھری برسات میں عبور کرنا ممکن نہیں ہے۔"

نور جہاں نے کہا۔ "اب سے پہلے بھی اُس بے دولت نے دریا عبور کئے ہیں۔ بھری برسات میں باغیوں سے جنگیں لڑی ہیں۔ کیا وہ جنگجو اور فاتح کہلانے والا ایسے موسم سے لڑتا ہوا اپنے بابا جانی کے سامنے حاضر نہیں ہو سکتا تھا؟"

بلقیس مکانی نے کہا۔ "اس سلسلے میں بحث کرنا فضول ہے۔ ہم ثابت کریں گے کہ ہمارے بیٹے نے باپ کے خلاف باغیانہ روش اختیار نہیں کی ہے۔"

وہ وہاں سے اپنی خوابگاہ میں چلی آئی۔ وہاں آصف جاہ کو طلب کیا اور کہا۔ "آپ کی ہمشیرہ ہمارے بیٹے اور آپ کے داماد کو باغی ثابت کرنے پر تُل گئی ہیں۔ آپ فوراً ہی خرم سے رابطہ کریں اور اسے مشورہ دیں کہ وہ جلد سے جلد بادشاہ کے سامنے حاضر ہو جائے یا اپنے کسی وکیل کے ذریعہ اپنی طرف سے صفائی پیش کرے اور اپنے باپ کا دل صاف کرے۔"

آصف جاہ نے ایک قاصد کے ذریعہ اپنے داماد کو یہ تحریری پیغام بھیجا۔ "شہزادہ خرم کا اقبال بلند رہے۔ ہماری ہمشیرہ آپ پر بڑے غضب کے حملے کر چکی ہیں۔ آپ پر جھوٹے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے غصے میں آ کر آپ کو بے دولت کا نام دیا ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو۔ اپنی طرف سے پوری طرح صفائی پیش کریں اور یہ ثابت کریں کہ آپ نے شہزادہ شہریار کی جاگیروں پر حملہ نہیں کیا ہے۔ انہیں کسی بھی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا ہے۔"

شہزادہ خرم کا وکیل میر عبدالسلام عرف اسلام خان شہزادہ شہریار کی جاگیروں سے ہو کر آیا تھا اور اس بات کا چشم دید گواہ تھا کہ وہاں خرم کے لشکر نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ ہی کوئی چھوٹی سی بھی واردات کی ہے۔ وہ شہزادے کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے لئے محل کے دروازے پر آیا تو نور جہاں نے اسے محل کے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں

دی۔اس نے زنجیر عدل کا بھی سلسلہ ختم کر دیا تھا۔جہانگیر خود نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی ملکہ کے نادیدہ قید خانے میں قید ہو گیا ہے۔باہر سے نہ کوئی اس کا مخلص اور وفادار آ کر اس سے مل سکتا ہے اور نہ ہی کوئی فریادی زنجیر عدل کے ذریعہ فریاد کر سکتا ہے۔

شہزادہ خرم کے ستارے گردش میں آ گئے تھے۔اس کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہوئی تھی کہ اس کی والدہ بلقیس مکانی کا انتقال ہو گیا۔وہ ماں ایک مضبوط قلعہ کی طرح تھی۔جس کے سائے میں وہ محفوظ تھا اور اس کے ذریعہ اپنے بابا جانی تک پہنچ سکتا تھا۔اب تو نور جہاں اسے بھی شرف باریابی کا موقع نہیں دینے والی تھی۔

علامی افضل خان بادشاہ جہانگیر کا معتمدِ خاص تھا اور شہزادہ خرم کا حمایتی بھی تھا۔شہزادے نے اسے پیغام بھیجا۔"حضرت! آپ بزرگ ہیں۔ہماری نیک نیتی کو خوب سمجھتے ہیں۔بابا جانی کے سامنے آپ ہی ہماری طرف سے صفائی پیش کر سکتے ہیں۔"

علامی افضل خان نے جواباً لکھ بھیجا۔"یہاں کے حالات آپ کی توقع سے بھی زیادہ ناموافق ہیں۔اگرچہ ہم بادشاہ سلامت کے معتمد خاص ہیں۔لیکن ہمیں بھی ان سے براہ راست ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔محل کے باہر سے ہی ہم سے سوال جواب کئے جاتے ہیں۔پوچھا جاتا ہے کہ کس لئے ملنا چاہتے ہیں؟ کیا مقاصد ہیں؟ کیا معاملات ہیں؟ کیا مسائل ہیں؟ اور وہ سب کچھ سن کر ہمیں رخصت کر دیتی ہیں۔وعدہ کرتی ہیں کہ ہمارے معاملات اور مسائل بادشاہ سلامت کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔پھر ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟"

اندر ہی اندر یہ ہو رہا تھا کہ جہانگیر کو ہانڈی کی طرح چولہے پر چڑھا دیا گیا تھا اور آہستہ آہستہ شہزادہ خرم کے خلاف پکایا جا رہا تھا۔یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ بارش کا زور کم ہوتے ہی وہ بے دولت اپنے لشکر جرار کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے دہلی کا رخ کرنے والا ہے۔

جہانگیر کے چند خاص ایسے مخبر تھے جو اسے باہر کی اہم خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔وہ ان پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔کیونکہ وہ اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔لیکن نور جہاں نے انہیں بھی خرید لیا تھا۔وہ یہی اطلاع پہنچا رہے تھے کہ بے دولت وقت سے پہلے تخت پر قابض ہو کر بادشاہ سلامت کی زندگی میں ہی پورے ہندوستان کا شہنشاہ بن جانا چاہتا ہے۔

نور جہاں بڑی زبردست چالیں چل رہی تھی۔اس نے بادشاہ کو پوری طرح پنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔طرح طرح سے یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ بے دولت بے شک و شبہ باغی ہو چکا ہے۔بادشاہ سلامت کے خلاف لشکر کشی کرنے والا ہے۔

آخر وہی ہوا جو وہ چاہتی تھی۔جب بارش تھم گئی اور سیلابی دریا اترنے لگا تو شہزادہ خرم اپنے پورے لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔وہ بابا جانی کے سامنے پیش ہو کر اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔لیکن باپ کے دل میں اس کے خلاف اتنا غبار بھر دیا گیا تھا کہ اس نے پورے لشکر کے ساتھ بیٹے کی آمد کو یہی سمجھا کہ وہ فوج کشی کے لئے آ رہا ہے۔

اس نے حکم دیا کہ اسے آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔اگر مقابلے پر آمادہ ہو تو اسے شکست دے کر جنگی قیدی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

نور جہاں پہلے ہی جہانگیری لشکر کو پوری طرح منظم کر چکی تھی۔اس لشکر کا سپہ سالار اور کوک امیر نور جہاں کے وفادار تھے۔جمنا کے کنارے بلوچ پور کے قریب جہانگیر اور شاہجہاں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آ کر رک گئیں۔شہزادے نے اپنے قاصد کے ذریعے کہلا بھیجا کہ وہ مقابلے کی نیت سے نہیں بلکہ بابا جانی کی خدمت میں سر جھکانے آیا ہے۔

لیکن جہانگیری لشکر کے سپہ سالار اور کوکِ امیر نور جہاں کی طرف سے پکے پکائے آئے تھے۔انہوں نے کہا۔"واپس جاؤ۔بادشاہ سلامت کا حکم ہے کہ تم نے مقابلہ کرنے کی جرات کی تو تمہیں پابہ زنجیر قیدی بنا کر ان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

شہزادہ خرم اپنے بابا جانی تک پہنچنے کی بہت کوششیں کر چکا تھا۔اس کے وکیل اور حمایتی بھی اس کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے سلسلے میں ناکام رہے تھے۔اب وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جہانگیری لشکر نے اس پر حملہ کرنے کی پہل کی اور اس طرح جنگ شروع ہو گئی۔

اس لشکر کا ایک ماتحت سپہ سالار عبداللہ خان شہزادہ خرم کا حمایتی تھا۔جنگ شروع ہوتے ہی وہ شہزادے سے آملا۔اس طرح شہزادے کی قوت بڑھ گئی۔اور جہانگیری لشکر کی کمر ٹوٹنے لگی۔ایسے وقت اس کے سپاہی میدان سے بھاگنے کی فکر میں تھے کہ شہزادہ خرم کا

معتمدِ خاص راجہ بکر ماجیت گولی کھا کر گھوڑے سے گرا تو اس کی فوج کے سپاہی مایوس اور پریشان ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بازی اچانک ہی پلٹ گئی۔ شہزادہ خرم بھاگنے والے سپاہیوں کو نہ روک سکا۔ اپنی حفاظت ضروری تھی۔ لہٰذا اسے بھی اپنے دوسرے سرداروں کے ساتھ وہاں سے فرار ہونا پڑا۔

جب جہانگیر تک یہ اطلاع پہنچی کہ شہزادہ خرم جنگ لڑنے کے بعد ہار کر فرار ہو گیا ہے تو اسے پوری طرح یقین ہو گیا کہ ملکہ نور جہاں ہمیشہ سچی اور کھری باتیں کرتی رہی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ بدبخت بے دولت نافرمان اور باغی ہو کر اپنے باپ کے خلاف حملہ کر چکا ہے۔ لہٰذا اسے بخشا نہیں جائے گا۔ کڑی سے کڑی سزائیں دی جائیں گی۔

نور جہاں نے حکم دیا کہ اس بے دولت کو فرار ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ وہ جہاں جائے اس کا تعاقب کیا جائے۔ کسی بھی طرح اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر بادشاہ سلامت کے سامنے پیش کیا جائے۔

شہزادہ خرم برہان پور کی طرف گیا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہاں اس نے پھر سے فوج کو کسی طرح منظم کیا۔ تعاقب کرنے والے لشکر کا مقابلہ کیا۔ لیکن حالات اس کے موافق نہیں تھے۔ وہاں بھی اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ وہاں سے فرار ہو کر قلعہ اسیر میں پہنچا۔ ایسے بدترین حالات میں ارجمند بانو نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے قلعے میں پہنچ کر کہا۔ ”حالات ہمارے موافق نہیں ہیں۔ آپ کب تک ہمارے ساتھ نگر نگر بھٹکنے کی صعوبتیں برداشت کرتی رہیں گی؟“

ارجمند بانو نے کہا۔ ”ہم صرف سکھ میں نہیں دکھ میں بھی آپ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ آپ کو جیسی بھی صعوبتیں پیش آتی رہیں گی‘ اُن میں ہم برابر کے شریک رہیں گے۔ ہم آپ کے ساتھ جنگ نہیں لڑ سکتے۔ لیکن آپ کے زخموں پر مرہم رکھ سکتے ہیں۔ آپ کا سر اپنے زانو پر رکھ کر دو گھڑی آرام سے سلا سکتے ہیں۔“

دونوں ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے اس طرح چاہتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے سے دور رہنا گوارہ نہیں تھا۔ شہزادہ حالات سے مجبور ہو کر کہہ رہا تھا کہ وہ قلعہ اسیر میں محفوظ رہے یا پھر اپنے والد آصف جاہ کے پاس چلی جائے۔ حقیقتاً وہ بھی اس کی جدائی

گوارا نہیں کرتا تھا۔

نور جہاں پورے ہندوستان کا نقشہ اپنے سامنے رکھتی تھی۔ اسے دم بہ دم اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ شہزادہ خرم شکست کھانے کے بعد کس علاقے سے دوسرے کس علاقے کی طرف رخ کر رہا ہے؟ وہ وہاں کے راجاؤں اور ماتحت سلطانوں کو تاکید کرتی تھی کہ کوئی شہزادہ خرم کو مالی اور فوجی امداد نہ دے۔ جو راجہ یا ماتحت سلطان شہزادہ خرم کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں مدد کرے گا۔ اسے مزید جاگیریں عطا کی جائیں گی۔

وہ نامہرباں ملکہ یہ ثابت کر رہی تھی کہ اپنے داماد شہریار کو تخت پر بٹھانے کے لئے کس طرح شہزادہ خرم پر زمین کو تنگ اور آسمان کو نامہربان کر رہی ہے؟

خرم عجب بے سروسامانی کی حالت میں تھا۔ کبھی اپنی حمایت کرنے والے راجاؤں مہاراجاؤں کے ذریعے چھوٹے بڑے لشکر منظم کرتا تھا اور تعاقب کرنے والوں کا مقابلہ کرتا تھا۔ کبھی اسے فتح حاصل ہوتی تھی اور کبھی وہ شکست کھا کر وہاں سے فرار ہو جانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

وہ جہاں جاتا تھا‘ وہاں ملکہ نور جہاں محل میں رہنے کے باوجود موت کی طرح اس کے پیچھے رہتی تھی۔ وہ قلعہ اسیر سے نکل کر نظام الملک کے علاقے تلنگانہ میں داخل ہوا۔ وہاں سے دکن کے علاقے میں کچھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا۔ نظام الملک نے اتحاد اور وفاداری کا سچا مظاہرہ کیا۔ وہاں سے وہ ایک لشکر منظم کر کے مچھلی پٹن سے سمندر کے کنارے دشوار گزار جنگلوں سے گزرتا ہوا اڑیسہ پہنچا۔ وہاں احمد بیگ کٹک نے نور جہاں کے حکم کے مطابق اس کا راستہ روک لیا۔ دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ وہ علاقہ شہزادہ خرم کے لئے سازگار نہیں تھا۔ وہ احمد بیگ کٹک کو شکست دیتا ہوا۔ بنگال جا پہنچا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ مقدر اسے کب تک بھٹکانے والا ہے؟

نور جہاں بے شک پوری فوجی قوتوں کے ساتھ اور اپنے پورے اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے خرم کو نڈھال اور بے بس کر دینا چاہتی تھی۔ اسے قدموں میں آ کر گرنے پر مجبور کرنے والی تھی۔ لیکن ہر شہزور کی کوئی نہ کوئی کمزوری بھی ہوا کرتی ہے۔ اس نے شہزادہ شہریار جیسے ایک کمزور مہرے کو اپنا داماد بنایا تھا۔ جبکہ یہ جانتی تھی کہ شہریار بادشاہ بننے کے

لائق نہیں ہے۔اسے اُمورِ سلطنت سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔لیکن وہ تو جس طرح جہانگیر کو سامنے بٹھا کر اس کے پیچھے حکومت کرتی تھی۔اسی طرح چاہتی تھی کہ شہر یار کو سامنے بٹھا کر اپنی بیٹی کے ساتھ پورے ہندوستان پر حکومت کرتی رہے۔

شہر یار نالائق تو تھا ہی۔بلا کا عیاش بھی تھا۔دن رات شراب و شباب میں ڈوبا رہتا تھا۔اس کی بیوی لاڈلی بیگم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا کرتی تھی۔اسے بھی اپنی ماں کی طرح شہر یار سے صرف اتنی ہی دلچسپی تھی کہ اسے مہرہ بنا کر آگے چلایا جائے اور پیچھے خود حکومت کی جائے۔وہ ماں بیٹی یہ نہیں جانتی تھیں کہ شہر یار کی عیاشی کیا رنگ لائے گی؟

نور جہاں نے ۱۶۲۳ء عیسوی میں شہزادہ خرم پر زمین تنگ کی تھی۔اسے در بدر بھٹکنے اور بھاگنے پر مجبور کرتی رہی تھی۔وہ بد بخت شہزادہ ۱۶۲۷ء تک اپنی سوتیلی ماں کے مسلّط کئے ہوئے عذاب میں مبتلا رہا۔

ان پانچ برسوں میں شہزادہ شہر یار بے انتہا عیاشی کے باعث مرض داء الثعلب میں مبتلا ہو گیا۔اس کے ابروؤں اور داڑھی مونچھوں کے بال گرنے لگے۔آتشک کی وجہ سے سارے بدن پر پھوڑے سے نکل آئے۔اس کا جسم اور چہرہ ایسا ہو گیا تھا کہ وہ خود کو دوسروں سے چھپانے لگا تھا۔

نور جہاں اپنے اہم معاملات میں بری طرح مصروف رہا کرتی تھی۔جب اسے شہر یار کی بیماری کا علم ہوا تو وہ غصے سے بیٹی پر گرجنے برسنے لگی۔''تم نے اسے اتنی ڈھیل کیوں دی تھی؟ جب ہم شہزادہ خرم کو جہنم میں پہنچا دیں گے تو کیا شہر یار کو ایسی صورت و شکل کے ساتھ تخت پر بٹھایا جا سکے گا؟''

لاڈلی بیگم نے کہا۔''ہمیں کیا معلوم تھا' عیاشی کا اتنا بھیانک نتیجہ نکلے گا؟ وہ ہمارا خاوند ہے۔لیکن ہم اس کے سامنے جانے سے کتراتے ہیں۔اسے تو دیکھنے سے ہی گھن آنے لگتی ہے۔''

''اس سے کتراؤ گی تو ہماری تمام تر محنت پر پانی پھر جائے گا۔ہم تمام شاہی اطباء اور حکیموں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ دیگر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر شہر یار پر توجہ دیں اور جلد از جلد اسے تمام بیماریوں سے نجات دلائیں۔جاؤ اور اس پر فوری توجہ دو۔وہ مہرہ کتنا ہی

نا اہل سہی۔ہمارے لئے بہت کار آمد ہے۔''

اب شہزادہ خرم کے حالات کروٹ بدل رہے تھے۔گردش ختم ہونے والی تھی۔جہانگیر کو دن رات نشے میں ڈبوئے رکھنے کا نتیجہ بھی بہت ہی عبرت ناک نکلا۔وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوتا رہتا تھا۔آخر دمے کی بیماری نے اس قدر شدت اختیار کی کہ وہ اپنی آخری سانس تک آ پہنچا۔۸ نومبر ۱۶۲۷ء کو اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

جہانگیر کی موت گویا نور جہاں کی موت تھی۔وہ صاف طور پر اپنی آنکھوں کے سامنے خود کو بلندی سے پستی میں گرتے دیکھ رہی تھی۔اس بات پر جھنجھلا رہی تھی کہ شہر یار کو بیماریوں نے آ دبوچا تھا۔اس کی صورت اور حُلیہ ایسا ہو گیا تھا کہ اسے تخت پر لا کر بٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔یہ اعلان نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شہزادہ خرم چونکہ باغی ہو چکا ہے۔اس لئے شہر یار کو تخت پر بٹھا کر اسے تاج پہنایا جا رہا ہے۔

اب نور جہاں کا یہ خواب پورا ہونے والا نہیں تھا۔اس نے جتنی تدابیر کی تھیں۔وہ تقدیر کے ایک ہی وار سے خاک میں مل گئی تھیں۔جتنی زبردست کامیابیاں حاصل کرتی آ رہی تھی۔وہ سب ناکامیوں اور محرومیوں میں بدل رہی تھیں۔

اس کے سامنے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ فوراً ہی کسی دوسرے شہزادے کو تخت پر بٹھا کر اسے کٹھ پتلی بنا کر شاہی لشکر کو اپنے زیر اثر رکھا جائے۔شہزادہ خرم ادھر کا رخ کرے تو اپنے پاس لشکری قوت موجود رہے اور پوری قوت کے ساتھ اس کا راستہ روکا جا سکے۔

شہزادہ شہر یار دراصل جہانگیر کی کسی بیگم سے نہیں' بلکہ ایک کنیز کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔اسی طرح ایک اور شہزادہ جہاں دار کو بھی ایک کنیز نے جنم دیا تھا۔نور جہاں فی الوقت جہاں دار کو تخت پر بٹھا کر اسے اپنے زیر اثر رکھ سکتی تھی۔

وہ دربار کے ان تمام مشیر حضرات اور امراء کو طلب کرنا چاہتی تھی جو اس کے وفادار اور حمایتی تھے۔ان کی حمایت حاصل کر کے ہی وہ جہاں دار کو تخت پر بٹھا سکتی تھی اس نے ایک خواجہ سرا کو بلا کر حکم دیا۔''ابھی جاؤ۔اور ہمارے تمام خاص مصاحبین سے کہو۔یہاں فوراً حاضر ہو جائیں۔''

خواجہ سرانے سر جھکا کر کہا۔ "ملکہ عالیہ کے برادر نے محل کے باہر سخت پہرہ لگا دیا ہے۔ یہاں اندر سے کوئی باہر نہیں جاسکتا اور باہر سے کوئی اندر نہیں آسکتا۔"

یہ سنتے ہی وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس کے بھائی آصف جاہ نے اپنے داماد شہزادہ خرم کو تخت پر بٹھانے کے لئے بڑی تیزی دکھائی تھی۔ دربار کے تمام امراء اور اپنے تمام حمایتی اور خاص اعلیٰ عہدیداروں کو اپنے اعتماد میں لے کر شاہی لشکر کے سپہ سالار اور تزک امیر کو گرفتار کرلیا تھا اور وہاں اپنا خاص تزک امیر اور ایک انتہائی جنگجو سپاہی کو سپہ سالار بنا کر پورے لشکر کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنالیا تھا۔

یہ تو سب ہی برسوں سے جانتے تھے کہ شہزادہ خرم ولی عہد ہے اور بادشاہ جہانگیر بہت پہلے ہی اسے تخت و تاج کا وارث قرار دے چکا ہے۔ لہٰذا سب ہی نے آصف جاہ کی حمایت کی۔ اس نے دوسرا بڑا کام یہ کیا کہ نور جہاں کو اس محل کی چار دیواری میں محدود کر دیا۔ وہ نہ تو باہر جاسکتی تھی اور نہ ہی کسی کو اندر بلا کر کوئی بات کر سکتی تھی۔

یہ بھی معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ موجودہ حالات میں اس کی بیٹی لاڈلی بیگم اور داماد شہریار کے ساتھ کیسا سلوک کیا جارہا ہے؟ وہ دونوں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟

وہ بدترین حالات میں بھی شکست کھانے والی عورت نہیں تھی۔ لیکن بھائی نے اسے اس طرح بے بس اور مجبور بنا دیا تھا کہ عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ آصف جاہ کے شکنجے سے نکلنے کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہندوستان کی ملکہ دیکھتے ہی دیکھتے بے دست و پا ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کا دل و دماغ موجودہ حالات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا' جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ آنکھ کھلتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ کھانا پینا سب ہی بھول چکی تھی۔ ہائے نور جہاں.... اُفت جہاں کی کیسی بلندی تھی اور کیسی پستی نصیب ہو رہی تھی؟

دوسرے دن آصف جاہ محل میں آیا۔ اس نے بھائی کو دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "رسی جل گئی۔ مگر بل نہیں گئے۔ آپ مرحوم بادشاہ جہانگیر کو اپنا مجازی خدا بنانے کے بعد خدا کو بھول گئی تھیں۔ اپنے اس حقیقی بھائی

کو دشمن بنالیا۔ شہزادہ خرم پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اس بیچارے کو پورے پانچ برسوں تک در بدر بھٹکاتی رہیں۔ یہ بھول گئیں کہ ہر کمال حاصل کرنے والے کو زوال بھی آتا ہے۔"

ایک وقت تھا' جب وہ بولتی تھی اور بھائی سر جھکا کر سنتا تھا۔ آج وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "ہماری بیٹی لاڈلی بیگم کہاں ہیں؟"

"وہ جہاں بھی ہے۔ زندہ سلامت ہے۔ آپ کو تو سب سے پہلے اپنے داماد شہریار کی خیریت معلوم کرنی چاہئے۔ آپ اس کاٹھ کے اُلو کو تخت پر بٹھانے والی تھیں۔"

"اگر تقدیر ہمارا ساتھ دیتی تو وہی کاٹھ کا اُلو تم سب کو اُلو بنا کر رکھ دیتا۔ ہمیں بتاؤ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جارہا ہے؟"

"ہم نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی ہے۔ اسے بصارت سے محروم کر دیا ہے۔ اب وہ ساری دنیا کو تو کیا خود کو بھی دیکھ نہیں سکے گا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ سر کے اور ڈاڑھی مونچھوں کے بال جھڑ گئے تھے۔ ایک عجوبہ دکھائی دیتا تھا۔ آئندہ نہ خود کو دیکھ سکے گا اور نہ ہی خود سے خوفزدہ ہو سکے گا۔"

"کیا ہمیں اس محل میں قیدی بنا کر رکھا جائے گا؟"

"آپ کو تو سزائے موت دینی چاہئے۔ ایک بار نہیں بار بار دینی چاہئے۔ لیکن ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ ہم پر آپ کے بڑے احسانات ہیں۔ ہم نے آپ ہی کی وجہ سے شاہی خاندان میں جگہ بنائی ہے۔ دوستی بھی آپ سے سیکھی ہے اور دشمنی بھی آپ سے سیکھی ہے۔ لہٰذا آپ کو زندہ سلامت رکھا جائے گا۔ آج ہی یہاں سے ہماری رہائش گاہ میں منتقل کیا جائے گا۔ وہاں آپ نظر بند رہا کریں گے۔ اب آپ کی جتنی بھی زندگی رہ گئی ہے' وہ ایک چار دیواری کے اندر گزرے گی۔"

اسے آصف جاہ کی رہائش گاہ میں منتقل کر دیا گیا۔ داماد کو اندھا کر دیا گیا۔ بیٹی کو بھی نظر بند رکھا گیا۔ وہ جہانگیر کی موت کے بعد اٹھارہ برس تک ایک قیدی کی طرح زندگی گزارتی رہی۔ نہ کسی سے ملاقات کر سکتی تھی۔ نہ بات کر سکتی تھی اور نہ ہی تحریر کے ذریعہ کسی کو کوئی پیغام بھیج سکتی تھی۔ کسی طرح کی بھی سازش کرنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے تھے۔

شہزادہ خرم تخت نشین ہونے کے بعد پھر شاہجہاں کہلانے لگا۔ لاہور میں راوی کے کنارے باغ دل کشاں ہے۔ شاہجہاں کے حکم سے جہانگیر کو وہیں دفن کیا گیا تھا۔ آج کل وہ باغ دل کشاں کے بجائے مقبرہ جہانگیر کہلاتا ہے۔

نور جہاں نے درخواست کی کہ اس کا مقبرہ بھی اسی جگہ بنوایا جائے۔شاہجہاں نے اس کی درخواست قبول کی۔تین لاکھ روپے کی لاگت سے چار سال کی مدت میں ایک شایانِ شان مقبرہ بنوایا۔جب وہ وفات پا گئی تو اسے وہیں دفن کیا گیا۔

ان دنوں وہ مقبرہ شان وشوکت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔لیکن رفتہ رفتہ دست بُرد زمانہ کے ہاتھوں وہ اجڑتا چلا گیا۔سکھوں کے عہد میں اس باغ کو اور مقبرے کو بہت نقصان پہنچا۔اسے دیکھ کر عبرت حاصل ہونے لگی کہ اطلس وکمخواب کے بستر پر سونے والی کس طرح مٹی میں رُل گئی تھی؟اس سلسلے میں ایک شاعر نے لکھا ہے۔

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں کہ یہ آرام گہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہہ خاک نہاں ہے
اٹھتا مگر اب تک سر مرقد سے دھواں ہے
تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سر فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالم بیچارگی اے تاج وری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسر ی ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سر صحرا نہیں ہوتی
دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دل ناداں !
ہاں مل نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہے نہ وہ باغ ،نہ وہ قصر ،وہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا ایک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

پورے ہندوستان پر حکومت کرنے والی اور اپنے نام کا سکہ جاری کرانے والی ملکہ نے اپنی زندگی میں جو چاہا وہ پایا اور جو پایا اس سے زیادہ کھویا۔نہ حکومت رہی نہ اقتدار

رہا۔مجبوری اور بے بسی کا یہ عالم تھا کہ اس کی خادمائیں بھی آصف جاہ کی اجازت کے بغیر اس کا کوئی حکم نہیں مانتی تھیں۔اٹھارہ برس تک حبسِ بے جا میں رہ کر اسی طرح قبر میں گئی۔ جس طرح ایک عام انسان جاتا ہے۔

شاہجہاں نے اپنی ارجمند بانو کو ممتاز محل خطاب دیا تھا۔وہ بھی ممتاز محل کو ایسی دیوانگی سے چاہتا تھا' جیسا کہ اس کے باپ جہانگیر نے نور جہاں سے دیوانہ وار عشق کیا تھا۔اگر ممتاز محل چاہتی تو وہ بھی شاہجہاں کو شراب وشباب میں ڈبو کر رکھتی اور اس کی پشت پر بیٹھ کر پورے ہندوستان پر حکومت کرتی۔

لیکن وہ صحیح معنوں میں ایک مشرقی عورت تھی۔اپنے مجازی خدا کے آگے صرف سجدہ نہیں کرتی تھی۔ باقی اس کے تمام جائزا ور ناجائز احکامات کی تعمیل کیا کرتی تھی۔شاہجہاں نہ تو نشے کا عادی تھا اور نہ ہی اس نے اپنے شوہر کو کبھی کسی نشے کی طرف مائل کیا تھا۔اسے نور جہاں کی طرح امور سلطنت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہ سوچتی تھی کہ شوہر کے بعد شاہی خاندان میں اس کی حیثیت کیا ہوگی؟اسے خدا پر بھروسہ تھا کہ وہی بہتر کرتا ہے اور اپنے مجازی خدا پر اعتماد تھا کہ وہ ساری زندگی اس کے سائے میں عزت آبرو سے رہا کرے گی۔

وہ تو صرف شاہجہاں سے محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی۔شادی کے بعد بھی ایک دن کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوئی۔اپنے محبوب کی منکوحہ بنتے ہی نور جہاں کی سازشیں رنگ لے آئی تھیں۔شاہجہاں باغی کہلانے لگا تھا۔باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے۔اسے جہانگیری لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔وہ بار بار شکست کھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پناہ لینے کے لئے بھاگتا رہا تھا۔ایسے بدترین حالات میں ممتاز محل نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔پورے پانچ برسوں تک وہ اس کے ساتھ دربدر بھٹکتی رہی تھی۔

شاہجہاں بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔مگر اسے آرام وآسائش کی خاطر اس کے میکے میں چھوڑ دیتا یا کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا دیتا' تب بھی یہ اندیشہ رہتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح نور جہاں کے ہتھے چڑھ جائے گی۔پھر اسے یرغمال بنا کر شاہجہاں کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ ہتھیار پھینک دے اور گھٹنے ٹیک دے۔حالات ایسے تھے کہ وہ مسلسل پانچ برسوں تک

کانٹوں کے بستر پر ساتھ سوتے رہے۔آخر انہوں نے کانٹوں پر چلتے ہوئے فتح ونصرت کو اپنا مقدر ہی بنالیا۔

ممتاز محل کی بڑی بہن کا نام ملکہ بانو تھا۔اس کی شادی مرزا محمد صفی سے ہوئی تھی۔اس رشتے سے وہ ممتاز محل کا بہنوئی اور شاہجہاں کا ہم زلف تھا۔لیکن اس نے برے وقت میں نور جہاں کا ساتھ دیا تھا۔اپنے لشکر کے ساتھ شاہجہاں کا تعاقب کرتا رہا تھا۔جبکہ شاہجہاں کوئی ترنوالہ نہیں تھا۔کسی کے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔کبھی شکست کھاتا تھا تو کبھی پھر مختلف علاقوں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے ذریعہ فوجی قوت حاصل کر کے تعاقب کرنے والوں کا مقابلہ کرتا تھا۔کبھی انہیں شکست دیتا تھا اور کبھی فرار ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

ملکہ بانو اپنے شوہر مرزا محمد صفی کو شاہجہاں کی مخالفت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔اسے سمجھاتی رہتی تھی۔مگر وہ اس کی ایک نہیں سنتا تھا۔اسے یقین تھا کہ وہ شکاری کی طرح شاہجہاں کو دوڑاتے دوڑاتے آخر ایک دن بے دم کر دے گا۔

وہ بھول گیا تھا کہ کبھی کبھی شکاری خود شکار ہو جاتا ہے۔جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے تخت پر بیٹھتے ہی نور جہاں کے تمام حمایتیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔مرزا محمد صفی کے لئے خصوصی حکم تھا کہ فوراً احمد آباد پر قبضہ کر کے اسے اپنی حراست میں لے لیا جائے اور اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

ممتاز محل یہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے سزائے موت ہو اور اس کی بہن ملکہ بانو بیوہ ہو جائے۔اس نے اپنے خاوند سے سفارش کی۔"آپ ہماری ہر جائز بات کو تسلیم کرتے ہیں۔لیکن آج ہم ایک ایسی بات تسلیم کرانا چاہتے ہیں' جو سراسر ناجائز ہے۔"

شاہجہاں نے پوچھا۔"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"ہم اپنی ہمشیرہ ملکہ بانو کے سہاگ کی سلامتی چاہتے ہیں۔"

شاہجہاں نے حیرانی سے پوچھا۔"یعنی آپ چاہتی ہیں کہ مرزا محمد صفی کو سزائے موت نہ دی جائے؟"

"بے شک۔ہم یہی چاہتے ہیں۔آپ ہمارے بہنوئی کی خطاؤں کو معاف فرمائیں۔"

وہ بولا۔"ممتاز...!ابھی ہمارے زخم تازہ ہیں۔اس نے صرف ہمیں ہی نہیں۔آپ کو بھی پانچ برسوں تک ٹھوکریں کھلائی ہیں۔در بدر بھٹکایا ہے۔رشتہ داری کو بھول کر ہم سے بدترین دشمنی کرتا رہا ہے اور آپ اس کے لئے معافی چاہتی ہیں؟"

"انہوں نے ہمیں زخم دیئے۔یہ اُن کی کم ظرفی ہے۔لیکن ہم اپنی بہن کے سہاگ کی خاطر التجا کرتے ہیں۔آپ اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیں اور انہیں کوئی سزا نہ دیں۔"

شاہجہاں اپنی اس محبوب شریک حیات کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔جبکہ وہ التجا کر رہی تھی۔اس نے مرزا محمد صفی کو معاف کر دیا اور اسے صوبہ بہار کی نظامت کے لئے نامزد کر دیا۔وہ اپنے تمام اہل وعیال کے ساتھ پٹنہ (حسین آباد) چلا گیا۔

ممتاز محل نہ کسی سے دشمنی چاہتی تھی' نہ کسی کے خلاف کبھی کوئی سازش کرتی تھی۔یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے پانچ برس تک مصائب میں مبتلا کرنے والے بہنوئی کو سزائے موت سے بچا لیا تھا۔اس نے اپنے باپ آصف جاہ سے بھی التجا کی تھی کہ اس کی پھوپھی نور جہاں سے زیادہ سختی نہ برتی جائے۔ممتاز محل کی محبت' ہمدردی اور نرم دلی کے باعث دو بدترین دشمنوں کو نئی زندگی مل رہی تھی۔

وہ نیک دل خاتون زیادہ عرصے تک شاہجہاں کی شریک سفر نہ رہ سکی۔ایک آخری بچی کو جنم دینے کے بعد اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔وہ دیوانہ بادشاہ اس کی موت سے جیسے ٹوٹ کر رہ گیا۔دل ایسا اچاٹ ہوا کہ کئی دنوں تک اس نے دربار منعقد نہیں کیا۔وہ تنہائی میں آنسو بہاتا تھا اور کہتا تھا۔"اب لذتِ سلطانی سے دل پھر گیا ہے۔اگر سلطنت کا بوجھ ہمارے کاندھوں پر نہ ہوتا اور شریعت ترکِ دنیا کی اجازت دیتی تو ہم فقیر بن جاتے۔"

وہ یقیناً ایسا کر گزرتا۔لیکن دنیا داری لازمی تھی۔تاہم اس نے برابر دو سال تک ہر قسم کے عیش وآرام سے اجتناب کیا۔محل میں ہو یا دربار میں۔اس نے کبھی رنگین وقیمتی لباس' جواہرات اور درباری زیورات نہیں پہنے۔عید اور دوسرے تہوار کے موقع پر جب حرم سرا کی بیگمات مبارک باد عرض کرنے کے لئے اس کے گرد جمع ہوتیں تو وہ ان میں ممتاز محل کی صورت نہ دیکھ کر تڑپ جاتا تھا۔بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔تاریخ میں ایسی

کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے اپنی ملکہ کی موت پر اس قدر ماتم کیا ہو۔

اس نے دریائے جمنا کے کنارے راجہ جے سنگھ کا باغ خرید کر وہاں ممتاز محل کی آخری آرام گاہ بنوائی۔ پھر پچاس لاکھ روپے کی لاگت سے وہ مشہور عالم عمارت تعمیر کرائی' جسے آج ساری دنیا تاج محل کہتی ہے۔ اتنا حسین اور دیدہ زیب مقبرہ نہ پہلے کبھی کسی نے تعمیر کرایا تھا اور نہ آج تک کوئی تعمیر کر سکا ہے۔ اس کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔

نور جہاں نے اس دنیا میں ایسی ہی شان و شوکت چاہی تھی۔ لیکن جس کے دل میں بغض و کینہ نہ ہو اور اعمال صالح ہوں۔ صرف انہیں ہی ایسا انعام ملتا ہے۔ نور جہاں کو دریائے راوی کے کنارے ایک ایسی جگہ نصیب ہوئی' جہاں دنیا کا شائد ہی کوئی سیاح بھولے بھٹکے جاتا ہو۔ اس کے برعکس ممتاز محل کے اس خوبصورت روضے کو دیکھنے کے لئے ساری دنیا کے سیاح آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں اور خراجِ تحسین پیش کرتے رہتے ہیں۔ ایک شاعر نے کچھ یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

فضا اے تاج تیری دلنشیں معلوم ہوتی ہے
میں سچ کہہ دوں مجھے جنت یہیں معلوم ہوتی ہے
ضیا تیری ضیائے بہتریں معلوم ہوتی ہے
تیری محراب حوروں کی جبیں معلوم ہوتی ہے
تیری تابانیوں کا کیوں نہ اس کو معجزہ کہوں؟
اندھیری رات میں بھی تو چودھویں معلوم ہوتی ہے
تیری تعمیر دیتی ہے نگاہوں کو سکون کیا کیا
تیری تصویر کتنی دلنشیں معلوم ہوتی ہے
تیرے نظارے سے جذبے محبت کے لرزتے ہیں
وفا و حسن کی تربت یہیں معلوم ہوتی ہے

دنیا کے اس حسین اور دلنشیں مقبرے کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ کہا جائے گا۔ لیکن اس کے لئے ایک فقرہ ایسا کہا گیا ہے۔ جس میں تاج محل کی تمام تعریفیں سمٹ آئی ہیں اور وہ فقرہ ہے۔

''محبت کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا اور وہ تاج محل بن گیا۔''

ممتاز محل نے انیس برس تک شاہجہاں کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ ان انیس برسوں میں اس نے شاہجہاں کی چودہ اولادیں پیدا کیں۔ ان میں سے سات زندہ رہیں۔

پہلی بیٹی کا نام جہاں آراء تھا۔ وہ ۱۶۱۴ء میں پیدا ہوئی۔

اس کے بعد پہلا بیٹا دارا شکوہ ۱۶۱۵ء میں پیدا ہوا۔

دربدری کی حالت میں شاہ شجاع نے ۱۶۱۶ء میں جنم لیا۔

دوسری بیٹی روشن آراء ۱۶۱۷ء میں پیدا ہوئی۔

مغل خاندان کا آخری فرماں روا اورنگزیب ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوا۔

چوتھا بیٹا مراد بخش ۱۶۲۴ء میں اور گوہر آراء بیگم ۱۶۳۱ء میں پیدا ہوئی۔ جو اولادیں وفات پا گئیں۔ وہ بھی ہر ایک برس یا ڈیڑھ برس میں پیدا ہوتی رہیں۔

ممتاز محل اور شاہجہاں شادی کے فوراً بعد ہی نور جہاں کی سازشوں کا شکار ہوتے رہے۔ دربدر بھٹکتے رہے۔ اس دربدری میں ممتاز محل نے پانچ بچوں کو جنم دیا تھا۔ انیس برسوں میں چودہ بچے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان دونوں میں کتنی شدید محبت اور رفاقت تھی۔ وہ ایک دوسرے سے جدا ہونا گوارہ نہیں کرتے تھے۔

ان اولادوں میں جہاں آراء' دارا شکوہ' شجاع' روشن آراء' اورنگزیب اور مراد نے تاج و تخت اور اقتدار حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے کے خلاف زبردست سازشیں کیں۔ حتیٰ کہ طاقت و اختیار کے حصول کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

پوری انسانی تاریخ یہ تلخ حقیقت بیان کرتی ہے کہ بیٹا باپ کی لاش پر سے اور بھائی' بھائی کی لاش پر سے گزر کر حکومت کرتا ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں کسی بھی بادشاہ کے ہاں شہزادیاں اور شہزادے پیدا ہوتے ہیں تو خوب جشن منایا جاتا ہے۔ انہیں سونے میں تولہ جاتا ہے اور یہ حقیقت فراموش کی جاتی ہے کہ جس طرح وہ اپنے بھائیوں کی سازشوں سے اور ان کی لاشوں سے گزر کر آئے ہیں۔ اسی طرح ان کے محل میں پیدا ہونے والے

شہزادے بھی ایک دن یہی کھیل تماشہ دکھائیں گے۔ یہ بات ذہن میں نہیں آتی کہ وہ شاہی خاندانوں میں پیار کرنے والے بہن بھائی نہیں' بلکہ ایک دوسرے کے جانی دشمن پیدا کررہے ہیں۔

جب شاہجہاں کی اولادیں جوان ہوئیں تو وہ بھی اقتدار کی جنگ لڑنے کے لئے پرتولنے لگیں۔ شاہجہاں نے کسی بھی شہزادے کو ولی عہد مقرر نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ تمام شہزادوں میں اپنے بڑے بیٹے داراشکوہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ وہ مرحومہ ممتاز محل کی جھلک اس بیٹے میں دیکھا کرتا ہے۔ اسی لئے وہ اسے ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھتا تھا۔ دربار میں اپنے تخت کے قریب ہی ایک چھوٹا سا شاندار تخت رکھوایا تھا۔ جس کی اونچائی کم تھی۔ وہ تخت داراشکوہ کے لئے تھا۔ تمام امراء اور اراکینِ دربار بیک وقت دو بادشاہوں کو دو تخت پر جلوہ افروز دیکھتے تھے اور یہ قیاس کرتے تھے کہ مستقبل میں داراشکوہ ہی تاج و تخت کا مالک ہوگا۔

شاہجہاں کے اس طرزِ عمل نے باقی شہزادوں کو سمجھا دیا' اگر انہوں نے ابھی سے اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد نہ کی اور فوجی قوت حاصل نہ کی تو بعد میں پچھتانے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ داراشکوہ ان سب کو کچل کر رکھ دے گا۔

ہوش سنبھالتے ہی ان چاروں بھائیوں نے ایک دوسرے سے دوری اختیار کرلی تھی اور ہر معاملے میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے رہتے تھے۔ ان چار بھائیوں میں دو بہنیں جہاں آراء اور روشن آراء تھیں۔ جہاں آراء عمر میں سب سے بڑی تھی۔ وہ اپنے بھائی داراشکوہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ ہر معاملے میں اسی کی اندھی حمایت کیا کرتی تھی۔

روشن آراء اپنے بھائی اورنگزیب کی حمایتی تھی۔ اورنگزیب اور دوسرے شہزادے اُمورِ سلطنت کے سلسلے میں یا پھر مختلف صوبوں سے اُبھرنے والی بغاوتوں کو کچلنے کے لئے دارالسلطنت سے دور رہا کرتے تھے۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں دشمنوں سے نبرد آزما رہتے تھے۔ ایسے وقت روشن آراء محل میں ہونے والی سازشوں کی ایک ایک خبر اورنگزیب تک پہنچاتی رہتی تھی۔

شاہجہاں اپنے بیٹوں کی طرف سے بہت پریشان رہا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ چاروں

بیٹے عاقل و بالغ تھے۔ متحد ہو کر اپنے باپ کی قائم کی ہوئی وسیع و عریض سلطنت کو اور مضبوط و مستحکم بنا سکتے تھے۔ لیکن وہ برادرانہ سلوک اور لہو کے رشتوں کو بالائے طاق رکھ کر سلطنت کی ہوس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے تھے۔

شاہجہاں دن رات اسی تردد اور تفکر میں مبتلا رہتا تھا کہ ان چاروں بیٹوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا تو مغلیہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ وہ سب علیحدہ علیحدہ سلطنتیں قائم کرلیں گے۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ ان چاروں کو مختلف صوبوں کا حاکم بنا دیا جائے۔ ایک دوسرے سے دور کر دیا جائے۔ وہ اپنے اپنے علاقوں میں مصروف رہیں گے تو ایک دوسرے کے خلاف سازش کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

لہٰذا اس نے سلطان شجاع کو بنگالہ' اورنگزیب کو دکن' مراد بخش کو گجرات اور داراشکوہ کو ملتان اور کابل کا حاکم مقرر کر دیا۔ لیکن اس تدبیر سے کوئی فائدہ نہیں' نقصان ہی پہنچا۔ ان شہزادوں نے اپنے اپنے علاقے میں خودسر بادشاہوں کی سی حکمرانیاں شروع کر دیں۔ بادشاہ وقت شاہجہاں کی اجازت کے بغیر اپنے علاقوں کی آمدنی اپنے ذاتی معاملات میں صَرف کرنے لگے۔ ہر ایک نے بڑی بڑی مہیب فوجیں اس بہانے سے بھرتی کرلیں کہ بادشاہِ وقت شاہجہاں کو کبھی دشمنوں سے بہت بڑی جنگ لڑنی پڑی تو وہ اپنی اپنی فوجی قوتوں کے ذریعہ باپ کو مدد پہنچاتے رہیں گے۔

پھر یہ کہ داراشکوہ نے باپ کی عطا کی ہوئی ملتان اور کابل کی جاگیر کو قبول تو کیا۔ لیکن باپ کو چھوڑ کر ادھر نہیں گیا۔ اس کی حمایتی بہن جہاں آراء بہت ذہین تھی۔ دور تک سوچتی تھی۔ اس نے بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ ملتان اور کابل میں اپنا قائم مقام حاکم مقرر کرے اور خود دارالسلطنت میں باپ کے قریب رہا کرے۔

دنیا کے کسی بھی ملک میں محلاتی اور بیگماتی سازشیں ضرور ہوا کرتی ہیں۔ شاہی بیگمات اور شہزادیاں محبتوں' ہمدردیوں اور حسن و شباب کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ ایسی سازشیں کرتی ہیں کہ حکومت کرنے والے مرد حضرات کو اصلی وجوہات کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس طرح ان خواتین کے اختیار و اقتدار کے باعث حکمرانوں کی بازیاں پلٹ گئی ہیں؟

ان ہی دنوں شاہجہاں سخت بیمار ہوگیا۔ جہاں آراء نے داراشکوہ سے کہا۔ ''ہم

نے اسی لئے آپ کو جانے سے روکا تھا۔ یہاں کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہی دیکھیں کہ بابا جانی اچانک بیمار ہوگئے ہیں۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

داراشکوہ نے کہا۔" ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ بابا جانی ہمیں کبھی کسی بھائی سے لڑنے اور انہیں کچلنے کا موقع نہیں دیتے ہیں۔ احکامات صادر کرنے کی شاہی مہر آپ کی تحویل میں رہتی ہے۔ ہم بابا جانی کی طرف سے یہ حکم صادر کر سکتے ہیں کہ سلطان شجاع' اورنگزیب اور مراد بخش کی بغاوتوں سے عاجز آکر ان پر حملہ کرنے کا حکم صادر کیا جارہا ہے۔ آپ اس حکم پر شاہی مہر لگا سکتی ہیں۔"

جہاں آراء نے کہا۔" یہ مناسب نہیں ہے۔ اس طرح ہم بابا جانی کا اعتماد کھودیں گے۔ چال ایسی چلی جائے کہ ہم پر کوئی حرف نہ آئے۔ آپ ایسا کریں کہ بابا جانی کی وفات کی افواہ محل سے باہر پھیلا دیں۔ جب ہمارے تینوں بھائیوں کو یہ خبر ملے گی تو وہ سب اپنا اپنا لشکر لے کر دارالسلطنت کا رخ کریں گے۔ ایسے میں بابا جانی کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی بغاوت اور سرکشی کو روکنے کے لیے آپ شاہی لشکر کو ان کے مقابلے پر لے آئے ہیں۔"

پھر یہی چال چلی گئی۔ بادشاہ کی وفات کی خبر باہر اڑائی گئی۔ اراکین دربار اور اعلیٰ عہدیدار جو داراشکوہ کے علاوہ باقی تین شہزادوں کے بھی حمایتی تھے۔ وہ الجھن میں پڑ گئے کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ کون شہزادہ دوسرے پر سبقت لے جائے گا؟ ان حالات میں تمام دربار درہم برہم ہوگیا۔ یہ سوال اہم تھا کہ آئندہ تخت شاہی پر کون بیٹھے گا؟

چاروں شہزادوں نے فیصلہ کرلیا کہ تلوار کے ذریعہ ہی تخت تک پہنچا جا سکتا ہے۔ حالات ایسے تھے کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز نہیں آسکتے تھے۔ کیونکہ فتح یابی کی حالت میں تو تخت کی امید تھی۔ لیکن شکست کی صورت میں جان سے جانے کا مکمل یقین تھا۔ ان سب کے آگے دو ہی راستے تھے۔ موت یا حکومت.....

روشن آراء نے اپنے بھائی اورنگزیب کے پاس خبر بھیجی۔" برادر! داراشکوہ کو آپ سے زیادہ خطرہ ہے۔ اس کے شاہی لشکر میں سپاہیوں اور ہتھیاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہمیں پتہ چلا ہے' وہ سلطان شجاع کو دریا عبور نہیں کرنے دے گا۔ پہلے آپ سے نمٹنا چاہے گا۔ آپ کسی بھی طرح اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں۔"

اورنگزیب نادان نہیں تھا۔ یہ جانتا تھا کہ بھائیوں کو متحد کر کے ہی وہ داراشکوہ کے شاہی لشکر کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ سلطان شجاع اس سے اتحاد کے لئے راضی نہیں تھا۔ اس نے مراد بخش کو حکومت کرنے کے سبز باغ دکھائے اور کہا۔" آپ کو تو علم ہے' ہمیں شاہانہ طرز زندگی کبھی گوارہ نہیں رہی۔ ہم صرف اپنے آباؤ اجداد کی اس سلطنت مغلیہ کو دائم وقائم رکھنے کے لئے دنیاوی معاملات میں پڑ گئے ہیں۔"

مراد بخش نے کہا۔" ہم آپ کے فقیرانہ مزاج کو سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ داراشکوہ کے مقابلے میں آپ ہماری مدد فرمائیں۔"

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ ہمارے لشکر متحد ہو جائیں گے تو شاہی لشکر کے مقابلے میں کسی طور کمزور نہیں پڑیں گے۔"

داراشکوہ میں اگرچہ کچھ خوبیاں تھیں۔ لیکن اسے تباہ و برباد کرنے والی خرابیاں بھی تھیں۔ وہ بہت ہی خود پسند اور مغرور تھا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ وہ اپنی عقل کی رسائی اور خوش تدبیری سے ہر امر کا بندوبست اور انتظام کرسکتا ہے۔ کسی سے صلح ومشورے کا محتاج نہیں ہے۔ جو امراء اور مشیر اسے مشورے دیتے تھے۔ وہ بڑی حقارت سے ان کے مشوروں کو ٹھکرا دیتا تھا۔ صرف اپنی بڑی بہن جہاں آراء سے متاثر تھا۔ وہ اس کے لئے اپنے بابا جانی کے دل میں زیادہ سے زیادہ محبت اور اعتماد پیدا کرتی رہتی تھی اور دوسرے بھائیوں کے عمل دخل پر ہمیشہ نکتہ چینی کرتی رہتی تھی۔

داراشکوہ کو اس کا غرور لے ڈوبا۔ اس نے اپنے ایک بھائی سلطان شجاع کو تو بڑی آسانی سے شکست دی اور اسے کہیں فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ لیکن اورنگزیب اور مراد بخش اس کے لئے لوہے کے چنے ثابت ہوتے رہے۔ کتنے ہی مقامات پر ان سے جنگیں ہوتی رہیں۔ کبھی کوئی اور کبھی کوئی شکست کھاتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر ایک دوسرے پر حملے کرتا رہا۔ آخر کار داراشکوہ کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا۔

مراد بخش نے اورنگزیب سے کہا۔" اب ہمارے لئے راستہ صاف ہے۔ ہم آسانی سے دارالسلطنت پہنچ کر تخت پر قبضہ جما سکتے ہیں۔"

اورنگزیب نے کہا۔" برادر! تخت پر بیٹھنے کی جلدی نہ کرو۔ اب تو وہ آپ کا

ہے۔ آپ ہی کا رہے گا۔ لیکن ہم نے دارا شکوہ کو گرفتار نہ کیا' اسے ختم نہ کیا تو وہ ہمیشہ ہمارے لئے خطرہ بنتا رہے گا۔ ادھر آپ تخت نشینی کا جشن منانا چاہیں گے۔ ادھر وہ پلٹ کر حملہ کرے گا۔''

''آپ درست فرماتے ہیں۔ پہلے ہمیں دارا شکوہ کا سر کچلنا ہوگا۔ اس کے لئے ہم اس کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ کہیں اسے دم لینے نہیں دیں گے۔''

شاہجہاں صحت یاب ہو چکا تھا اور اپنے بیٹوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ شاہی فوج بھی تتر بتر ہو گئی تھی۔ پھر پتہ چلا کہ اورنگزیب دارا شکوہ کو شکست دینے کے بعد شاہی لشکر کے بے شمار سپاہیوں کو ہتھیاروں سمیت اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاہی لشکر کو کمزور بنا چکا ہے۔

شاہجہاں نے جہاں آراء سے پوچھا۔ ''آخر ہماری موت کی افواہ کس نے اڑائی تھی؟ یہ بے تکی خبر دور تک کیسے پہنچ گئی؟''

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی لاڈلی بیٹی جس پر وہ اندھا اعتماد کرتا ہے اور اس کا محبوب بیٹا جسے وہ تمام بیٹوں سے زیادہ چاہتا ہے۔ ان ہی دونوں کی سازشوں کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کے یا تو ٹکڑے ہونے والے ہیں یا پھر کسی ایک شہزادے کو فتح نصیب ہونے والی ہے اور جو بھی بیٹا فتح یاب ہو کر یہاں تک پہنچے گا۔ وہ باقی تین بیٹوں کی لاشوں پر سے گزرتا ہوا آئے گا۔

جہاں آراء اپنے بھائی دارا شکوہ کے لئے بہت پریشان تھی۔ اس نے باپ سے کہا۔ ''بابا جانی! آپ کسی بھی طرح دارا شکوہ کو تحفظ فراہم کریں۔ انہیں اپنے لشکر کی نگرانی میں اپنے پاس یہاں بلائیں۔ ورنہ اورنگزیب اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

روشن آراء نے کہا۔ ''بابا جانی! آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ لیکن سچ یہی ہے' آپ ہمشیرہ اور برادر دارا شکوہ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ اس لیے ہماری یہ بات تسلیم نہیں کریں گے کہ ان دونوں نے ہی آپ کی وفات کی جھوٹی خبر اڑائی تھی۔ اب اس کا بھیانک نتیجہ سامنے آ رہا ہے تو ہماری یہ ہمشیرہ دارا شکوہ کی سلامتی کے لئے تڑپ رہی ہیں۔''

شاہجہاں نے کہا۔ ''ہم بھی تڑپ رہے ہیں۔ یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ ہمارے

دارا پر کوئی آنچ آئے۔ وہ تمہاری مرحوم والدہ کی ہو بہو تصویر ہے۔ ہم اسے دیکھ دیکھ کر جی رہے ہیں۔''

جہاں آراء غصے سے اپنی بہن روشن آراء کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بابا جانی! یہ ہم پر اور دارا شکوہ پر جھوٹا الزام عائد کر رہی ہیں۔ ہم نے آپ کی وفات کی جھوٹی خبر نہیں اڑائی۔ یہ ہمارے خلاف جھوٹ بول کر ہماری توہین کر رہی ہیں۔''

شاہجہاں نے روشن آراء سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ جہاں آراء ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہی ہے؟''

روشن آراء نے کہا۔ ''آپ ہمیں دو چار دنوں کی مہلت دیں۔ ہم یہ ثابت کر دیں گے۔''

وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ جہاں آراء نے کہا۔ ''بابا جانی! اورنگزیب روشن آراء کو بہت چاہتا ہے۔ اس کی ہر بات مانتا ہے۔ اگر آپ ہمشیرہ کے ذریعہ اورنگزیب کو دارا شکوہ کی عداوت سے باز رکھیں تو وہ بہن کی بات کو اور آپ کے حکم کو ہرگز نہیں ٹالے گا۔''

شاہجہاں دارا شکوہ کے لئے خود بہت پریشان تھا۔ اسے کسی بھی طرح صحیح سلامت اپنی پناہ میں لانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

مسلمان مؤرخین جہاں آراء کو انتہائی حسین ذہین اور نہایت پاکباز خاتون لکھتے آئے ہیں۔ ہندو مؤرخین اور بیرونی ممالک کے سیاح' خاص طور پر فرانسیسی سیاح برنیئر نے اُسے حسین اور ذہین تو لکھا ہے۔ لیکن ایک عاشق مزاج شہزادی کی حیثیت سے بھی پیش کیا ہے۔ برنیئر کی اہمیت یہ ہے کہ وہ دارا شکوہ کے ساتھ رہا ہے۔ اورنگزیب کے مشہور امیر دانشمند خاں کے طبیبوں میں بھی شامل رہا ہے۔ اسے صرف دربار شاہی کے ہی نہیں۔ محل اور محل سرا کے اندرونی معاملات کا بھی کماحقہٗ علم ہوتا رہا۔ اتنے قریب سے جائزہ لینے والے کی معلومات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اگر ایسا مؤرخ جہاں آراء کو عاشق مزاج شہزادی لکھتا ہے تو اس حقیقت سے بالکل ہی انکار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ وہ شہزادی بھی انسان تھی۔ جوان لڑکیوں کی طرح اس کے بھی اپنے جذبات تھے۔ اس موقع پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جہاں آراء اور روشن آراء نے

کبھی شادیاں کیوں نہیں کیں؟

جواب بالکل واضح ہے کہ جب بادشاہ وقت چاہے گا' تب ہی بیٹیوں کی شادیاں ہوں گی۔شاہجہاں نے اپنے بیٹوں کے درمیان نوعمری کے دور میں ہی انہیں ایک دوسرے کا مخالف پایا تھا۔یہ آثار پیدا ہوگئے تھے کہ تاج وتخت کے لئے ان چاروں بھائیوں میں رسّہ کشی ضرور ہوگی۔ایسے وقت شاہی خاندان کے دوسرے قریبی رشتہ دار بھی ان سازشوں میں شریک ہوجاتے ہیں۔

شاہجہاں کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ کسی بھی شہزادی کی شادی کرائے گا تو اس کا شوہر شاہی خاندان میں داخل ہوتے ہی تاج وتخت کی جستجو اور حرص کرنے لگے گا یا کسی ایک شہزادے کی حمایت کرکے ان کی عداوتوں کو بھڑکاتا رہے گا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا' جب کوئی ایک لائق بیٹا تخت نشین ہوگا اور دوسرے بھائیوں کی طرف سے فتنہ وفسادات کے امکانات ختم ہوجائیں گے۔تب ہی ان شہزادیوں کی شادیاں کی جائیں گی۔

جہاں آراء سب سے بڑی بیٹی تھی۔تمام جوان بھائیوں کی عمروں کا حساب کیا جائے تو وہ اپنی شادی کی عمر سے بہت آگے نکل گئی تھی۔یہ قدرتی عمل ہے کہ ایسے میں خیالات اور جذبات بھٹکتے ہیں۔کسی چاہنے والے کی...کسی سے چاہے جانے کی آرزو دل میں مچلتی رہتی ہے۔اس شہزادی کے دل میں بھی یہ آرزو تھی کہ اس پر حاوی ہونے والا کوئی شخص زندگی میں آجائے۔

محل کے اندر اور باہر اتنا سخت پہرہ رہتا تھا کہ مسلح سپاہیوں کو بھی ادھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔وہاں خواجہ سرا اور اُردہ بیگنیاں ہتھیار لئے پہرہ دیتی رہتی تھیں۔کتنی ہی کنیزیں اور خادمائیں بادشاہ اور شہزادوں کی جاسوس تھیں۔اگر کوئی چوری چھپے وہاں آنا چاہتا تو خفیہ طور پر جاسوسی کرنے والیوں کی نظروں سے بچ نہیں پاتا تھا۔

یہ سچ ہے کہ عورت کو سات آہنی دروازوں کے پیچھے قید رکھا جائے۔کسی سے ملنے کی اجازت نہ دی جائے تب بھی وہ سرنگ بنا کر یا کسی نہ کسی چور دروازے کے ذریعہ اپنے محبوب سے ضرور ملتی ہے۔

ایک بار جہاں آراء سیر کے لئے شاہی باغ میں آئی۔وہاں ایک قسمت کا مارا شاعر چھپا ہوا تھا۔شہزادی کے جلوس کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تو جہاں آراء پر نظر پڑتے ہی اس نے بے اختیار یہ شعر پڑھا۔

برقع برخ افگندہ برو ناز بباغت
تا نکہت گل بیختہ آید بد ما غت

جہاں آراء نے یہ شعر سنا تو ایکدم سے تڑپ گئی۔کنیزوں سے پوچھا۔"یہ کون گستاخ ہے؟اسے فوراً حاضر کیا جائے..."

جب اسے حاضر کیا گیا تو اس خوبرو جوان کو دیکھتے ہی غصہ کرنا بھول گئی۔چند لمحوں تک اسے تکتی رہی۔ایک کنیز نے پوچھا۔"کیا حکم ہے؟ کیا اسے داروغہ کے حوالے کردیا جائے؟"

جہاں آراء نے اس شاعر کو انعام کے طور پر دس ہزار اشرفیاں دینے کا حکم دیا۔پھر اس سے کہا۔"آئندہ یہاں آنے اور ہمیں بے نقاب دیکھنے کی جرات نہ کرنا۔ورنہ حرام موت مارے جاؤ گے۔"

اس نے اپنی ایک خاص اُردہ بیگنی سے کہا۔"اس جوان کو باغ کے باہر چھوڑ آؤ۔"

پھر وہ اُردہ بیگنی کے کان میں بولی۔"اس جوان کا نام پتہ ٹھکانہ معلوم کرو اور آئندہ اس سے ہماری ملاقات کا اہتمام کرو۔ہم تمہیں مالا مال کردیں گے۔"

اس اُردہ بیگنی نے حکم کی تعمیل کی۔پھر ایسے انتظامات کئے کہ تنہائی میں شہزادی اور اُس شاعر کے ملنے کے چور راستے کھل گئے۔دولت کی فراوانی ہو تو پہریدار اور جاسوس بھی خرید لئے جاتے ہیں۔پھر محل میں جہاں آراء کا ایسا رعب ودبدبہ تھا کہ سب ہی اس کے آگے سر جھکاتے تھے اور اسے خوش رکھنا چاہتے تھے۔کوئی اس کی ناراضی مول لینے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔

جہاں آراء اپنے محبوب شاعر کی قربت سے سرشار ہوجایا کرتی تھی۔اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔شاعر بھی اس کا دیوانہ ہوگیا تھا۔وہ کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ مغلیہ سلطنت کی ایک شہزادی اس پر عاشق ہوجائے گی۔اپنی دولت کے ساتھ حسن وشباب

بھی اس پر لٹایا کرے گی۔ وہ قسمیں کھاتا تھا کہ ساری زندگی اس کا وفادار اور تابعدار بن کر
رہے گا۔

ایسے وقت جہاں آراء ناراض ہو کر کہتی۔ ''تم ہمارے محبوب ہو۔ غلام نہیں
ہو۔ ایسی تابعداری کی باتیں نہ کیا کرو۔ ہمیں اتنی قوت اور اتنے اختیارات حاصل ہیں کہ ہم
سب پر مسلط رہتے ہیں۔ سب ہی ہمارے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ ہماری ایک ہی
آرزو تھی کہ کوئی ہم پر مسلط رہے اور ہم نے تمہیں اجازت دی ہے۔ تم نہیں جانتے'
تمہارے زیر اثر رہ کر ہمیں کتنا اچھا لگتا ہے؟ ہماری تو دنیا ہی بدل جاتی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''یہ خوف سا دل میں رہتا ہے۔ کبھی چوری پکڑی گئی تو کیا ہوگا؟''

''کیا تم بزدل ہو؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا' جان چلی جائے گی۔ کیا ہماری
خاطر جان پر نہیں کھیل سکو گے؟''

''اگر میں بزدل ہوتا تو کبھی آپ کی خلوت میں قدم رکھنے کی جرات نہ کرتا۔ خدا
نہ کرے کہ میں پکڑا جاؤں اور آپ کی بدنامی ہو۔''

جہاں آراء نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہاں۔ ہم ایسا نہیں چاہتے۔ ہماری
بدنامی پورے مغلیہ خاندان کی بدنامی ہے۔ بابا جانی ہم پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ اگر یہ بات
کھلے گی تو ان کے سامنے ہمارا سر جھک جائے گا۔ ہم زبان سے ایک لفظ نہیں کہہ سکیں گے۔''

''ایسے وقت آپ کو میرے بارے میں کچھ کہنا بھی نہیں چاہیے۔ بلکہ مجھ پر ہی
الزام لگانا چاہیے کہ میں جبراً یہاں آیا ہوں اور پہلی بار آتے ہی گرفتار ہو گیا ہوں۔''

''کیا تم اتنے ہی دلیر اور سچے عاشق ہو کہ کبھی پکڑے گئے تو ہمارا نام اپنی زبان پر
نہیں لاؤ گے؟''

''میں مر جاؤں گا۔ لیکن آپ پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔ خدا نہ کرے'
ایسا وقت آئے۔ آپ دیکھ لیں گی کہ میں کس طرح آپ کا نام اپنی زبان پر لائے بغیر اپنی
جان دے سکتا ہوں؟''

جہاں آراء نے ایک بار اسے آزمایا۔ جب وہ اس سے ملنے کے لئے پائیں باغ
میں آیا تو اُردہ بیگنیوں نے اس کے حکم کے مطابق اسے ننگی تلواروں کے سائے میں گرفتار کر

لیا۔ شاعر نے حیرانی سے ایک اُردہ بیگنی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا....؟ کیا مجھے گرفتار کیا
جا رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ تم نے محل سرا کے باغ میں گھس آنے کی جرات کی ہے۔ تمہیں
باہر لے جا کر داروغہ کے حوالے کیا جائے گا۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''لیکن... لیکن میں تو تمہارے ہی تعاون سے یہاں آتا رہا
ہوں اور آج بھی اسی طرح آیا ہوں۔''

اُردہ بیگنی نے ڈانٹ کر کہا۔ ''بکواس مت کرو۔ کیا تم ایسی باتیں کہہ کر شہزادی
حضور کو بدنام کرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہرگز نہیں۔ میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں یہاں کسی شہزادی کو دیکھنے یا
اس سے ملنے آیا ہوں؟ میں تو چوری کی نیت سے داخل ہوا ہوں۔ بے شک مجھے داروغہ کے
حوالے کیا جائے۔ سزائے موت پانے تک میرا یہی بیان ہوگا کہ میں ایک چور ہوں اور
چوری کی نیت سے یہاں آیا تھا۔''

ایک اُردہ بیگنی نے کہا۔ ''تم ایسے سخت جان نہیں ہو۔ جب تم پر تشدد کیا جائے
گا۔ خنجر سے زخم لگائے جائیں گے' اُن زخموں پر نمک چھڑکا جائے گا اور تھوڑی تھوڑی سی
کھال اتاری جائے گی' تب تم چیخ چیخ کر حقیقت بیان کرو گے کہ یہاں کس سے ملنے آیا
کرتے تھے؟''

یہ سنتے ہی شاعر نے اپنے لباس کے اندر سے ایک خنجر نکال لیا۔ پھر کہا۔ ''کوئی
مجھ پر کیا تشدد کرے گا۔ میں ابھی اور اسی وقت اپنی جان دے رہا ہوں۔''

وہ خنجر کو اپنے سینے میں گھونپ لینا چاہتا تھا۔ دو اُردہ بیگنیوں نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ
لیا۔ جہاں آراء چھپ کر تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''رک جاؤ۔!''

وہ تمام اُردہ بیگنیاں شہزادی کا اشارہ پاتے ہی وہاں سے چلی گئیں۔ شاعر نے
حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے شہزادی کو دیکھا۔ جب وہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو
وہ مسکرا کر دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ ''ہم تمہیں آزما رہے تھے۔ واقعی تم
ایک سچے عاشق ہو۔ تم ہماری عزت آبرو کی خاطر' ہماری نیک نامی کی خاطر جان بھی دے

سکتے ہو۔"

اس آزمائش کے بعد جہاں آراء کو اطمینان ہو گیا کہ وہ سچا عاشق اپنی جان دے دے گا۔ لیکن کبھی اس سے اپنا تعلق ظاہر نہیں کرے گا۔ کبھی اس کی عزت پر حرف نہیں آنے دے گا۔ وہ بس اتنا ہی چاہتی تھی کہ باباجانی کے سامنے کبھی اس کا سر نہ جھکے۔

جب در اپنے ہوں' دیواریں اپنی ہوں اور تمام پہریدار زرخرید ہوں تو بھید کبھی نہیں کھل سکتا تھا۔ لیکن جہاں آراء اس چوری چھپے کے کھیل میں اس قدر مست وسرشار رہی کہ اپنی مخالفت کرنے والی بہن روشن آراء کو بھول گئی۔

ویسے بھی جہاں آراء کے ستارے گردش میں آ گئے تھے۔ اس نے داراشکوہ کے ساتھ جو منصوبے بنائے تھے۔ ان پر عمل کرنے کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ داراشکوہ شکست کھا کر ہندوستان کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی طرف بھٹکتا اور چھپتا پھر رہا تھا۔ ایسے وقت روشن آراء نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ باباجانی کو جہاں آراء کا اصلی چہرہ دکھائے گی۔ یہ ثابت کرے گی کہ وہ لاڈلی بیٹی بن کر باپ کے اعتماد کو دھوکہ دیتی رہتی ہے۔

یہ دعویٰ کرنے کے بعد روشن آراء اسی تاک میں تھی کہ اس کی ہمشیرہ اپنے عاشق کو آئندہ کس روز اور کس وقت حرم سرا میں بلائے گی؟ ویسے وہ ہر دوسرے تیسرے دن اسے ضرور طلب کرتی تھی۔

روشن آراء کی بھی اپنی زرخرید کنیزیں اور اُردہ بیگیاں تھیں۔ جب بھی وہ اہم خبریں اس کے پاس پہنچاتیں تو وہ انہیں مالا مال کر دیتی تھی۔ اسے جلد ہی یہ اطلاع ملی کہ وہ شاعر عاشق دوسرے دن دوسرے پہر پائیں باغ میں آنے والا ہے۔

اس نے شاہجہاں کے سامنے حاضر ہو کر کہا۔ "باباجانی! ہم نے اب سے تین دن قبل یہ کہا تھا کہ ہمشیرہ آپ کے اعتماد سے کھیلتی رہتی ہیں۔ آپ کو دھوکہ دیتی رہتی ہیں اور ہم یہ ثابت کر کے رہیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ثابت کرنے کا وقت آ چکا ہے۔"

شاہجہاں نے کہا۔ "تم تو ہماری بیٹی کے خلاف ہمیں بدظن کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ کیا واقعی تم ثابت کر سکو گی؟"

"بے شک۔ پہلے تو آپ یہ وعدہ کریں کہ ابھی ہم جو کہہ رہے ہیں یہ بات اس چاردیواری سے باہر نہیں جائے گی اور آپ اپنی لاڈلی بیٹی سے نہ کچھ کہیں گے اور نہ ہی اپنے تیور بدل کر اسے محتاط ہونے کا موقع دیں گے۔"

"ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ مگر ہمیں بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟"

روشن آراء نے اپنی ہمشیرہ اور اس کے محبوب کی چوری چھپے ہونے والی ملاقاتوں کی پوری روداد سنا دی۔ شاہجہاں غصے سے لرزنے لگا۔ دونوں مٹھیاں بھینچ کر گرجتے ہوئے بولا۔ "جانتی ہو' تم ہماری بیٹی پر کتنا بڑا الزام عائد کر رہی ہو؟ اگر یہ سچ نہ ہوا تو ہم تمہیں نظروں سے گرا دیں گے۔ تمہیں تمام شاہی مراعات سے محروم کر دیں گے۔ تم دو کوڑی کی ہو کر رہ جاؤ گی۔"

"اگر الزام غلط ہو گا تو ہم اس سے بھی بدترین سزا پانے کو تیار ہیں۔ لیکن آپ اپنے غصے پر قابو پائیں۔ ہمشیرہ آپ کا چہرہ دیکھتے ہی تاڑ جائیں گی کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم جا سکتی ہو۔ ہم اپنے غصے پر قابو پانا جانتے ہیں۔"

وہ چلی گئی۔ شاہجہاں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس بیٹی کو دل و جان سے چاہتا ہے' جس کی ذہانت سے متاثر ہو کر حکومت کے اہم معاملات میں بھی اس سے مشورے لیتا ہے' اس پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتا ہے۔ وہ بیٹی چوری چھپے ایسا شرمناک کھیل کھیل رہی ہو گی۔

وہ سوچنے لگا۔ "اگر یہ سچ ہوا تو....؟ تو کیا ہم اپنی بیٹی کو کوئی سزا دے سکیں گے؟"

وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اسے اپنی اس کمزوری پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ جس سے بھی محبت کرتا ہے اسے دل و جان سے چاہنے لگتا ہے۔ اس نے ممتاز محل کو کتنی شدت سے چاہا تھا۔ اس شدت کو ساری دنیا تاج محل کی صورت میں دیکھ رہی تھی۔ بیوی کی طرح بیٹی کو بھی اس نے ایسی ہی محبت دی اور داراشکوہ سے اس لئے متاثر ہوتا رہا کہ اس کے چہرے پر اپنی ممتاز محل کا چہرہ دیکھتا تھا۔

اب سے پہلے داراشکوہ اور جہاں آراء نے کئی غلطیاں کیں۔ وہ غلطیاں

شاہجہاں کی نظروں میں آئیں۔لیکن اس نے بڑی محبت سے ان سب کو درگزر کر دیا۔لیکن آج جو بات معلوم ہوئی تھی' وہ انتہائی شرمناک تھی۔شاہجہاں سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی بیٹی اپنی پارسائی کو داغدار کر رہی ہے۔

جہاں آراء کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے چور رشتے کی خبریں اچانک بابا جانی تک پہنچ چکی ہوگی۔دوسرے دن اس کا محبوب اس سے ملنے کے لئے پائیں باغ میں آیا۔اس کے تھوڑی دیر بعد ہی دو چار اُردہ بیگنیاں دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔پھر خوف سے لرزتے ہوئے بولیں۔''بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی جہاں آراء کے قدموں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔وہ لڑکھڑا گئی۔پھر سنبھل کر بولی۔''اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔چور دروازے سے باہر بھیج دو۔''

اُردہ بیگنیوں نے حکم کی تعمیل کی۔اسے تیزی سے اپنے ساتھ دوڑاتی ہوئی۔ایک چور دروازے تک آئیں۔اسے اندر سے کھولنا چاہا تو پتہ چلا' وہ باہر سے بند ہو چکا ہے۔وہ شاعر ان کے ساتھ واپس آگیا۔جہاں آراء نے پریشان ہو کر پوچھا۔''کیا ہوا.....؟''

ایک اُردہ بیگنی نے کہا۔''اس دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔معلوم ہوتا ہے' آپ کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔بادشاہ سلامت کو اطلاع دینے کے بعد یہاں سے فرار ہونے کے راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں۔''

شاعر نے کہا۔''شہزادی حضور! آپ پریشان نہ ہوں۔میں دیوار پھاند کر یہاں سے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ دوڑتا ہوا دیوار پر چڑھنے لگا۔پھر سر اٹھا کر دوسری طرف دیکھا تو وہاں دور تک مسلح سپاہی دکھائی دیئے۔وہ دیوار سے واپس پائیں باغ میں کود گیا۔پریشان ہو کر بولا۔''ہر طرف مسلح سپاہی دکھائی دے رہے ہیں۔''

دور سے نقارچی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔''باادب۔باملاحظہ ہوشیار۔ظل سبحانی اپنی صاحب زادی جہاں آراء بیگم سے ملاقات کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔''

جہاں آراء کا چہرہ زرد پڑ گیا۔یہ یقین ہو گیا کہ اب بھید کھلنے ہی والا ہے۔اس کے ایک حصے میں بڑے بڑے پتھر رکھ کر ایک چولہا بنایا گیا تھا اور اس پر ایک

بڑی سے دیگ چڑھی ہوئی تھی۔شہزادیاں جب غسل کرنا چاہتیں تو ان کے لئے اسی طرح پانی گرم کیا جاتا تھا۔

جہاں آراء نے شاعر محبوب کو ادھر دھکا دیتے ہوئے کہا۔''جاؤ۔فوراً اس دیگ میں چھپ جاؤ۔چھپنے کی اور کوئی جگہ نہیں ہے۔''

وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں آیا۔اُردہ بیگنیوں نے دیگ کے ڈھکن کو ہٹایا۔وہ اس کے اندر چلا گیا۔وہاں آدھے سے زیادہ پانی تھا۔وہ اس میں ڈوب کر بیٹھ گیا۔سر پانی سے باہر تھا۔دیگ کو پہلے کی طرح اس ڈھکن سے بند کر دیا گیا۔

شاہجہاں نے وہاں پہنچ کر بیٹی کو دیکھا۔وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔''بابا جانی.....! آپ.....؟ آپ خلاف توقع آئے ہیں۔خیریت تو ہے؟''

شاہجہاں نے دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔''کیا ہماری اچانک آمد سے پریشان ہو گئی ہو؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔''جی۔جی نہیں.....آپ ہمیشہ اپنی آمد کی اطلاع دیتے رہے ہیں۔آج اطلاع نہیں دی۔اس لئے ہمیں حیرانی ہے۔''

شاہجہاں گھوم گھوم کر پائیں باغ میں دیکھ رہا تھا۔جہاں آراء کی پریشانی کو سمجھ رہا تھا۔وہ بار بار چور نظروں سے دیگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس نے پوچھا۔''کیا تم نے غسل کرنے کے لئے پانی رکھوایا ہے؟''

جہاں آراء نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔باپ نے کہا۔''تو پھر پانی گرم کرنا چاہیئے۔اچھی خاصی سردی پڑ رہی ہے۔ایسے میں تیسرے پہر غسل کرنا مناسب نہیں ہے۔تمہیں ابھی غسل سے فارغ ہو جانا چاہیئے۔''

پھر اس نے ایک اُردہ بیگنی کو حکم دیا۔''چولہا جلایا جائے۔''

یہ حکم سنتے ہی سب کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔جہاں آراء نے تڑپ کر کہا۔''بابا جانی! ابھی رہنے دیں۔ہم دو گھڑی بعد غسل کریں گے۔''

باپ نے کہا۔''ہم کہہ چکے ہیں۔سہ پہر کو غسل کرنا مناسب نہیں ہے۔ابھی دو پہر ہے۔فوراً غسل سے فارغ ہو جاؤ۔''

پھر اس نے گرجتے ہوئے اردہ بیگنی سے کہا۔ ''کیا تم نے ہمارا حکم نہیں سنا.....؟''

وہ دوڑتی ہوئی دیگ کے پاس آگئی۔ اس کے نیچے لکڑیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ شعلے یکبارگی بھڑک اٹھے۔ جہاں آراء کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ جلن محسوس ہوتے ہی چیخ پڑے گا۔

چند روز پہلے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس پر خواہ کتنا ہی تشدد کیا جائے۔ وہ اپنی زبان پر کبھی جہاں آراء کا نام نہیں لائے گا۔ اس کی نیک نامی پر حرف نہیں آنے دے گا۔ وہ کبھی سوچ بھی سکتا تھا کہ تشدد اس طرح بھی کیا جائے گا۔ وہ پانی میں گردن تک ڈوبا بیٹھا تھا۔ اوپر ڈھکن رکھا ہوا تھا۔ دیگ کے اندر جتنی ہوا تھی اسی میں سانسیں لے رہا تھا۔ پھر یہ کہ نیچے بھڑکتے ہوئے شعلے' پانی کی حرارت کو دم بہ دم تیز کرتے جا رہے تھے۔ آہ..! عشق کیسے کیسے امتحانوں سے گزرتا ہے؟

جہاں آراء نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بابا جانی...! آپ جائیں۔ پانی گرم ہو رہا ہے۔ ہم غسل سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔''

بیٹی اسے ٹالنا چاہتی تھی اور باپ ٹلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم بہت پریشان ہو۔ یقیناً بھائی کے لئے فکر مند ہو۔''

''جی۔ جی ہاں۔ پتہ نہیں دارا شکوہ کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟''

اس نے پھر چور نظروں سے دیگ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد پوچھا۔ ''کیا اُن کے بارے میں کوئی اطلاع مل رہی ہے؟''

''ہاں۔ وہ مچھلی پٹن میں ہے۔ ہم نے وہاں کے مہاراجہ کو حکم دیا ہے' وہ اورنگزیب سے بات کرے اور دونوں بھائیوں میں صلح کرانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔''

وہ باتوں میں وقت گزار رہا تھا۔ جہاں آراء تقریباً مایوس ہو چکی تھی۔ پانی اس قدر کھول گیا تھا کہ وہ اس کھولتے پانی میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شائد زندگی کی سانسیں مل رہی ہوں۔ اگر بابا جانی اب بھی یہاں سے ٹل جائیں تو اسے بچایا جا سکے گا۔

ویسے اب بہت وقت گزر چکا تھا۔ وہ عاشق نامراد زبان کا پکا اور محبت کا سچا ثابت ہوا۔ اس نے کھولتے ہوئے پانی میں زندہ پکتے ہوئے حلق سے چیخ نکالنا تو دور کی بات ہے۔ زبان سے اُف تک نہیں کی۔ شائد ہی دنیا کے کسی عاشق کو اس طرح زندہ پکایا گیا ہوگا۔

شاہجہاں نے بیٹی سے کوئی شکایت نہیں کی۔ اس کے آگے کسی غلطی' کسی گناہ کا ذکر کر کے اسے شرمندہ نہیں کیا۔ اس نے بڑی خاموشی سے ایک کو سزا دی اور دوسری کو عبرت حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد جہاں آراء میں اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ دیگ کے پاس جاتی۔ وہاں کی خاموشی بتا رہی تھی کہ ایک عاشق نامراد اپنی زندگی کا آخری غسل کرتے کرتے موت کی آغوش میں جا چکا ہے۔

جہاں آراء نے دور ہی سے دیگ کی طرف دیکھا۔ پھر جہاں کھڑی ہوئی تھی' وہیں چکرا کر گر پڑی۔ ایسے عشقیہ واقعہ کو کئی مسلمان مؤرخین تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ہندو اور بیرونی ممالک کے مؤرخین کو یہ الزام دیتے ہیں کہ وہ ایسے من گھڑت واقعات پیش کر کے مسلمان شہزادیوں اور بیگمات کی کردار کشی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب کے مؤرخین نے اپنے اپنے مذہبی جذبات کے مطابق تاریخی سچائیوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ ہندو اپنی رانی اور مہارانیوں کو اپسرا اور ستی ساوتری بنا کر پیش کرتے ہیں اور راجاؤں' مہاراجاؤں کو دیوتا کا اوتار کہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان مؤرخین مسلمان شہزادیوں اور بیگمات کو غلطیوں سے پاک نیک اور پارسا ثابت کرتے رہے ہیں۔ حکومت حاصل کرنے کے لئے بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کیا۔ اس کے باوجود یہ لکھتے رہتے ہیں کہ بادشاہوں پر سات پیروں ولیوں کا سایہ ہوتا ہے۔

شاہی خاندان کے افراد کچھ اور نہیں انسان ہی ہوا کرتے تھے۔ وہ بادشاہ' شہزادے' شہزادیاں اور بیگمات سب ہی انسانی فطرت کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔ ان کی تصویر کا ایک رُخ اچھا ہوتا تھا تو دوسرا نہایت ہی برا ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ ایک پہلو

سے نیک ہوتے تھے تو دوسرے پہلو سے گناہگار بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ سیاسی مصلحتوں کی بناء پر اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو دوسرے بادشاہوں کی جھولیوں میں ڈال دیا کرتے تھے۔ غیر مذہب کی راجکماریوں کو اور رانیوں کو اپنی بیوی اور بہو بنا کر لے آتے تھے۔ اپنی حکومت اور اقتدار کی بقاء سب سے اہم ہوتی تھی۔ مذہب اور دھرم کی اہمیت ثانوی ہوا کرتی تھی۔

شاہجہاں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کی بناء پر دونوں بیٹیوں جہاں آراء اور روشن آراء کی شادیاں نہیں ہونے دیں۔ یہ طے کیا کہ کسی ایک شہزادے کی تخت نشینی کے بعد ان کی شادیاں کی جائیں گی۔ لیکن اورنگزیب نے بھی تخت نشین ہو کر حکومت سنبھالنے کے بعد ان کی شادیاں نہیں ہونے دیں۔ جبکہ وہ روشن آراء کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی ہمراز تھی اور ہمیشہ برے وقت میں اس کا ساتھ دیتی آئی تھی۔ لیکن حکومت کرنے والوں کے نزدیک یہ محبتیں، یہ رشتے داریاں اور لہو کے رشتوں کی کشش جیسی باتیں محض جذباتی ہوا کرتی ہیں۔

☆☆☆

اورنگزیب نے مراد بخش کو بہلا پھسلا کر اس سے اتحاد قائم کیا تھا۔ اسے سبز باغ دکھائے تھے کہ دہلی کے تخت پر وہی بیٹھے گا۔ مراد بخش یہ دیکھتا آیا تھا کہ اورنگزیب شاہی طرز زندگی کا عادی نہیں ہے۔ سیدھے سادے لباس میں رہتا ہے۔ پانچوں وقت کا نمازی ہے۔ شراب و شباب سے تنفر رہتا ہے۔ لہٰذا اس نے یقین کر لیا کہ جب وہ تخت نشین ہو گا تو اس کے بعد اورنگزیب فقیری زندگی گزارنے لگے گا۔

مراد بخش کی بہتری چاہنے والے مصاحبین نے اسے سمجھایا کہ اورنگزیب فریب ے رہا ہے۔ اسے بھائی کی باتوں میں آ کر دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ لیکن وہ اورنگزیب سے تحاد توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ایک بھائی سلطان شجاع کا انجام دیکھا تھا۔ اس نے تحد ہونے سے انکار کیا تھا اور تنہا شاہی لشکر کا مقابلہ کرنے کے بعد فرار ہو کر کہیں منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔ اگر وہ بھی اورنگزیب سے الگ ہونا چاہتا تو اس کا لشکر آدھے سے بھی کم رہ جاتا۔ فی الوقت اس کی فوجی قوت کے آگے سب ہی سر جھکا رہے تھے۔

مراد بخش ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے تخت پر بیٹھنے سے پہلے

ہی اس کے حمایتیوں اور مخالفین سب ہی نے اسے ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ اورنگزیب نے ایک رات اس کے لئے عیش و طرب کی محفل کا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھانے کے بعد بولا۔ ”اب تو یہاں رقص و نغمہ، طاؤس و رباب ہو گا۔ شراب کا دور بھی چلے گا۔ آپ تو جانتے ہیں، ہم ایسی محفلوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ہمیں اجازت دیں اور آپ یہاں عیش کریں۔“

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ مراد بخش امراء اور دیگر مصاحبین کے ساتھ عیش و طرب میں مست ہونے لگا۔ رقص و نغمہ تھا۔ قیمتی شراب تھی اور پھر آنے والیاں بڑی ہی نازک اندام اور اداؤں سے بھرپور تھیں۔ وہ پیتا چلا گیا۔ پھر اتنی پی کہ مدہوش ہو گیا۔

اورنگزیب کے حکم سے اس کے ساتھ آنے والے مصاحبین اور محافظوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مراد بخش نشے میں پورا اپنے آپ سے غافل فرش پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اورنگزیب نے آ کر اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”چل اٹھ نامراد! کیا حکومت کرنے والے ایسے غافل اور بے دست و پا ہوتے ہیں؟“

اس نے دوسری ٹھوکر ماری تو مراد نے درد سے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ مدہوشی میں اسے کچھ دکھائی دیا۔ کچھ سمجھ میں آیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اورنگزیب نے کہا۔ ”ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے۔ مگر تُو اس اُم الخبائث کو منہ لگاتا ہے۔ غیر عورتوں کی صحبت سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن تُو ان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ مسلمان ہو کر کافروں جیسی زندگی گزارتا ہے۔ تُو قابلِ گردن زدنی ہے۔ ہرگز حکمران بننے کے لائق نہیں ہے۔“

اس نے پھر اسے ٹھوکر مارتے ہوئے حکم دیا۔ ”اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سلیم گڑھ کے قلعے میں پہنچاؤ اور وہاں تہہ خانے میں لے جا کر ڈال دو۔ اسے کبھی سورج کی روشنی نظر نہ آئے۔“

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ شہنشاہ بننے کا خواب دیکھنے والے کو اس قلعہ کے تہہ خانے میں پھینک دیا گیا۔ پھر وہ اپنی آخری سانسوں تک وہاں سے باہر نہ نکل سکا۔

تخت و تاج کے راستے میں تین بھائی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اُن میں سے مراد

بخش کو توٹھکانے لگادیا گیااور سلطان شجاع شکست کھانے کے بعد ایسے نابود ہوا تھا کہ پھر اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔اس کی موت وحیات کے متعلق مختلف مؤرخین نے مختلف روایات بیان کی ہیں۔مختصر یہ کہ وہ بدنصیب شہزادہ اپنے شاہی خاندان میں کبھی واپس نہیں آیا۔

اب تیسرا اور آخری بھائی داراشکوہ رہ گیا تھا۔وہ بدترین حالات سے گزر رہا تھا۔دربدری میں یہ حالت تھی کہ اس کے پاس ایک خیمہ تک نہ تھا۔اس کی بیگم اور دوسری عورتیں صرف ایک قناعت کی آڑ میں رہا کرتی تھیں۔ان دنوں فرانس کا مشہور سیاح برنیئر اس کے ہمراہ تھا۔برنیئر ایک مشہور ومعروف ڈاکٹر تھا۔اورنگزیب کے امیر دانشمند خاں کے طبیبوں میں رہ کر شاہی خاندان کے افراد کا علاج کیا کرتا تھا۔اس نے داراشکوہ کی پُر مصائب زندگی کے چشم دید واقعات لکھے ہیں۔

داراشکوہ کو کہیں ایک جگہ مستقل آرام کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔جہاں وہ ایک قنات کے سائے میں اپنی بیگمات کے ساتھ تھا۔وہاں یہ خبر پہنچی کہ اورنگزیب کا ایک لشکر اس کی طرف چلا آرہا ہے۔مستورات یہ سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔داراشکوہ عجیب پریشانی اور مایوسی کی حالت میں تھا۔خاموشی سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ آئندہ کیا کرنا چاہئے؟

اس کے ساتھ جو چند مصاحبین اور مسلح سپاہی تھے وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر جانے لگے۔بیگمات کی سواری کے لئے صرف ایک بیل گاڑی تھی۔وہ ان کے ساتھ وہاں سے آگے جاکر کہیں دوسری پناہ گاہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔برنیئر تین دنوں تک اس کے ساتھ رہا۔شہزادہ رات دن بلاتوقف آگے بڑھتا جاتا تھا۔گرمی بڑی شدت کی تھی اور اس قدر گرد و غبار اڑتا تھا کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔اس کی ایک بیگم سخت بیمار تھی اور ڈاکٹر برنیئر اس کا علاج کر رہا تھا۔آخر اس نے بھوک پیاس سے تنگ آکر سفر کی تھکان سے مجبور ہو کر کہا۔"صاحب عالم!مجھے اب رخصت ہونے کی اجازت دیں۔میں آپ کے ساتھ آگے نہیں جاسکوں گا۔"

داراشکوہ نے بڑی عاجزی اور بے بسی سے کہا۔"سب ہی نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔تم بھی جانا چاہتے ہو؟"

"انسان کی زندگی میں ایسے حالات پیش آتے ہیں۔جب اپنے پرائے سب ہی

ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ایسے وقت صرف خدا ساتھ ہوتا ہے۔آپ اپنے خدا پر بھروسہ کریں۔میں آپ کے لئے دعا کروں گا۔"

برنیئر راستہ بدل کر دہلی کی سمت چلا گیا۔داراشکوہ ٹھٹھہ کی طرف جا رہا تھا۔احمد آباد اور ٹھٹھہ کے درمیان جو ریگستان ہے وہ بہت وسیع وعریض ہے۔بعض لوگ منظم قافلے کے ذریعہ ہی اس ریگستان کو عبور کر پاتے ہیں۔جبکہ وہ اپنی بیگمات کے ساتھ تنہا ہو گیا تھا۔اس خانماں برباد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ریگستان کی چلچلاتی ہوئی دھوپ' گرمی اور بھوک پیاس نے اس کی کئی عورتوں کو ابدی نیند سلادیا۔بیل گاڑی کا ایک بیل بھی راستے میں مر گیا۔

وہ سخت جان تھا۔کسی طرح ایک بیل کے ذریعہ گاڑی کا ہانکتا ہوا۔ٹھٹھہ پہنچ گیا۔وہاں قلعے کے سردار نے داراشکوہ اور اس کی بیگمات کو بہت ہی بری حالت میں دیکھا تو رحم کھا کر اپنے پاس پناہ دے دی اور وعدہ کیا کہ اورنگزیب کو اس کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دے گا۔

اورنگزیب کو یقین تھا کہ وہ کسی وقت بھی داراشکوہ کی گردن دبوچ سکے گا۔لہٰذا اس نے مراد بخش کو ٹھکانے لگانے کے بعد دہلی کا رخ کیا۔شاہجہاں قلعے میں تھا۔اس نے اپنے لشکر جرار کے ساتھ محاصرہ کیا۔اسے مجبور کیا کہ وہ قلعے کی تمام کنجیاں بیٹے کے حوالے کر دے۔

شاہجہاں بے دست و پا ہو گیا تھا۔سب لوگ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔قلعے میں جو فوج دریچہ خاص کی محافظ تھی۔وہ بھی اسے تحفظ نہیں دے سکتی تھی۔اس نے مجبور ہو کر تمام کنجیاں اورنگزیب کے حوالے کر دیں۔

اس نے جہاں آراء اور شاہجہاں کو دوسری بیگمات سمیت محل سرا کی چار دیواری میں محدود کر دیا۔وہاں کے دروازے چنوا دیئے گئے تا کہ شاہجہاں کا کوئی خیر خواہ اس سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھ سکے۔

جب شاہجہاں قیدی بن کر رہ گیا تو تمام امراء اور اراکینِ دربار اورنگزیب کے سامنے تسلیمات کے لئے حاضر ہو گئے۔اس بے چارے بوڑھے اور مظلوم بادشاہ کی حمایت میں کسی امیر نے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلائے۔کسی نے چھوٹے منہ اس کی حمایت میں

ایک لفظ بھی نہ کہا۔ دنیا چڑھتے سورج کی پوجا کرتی ہے۔ان سب نے اورنگزیب کی اطاعت قبول کرلی۔

اس کے بعداس نے ٹھٹھہ کارخ کیا۔وہاں قلعے کا سردار اپنے لشکر کے ساتھ باہر نکل آیا۔اورنگزیب کے پاس قاصد کو بھیجا اور کہا کہ وہ داراشکوہ کو اس کے حوالے نہیں کرے گا۔لہٰذا وہ شہزادے کی جان بخش دے اور یہاں سے واپس چلا جائے۔

لیکن وہ واپس جانے کے لئے نہیں آیا تھا۔داراشکوہ کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔لہٰذا جنگ چھڑ گئی۔اگرچہ سردار کے سپاہیوں نے بڑی جی داری سے مقابلہ کیا۔لیکن اورنگزیب کے لشکر جرار کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔پھر قلعے کے اندر بھی کچھ سازشیں ہو رہی تھیں۔وہاں کچھ ایسے افراد تھے'جو داراشکوہ کو اورنگزیب کے حوالے کر کے انعام وکرام حاصل کرنا چاہتے تھے۔لہٰذا اس بار اس بدنصیب کو وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہیں ملا۔اسے گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔

اورنگزیب نے حکم دیا کہ داراشکوہ کو ایک میلے کچیلے ہاتھی پر بٹھا کر پورے شہر میں گھمایا جائے۔اسے جس قدر ذلیل کیا جاسکتا ہے' کیا جائے۔

اس بدنصیب شہزادے نے ہزار مصائب برداشت کرنے کے بعد یہ ذلتیں بھی برداشت کیں۔اس کا آخری وقت آ چکا تھا۔اسے قلعے میں لا کر بہ حکمِ شہنشاہ اورنگزیب اس کا سرتن سے جدا کر دیا گیا۔پھر اس سر کو سونے کے ایک صندوقچے میں رکھ کر شاہجہاں کے پاس بھیج دیا گیا۔

بوڑھا معذول بادشاہ اگرچہ جہاں آراء کے ساتھ قلعے میں شاہانہ عیش وآرام کے ساتھ تھا۔مگر حقیقتاً قیدی بنا ہوا تھا۔اس ایک بیٹی کے سوا کوئی اس کے قریب نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی وہ باپ بیٹی کسی تیسرے کا منہ دیکھ سکتے تھے۔جو اُردہ بیگمیاں اور خواجہ سرا ان کے خدمت کے لئے آتے تھے' وہ گونگے بنے رہتے۔ان باپ بیٹی کی ضروریات پوری کرنے کے بعد چپ چاپ وہاں سے چلے جاتے تھے۔

ایسے وقت اورنگزیب کے ایک خاص خواجہ سرا نے چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں حاضر ہو کر شاہجہاں کے آگے سونے کا وہ صندوقچہ رکھا۔پھر کہا۔"ظلِ سبحانی شہنشاہ

اورنگزیب نے آپ کے لئے یہ تحفہ ارسال کیا ہے۔اور عرض کیا ہے' گر قبول اُفتد زہے عزو شرف....."

شاہجہاں نے اس صندوقچے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔جہاں آراء نے آگے بڑھ کر اسے کھولا تو یکبارگی چیخیں مارتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔اپنے جان سے زیادہ عزیز بھائی کی صورت دیکھی نہیں گئی۔وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

شاہجہاں کے دیدے پھیل گئے تھے۔وہ ایک ٹک اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔اس کے پیچھے اس کی ممتاز محل کا چہرہ صاف طور پر جھلک رہا تھا۔وہ چکرا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔"یا خدا! کیا یہ دن دیکھنا بھی ہمارے نصیب میں لکھا تھا؟

آہ ممتاز! کیا آپ دیکھ رہی ہیں' ہمارا اور آپ کا لہو کیسے پانی کی طرح بہہ چکا ہے؟

ہائے ممتاز! ہم نے آپ کے پیار میں محبت کی انتہا کر دی۔تاج محل کی صورت میں ایک انمول اور نایاب تحفہ دیا۔مگر آپ کی اولاد نے ہمیں کیا دیا؟ ایک بیٹے کا بُریدہ سر....آہ!"

وہ سر پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

دیکھا جائے تو پچھلے تمام واقعات کی روشنی میں اورنگزیب عالمگیر ایک نہایت ہی ظالم اور سنگدل شخص تھا۔ہندو اور یورپی مؤرخین نے اس پر جو الزام عائد کئے وہ یہ ہیں کہ اس نے باپ کو قید کیا۔بھائیوں کو قتل کرایا۔دکن کی اسلامی ریاستیں مٹا دیں۔ہندوؤں کو ستایا۔بت خانے ڈھا دیئے۔مراٹھوں سے چھیڑ چھاڑ کی اور تیموری سلطنت کو کمزور بنا دیا۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر پہلے تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ اسی خاندان کے پچھلے دوسرے تمام بادشاہوں نے کیا کیا؟

جو شاہجہاں اپنے سربُریدہ بیٹے کی میت دیکھ کر رو رہا تھا۔اس نے خود اپنے بھائی شہریار کو قتل کرایا تھا اور ایک بھائی خسرو کے بیٹے دلاور بخش عرف بلاقی کو اور اپنے مرحوم چچا دانیال کے دونوں بیٹوں طہورث اور ہوشنگ کو بھی قتل کرا دیا۔

اس سے پہلے جہانگیر نے نور جہاں کو حاصل کرنے کے لئے شیر افگن کو بڑی بے

دردی سے قتل کرایا تھا۔ اس ظالم نے ایک سبزہ خط جوان کو اپنا منظورِ نظر بنایا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ جوان اپنے کسی دوسرے عاشق کے ساتھ فرار ہو رہا ہے تو اس نے اس نوجوان کے ساتھ اس کے عاشق کو بھی زندہ رکھ کر ان کی کھالیں کھنچوادیں۔

اس سے بھی پہلے کامران اور عسکری اگرچہ ہمایوں کے سوتیلے بھائی تھے۔ مگر وہ سب ایک ہی باپ کی اولاد تھے۔ لیکن اس نے ان دونوں کو بھی قتل کروادیا تھا۔

یہ حکومت کرنے کے رمزواسرار ہیں۔ جب تک اپنے مخالفین کو' خواہ ان سے خون کا رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں کچل نہ دیا جائے' تب تک حکومت' طاقت اور اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر آباؤاجداد نے ایسا کیا ہے تو ان کے جانشین کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ لیکن سیاسی تقاضے مجبور کرتے ہیں۔ اگر سانپوں کو ڈسنے سے پہلے مارا نہ جائے تو اپنی موت لازمی ہو جاتی ہے۔

ہندو مؤرخین انتہائی نفرت سے اورنگزیب عالمگیر کو کٹر مسلمان اور انتہا پسند کہتے ہیں۔ اس پر الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ وہ ہندوؤں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اپنے دربار میں انہیں کوئی اعلیٰ عہدہ نہیں دیتا تھا۔ اس نے کئی مندر گرادیئے تھے اور کتنے ہی بت توڑ ڈالے تھے۔

ایسے الزامات عائد کرنے والے موریہ خاندان کے سمراٹ اشوک کو بھول جاتے ہیں۔ اشوک نے اپنے ننانوے بھائیوں کو قتل کرنے کے بعد تخت حاصل کیا تھا۔ اس نے کلنگ کی لڑائی میں ایک لاکھ آدمیوں کو مارا اور ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو قیدی بنایا۔ ایک بار اسے معلوم ہوا کہ حرم سرا کی کسی عورت نے اسے بدصورت کہا ہے تو اس نے اس حرم کی پانچ سو عورتوں کو زندہ جلوادیا۔

اورنگزیب عالمگیر کو انتہا پسند کہنے والے مؤرخین یہ بھول جاتے ہیں کہ اشوک کٹر بدھ مت کا پجاری تھا۔ اس نے سینکڑوں برہمنوں کو قتل کردایا تھا۔ اس کے باوجود یہ دانشور حضرات اشوک کو امن پسند اور عظیم شہنشاہ کہتے ہیں۔ آج بھی اسے سمراٹ اشوک کہہ کر بڑی عقیدت سے ہاتھ جوڑتے ہیں اور سر جھکاتے ہیں۔

اورنگزیب کے زمانے میں لفظ جزیہ کی کافی شہرت رہی۔ وہ ہندوؤں سے جو

محصول وصول کیا کرتا تھا۔ اسے جزیہ کہتے ہیں۔ اس بات پر تمام ہندوؤں' عیسائیوں اور سکھوں نے اعتراض کیا کہ صرف ان ہی سے کیوں جزیہ وصول کیا جاتا ہے؟

اورنگزیب شریعت محمدی کا پابند تھا۔ امام ابوحنیفہ کے مطابق مسلم حکومت میں جب غیر مسلم لوگ اس کی بالادستی اور اقتدار کو تسلیم کر لیتے ہیں تو انہیں ڈمی کہا جاتا ہے۔ ڈمی کے معنی ہیں کہ ان غیر مسلم لوگوں کی سماجی حفاظت' اقتصادی' مذہبی اور سیاسی نکتہ نظر سے مسلم حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کے عوض مسلم حکومت ان سے یہ محصول لیتی ہے۔ اورنگزیب عالمگیر نے شریعت کے مطابق ہندوؤں کے تحفظ کی اس طرح سے ذمہ داری لی تھی۔

اس نے ہندو رعایا اور ہندو کسانوں سے کبھی بے جا محصول اور بے جا لگان وصول نہیں کیا۔ وہ اس قدر انصاف پسند تھا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو ایک ہی قانون کے تحت سزا دیتا تھا۔

عالمگیر نے ایسے مندروں پر حملے کئے اور بت شکنی کی جن بتوں کے اندر بے بہا خزانے چھپا کر رکھے جاتے تھے یا حکومت سے بغاوت کرنے والے وہاں آکر روپوش رہتے تھے یا پھر دھرم کی آڑ میں وہاں گناہ کئے جاتے تھے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ کچھ کی آٹھ مہارانیاں کاشی وشوانا تھ میں درشن کرنے گئیں۔ ان میں سے ایک رانی نہایت ہی حسین تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہاں کے مہنتوں نے اسے اغوا کر لیا۔ کچھ کے راجہ نے اورنگزیب سے فریاد کی اور کہا۔ "اس مندر کے پجاری' پنڈت اور مہنت بہت ہی طاقت اور اثر و رسوخ والے ہیں۔ وہاں کی پوری ہندو آبادیوں کو اپنے زیر اثر رکھتے ہیں۔ پتہ نہیں' انہوں نے ہماری رانی کو کہاں چھپایا ہے؟ اگر ہم ان سے جنگ لڑیں گے تو وہاں کے تمام ہندو ہمارے خلاف ہو جائیں گے۔"

اورنگزیب نے کہا۔ "اور ہم نے ان سے جنگ کی تو یہ مسلمان بادشاہ ظالم اور متعصب کہلائے گا۔ بہرحال یہ انصاف کا تقاضہ ہے کہ ایسے سرکش مہنتوں کی سرکوبی کی جائے۔"

اورنگزیب عالمگیر نے پہلے تو اپنے نمائندوں کے ذریعے ان مہنتوں کو سمجھایا کہ وہ رانی کو کچھ کے راجہ کے حوالے کر دیں۔ لیکن انہوں نے اپنے جرم سے صاف انکار کر دیا کہ

نہ تو انہوں نے رانی کو دیکھا ہے اور نہ ہی وہ ان کے پاس ہے۔

اس نے ان کی ہٹ دھرمی سے مجبور ہو کر اس مندر پر حملہ کیا۔ مہنتوں نے مسلح سپاہیوں کا راستہ روکنے کی ناکام کوششیں کیں۔ وہاں کے تمام ہندوؤں نے زبردست احتجاج کیا۔ لیکن سپاہی دندناتے ہوئے مندر کے اندر گھس گئے۔ گمشدہ رانی کو تلاش کرنے لگے۔

اس علاقے کے تمام ہندو مندر کے باہر اورنگزیب عالمگیر کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اندر تلاش جاری تھی۔ آخر ایک بہت بڑے دیوتا کے بت کے پیچھے ایک سرنگ کا پتہ چل گیا۔

اس سرنگ سے گزرنا محال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک ناگوار قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ بدبو ایسی ناقابلِ برداشت تھی کہ صبح سے شام تک دوائیں چھڑکی گئیں۔ جب کسی حد تک بُو ختم ہوئی تو فوجی سرنگ میں داخل ہو گئے۔ وہاں کتنی ہی عورتوں کی سڑی گلی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ کی گمشدہ رانی کی برہنہ لاش بھی تھی۔ جب ان مہنتوں اور پنڈتوں پر تشدد کیا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ وہاں حسین عورتوں کو لا کر ان کی اجتماعی آبروریزی کی جاتی تھی۔

ہر مذہب کے مؤرخین اپنے مذاہب کی کمزوریوں پر پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ جبکہ اورنگزیب ہندو فریادیوں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ ایک برہمن کے گھر سے بھگوان شیو شنکر کی ایک مورتی چوری ہو گئی۔ وہ برہمن اور اس کے خاندان والے مسلمانوں پر شبہ کر رہے تھے کہ انہوں نے وہ مورتی چرا کر کہیں لے جا کر تباہ کر دی ہے۔

وہ برہمن شیو شنکر کے درشن کئے بغیر کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اورنگزیب تک یہ خبر پہنچائی کہ اس کا پتی بھوک پیاس کے باعث نیم مردہ ہو چکا ہے۔ اگر وہ مورتی نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔

بادشاہ نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اس برہمن کو شیو جی کی مورتی مل جانی چاہئے۔ اس علاقے کے مسلمانوں کا سختی سے محاسبہ کیا جائے۔

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ اسے کسی مسلمان نے نہیں چرایا تھا۔ اسی برہمن کے سالے نے اس مورتی کو چھپا کر رکھا تھا اور کوئی مناسب موقع دیکھ کر اسے اچھے داموں فروخت

کرنا چاہتا تھا۔

عالمگیر نے ایسے مندروں کو بغیر کسی تاخیر کے مسمار کر دیا' جنہیں ہندو راجاؤں نے خود مختاری حاصل کرنے کے لئے بغاوت کا اڈہ بنا لیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا۔ گول کنڈہ کی شاہی مسجد جو مرکزی مخالف عناصر کا اڈہ بن گئی تھی۔ اسے تباہ کر دیا۔ اگر اس نے ہندوؤں کو یہ حکم دیا کہ کوئی نیا مندر تعمیر نہ کیا جائے تو یہی حکم مسلمانوں کے لئے تھا کہ نئی مسجد تعمیر نہ کی جائے' جو پرانی مسجدیں ہیں۔ ان کی بہ خوبی مرمت کی جائے۔

بعض اوقات اپنے علمائے دین بھی اس سے ناراض ہو جایا کرتے تھے۔ وہ کسی کا لحاظ کئے بغیر انصاف کرتا تھا۔ اس کا فرض تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت انصاف کے تقاضے پورے کرے اور اپنے دورِ حکومت میں اسلامی شان و شوکت کو برقرار رکھے۔

مغل سلاطین اگرچہ کئی پہلوؤں سے بہترین حکمران تھے۔ لیکن ان کی حکومت کا نظام تمام تر بادشاہ پرستی پر مبنی تھا۔ شہنشاہ اکبر نے ایک درشن جھروکا بنا رکھا تھا۔ جہاں وہ روز صبح آ کر بیٹھتا تھا اور رعایا وہاں آ کر اس کے درشن کرتی تھی' اس کے آگے سر جھکاتی تھی اور سجدہ بھی کرتی تھی۔ یہ طریقہ بالکل خلافِ اسلام تھا۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس نے انسان کو ہمیشہ انسان کے درجے پر رکھا ہے۔ عالمگیر نے تخت پر بیٹھتے ہی اس سلسلے کو ختم کر دیا تھا۔

یہ کہا جاتا تھا کہ بادشاہ ایک وجودِ مافوق الفطرت ہے۔ وہ خدا کا سایہ نہیں' بلکہ خدا کا مظہر ہے۔ شہنشاہ اکبر کے سامنے رعایا سجدہ کرتی تھی۔ شاہجہاں نے سجدہ بند کرا دیا تھا۔ لیکن اپنے آگے آنے والوں کے لئے زمین بوسی قائم رکھی تھی۔ یہ بھی سجدے کی دوسری صورت تھی۔ یہ سلاطین کہا کرتے تھے کہ دنیا کا خدا تو بادشاہ ہی ہوتا ہے۔ جس طرح آسمان پر ایک خدا ہے۔ اسی طرح زمین پر بھی ایک ہی بادشاہ کو ہونا چاہئے۔

جو طریقہ تیمور کے عہد سے شاہجہاں تک تھا۔ اسے عالمگیر نے یکسر بدل ڈالا تھا۔ اس نے درشن کا طریقہ ختم کر دیا تھا۔ دربار میں جو شعراء ہوا کرتے تھے۔ وہ بادشاہ کی تعریف میں ایسے اشعار لکھتے تھے کہ ان کے ذریعہ بادشاہ کو خدا کا ہمسر بنا دیتے تھے۔ اس نے ایسے تمام شعراء کو دربار سے نکال دیا تھا۔

سلاطینِ سابق ذاتی اخراجات کے لئے ایسے علاقے اپنے لئے مخصوص کر دیتے تھے جہاں سے کرڑوں روپے کی آمدنی ہوا کرتی تھی۔اورنگزیب نے صرف چند گاؤں اپنے مصارف کے لئے مخصوص کئے۔باقی تمام کو بیت المال قرار دے دیا۔

وہ فنِ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ستار بجانے میں اسے مہارت حاصل تھی۔چونکہ گانا بجانا شرعاً ممنوع ہے اور دربارِ شاہی کی شان کے منافی ہے۔لہٰذا اس نے اس صیغہ کو بھی بند کر دیا۔ناچنے گانے والوں پر پابندی لگانے کے باعث اس پیشے سے تعلق رکھنے والے بادشاہ سے ناراض ہو گئے۔ایک بار وہ جمعہ کے دن مسجد جا رہا تھا۔راستے میں ہزاروں گویوں اور سازندوں نے ایک جلوس کی صورت میں احتجاج کیا۔انہوں نے موسیقی کے سجے ہوئے تقریباً بیس جنازے اٹھائے ہوئے تھے۔

عالمگیر نے پوچھا۔"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس جلوس کے رہنما نے کہا۔"ہم سب گویے اور سازندے ہیں۔آپ نے حکم صادر کر کے موسیقی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ہم لوگ اسے قبر میں دفنانے جا رہے ہیں۔"

یہ سن کر اورنگزیب کو غصہ آنا چاہئے تھا۔لیکن اس نے بڑے ہی تحمل سے طنزیہ انداز میں کہا۔"یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہم نے موسیقی کو ختم کیا اور تم سب اسے تدفین کے لئے لے جا رہے ہو۔لے جاؤ اور اسے اچھی طرح گہرائی میں دفن کرنا۔"

وہ اپنی گفتگو سے' اپنے لباس سے اور اعمال سے یہ ثابت کرتا تھا کہ جیسا باہر سے سادہ اور زاہدانہ زندگی گزار رہا ہے۔ویسا ہی اندر سے بھی دیندار ہے۔اس کے مصاحبین میں ایک انگریز لین پول تھا۔اس نے لکھا ہے۔

"مغلوں کی تاریخ میں یہ سب سے پہلا بادشاہ ہے' جو پکا مسلمان تھا۔تمام ممنوعات سے خود بھی پرہیز کرتا تھا اور دوسروں کو جو اس کے گرد رہتے تھے' انہیں بھی باز رکھتا تھا۔وہ ایسا بادشاہ ہو، جس نے محض مذہب کی بدولت اپنے تخت کو معرضِ خطر میں ڈال دیا۔وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میل جول سب سے زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔جو مختلف قوموں اور مختلف مذاہب کی بنی ہوئی سلطنت کو قائم رکھنے میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔

وہ ضرور اپنے پُرخطر (دین کے) راستے سے واقف ہوگا اور خوب جانتا ہوگا کہ

ہندوؤں کو دانستہ یا نادانستہ ناراض کرنا اور ایرانی عہدیداروں کو جو اس کی فوج اور اس کے دربار میں بڑے بڑے سردار تھے۔ان کی مخالفت کر کے انہیں دشمن بنا لینا۔گویا انقلابی تبدیلیوں کو خود دعوت دینا تھا۔تاہم اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔اور بڑے استقلال سے اپنی پچاس برس کی عدیم المثال فرمانروائی میں اسی راستے پر چلتا رہا اور دنیا کا راستہ اپنی قوت ایمانیہ پر بند کر دیا۔

اس کی شان و کامرانی اسی میں ہے کہ اس نے اپنی روح کو مجبور نہیں کیا اور اپنے عقائد کو پیٹھ دکھانے کی جرات نہیں کی۔ہندوستان کا دیندارِ اعظم ایسا مستقل مزاج شخص تھا کہ اس نے تاجِ شہداء جیت لیا۔"

کسی شخص میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ بادشاہ کے سامنے پہنچ سکے اور دادرسی چاہے۔بادشاہ تک اپنی فریاد پہنچانے کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں تھا۔عالمگیر نے یہ فرمان نافذ کیا کہ تمام اضلاع میں سرکاری وکیل مقرر کئے جائیں اور عام منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کو بادشاہ پر کوئی دعویٰ ہو' یا فریاد ہو تو وہ اس سرکاری وکیل سے رجوع کرے۔

اس نے حکومت اور رعایا کی صحیح حالت دریافت کرنے کے لئے پرچہ نویسی اور واقعہ نگاری کے طریقے کو نہایت وسعت دی۔اس طریقہ کار سے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے ایک ایک کونے کی خبر عالمگیر تک پہنچنے لگی تھی۔وہ جس قدر رعایا کی اصلی حالت سے خبر رکھتا تھا اور ان کے آسائش و آرام کا خیال رکھتا تھا۔کسی سلطنت میں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

اگر ہزاروں کوس پر کسی سوداگر یا کسی راہ چلتے کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی تھی تو فوراً عالمگیر کو خبر مل جاتی تھی۔پھر وہاں کے ماتحت حاکم سے اور سرکاری وکیلوں سے باز پرس شروع ہو جاتی تھی۔

اس نے زندگی کا مقصد سلطنت کے جاہ و جلال' شان و شوکت' ناز و نعم کے بجائے صرف رعایا کی خدمت اور راحت رسانی قرار دیا تھا۔وہ بوڑھا ہونے کے باوجود دربار میں کھڑے ہو کر رعایا کی عرضیاں وصول کرتا تھا اور خود اپنے ہاتھ سے ان پر حکم لکھتا تھا۔یورپ سے آنے والے سیاح ڈاکٹر جیلی کریزی نے اسے اٹھتر برس کی عمر میں دیکھا تھا۔وہ بیان کرتا ہے۔

"وہ بادشاہ سفید ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے امیروں کے جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کی پگڑی میں ایک زمرد ٹکا ہوا تھا۔ دادخواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور عینک کے بغیر انہیں پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا جاتا تھا۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی مصروفیات سے نہایت شاداں وفرحاں ہے۔"

دنیا کی تاریخ میں جائیداد اور وراثت کے لئے ہمیشہ سے جھگڑے فسادات ہوتے آئے ہیں۔ ایسے ہی تاریخی حالات سے تجربات حاصل کرتے ہوئے یورپ میں اس کا یہ حل نکالا گیا کہ جائیداد اور تخت وتاج کا وارث صرف بڑا لڑکا ہوگا۔ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے بعد بڑی حد تک تخت نشینی کے لئے خانہ جنگیاں ختم ہوگئیں۔

اسلامی معاشروں میں ایسا کوئی قانون نہیں تھا۔ اس لئے بادشاہوں کے مرتے ہی ان کے وارث شہزادے آپس میں لڑتے مرتے رہے۔ عثمانی سلطنت کے سلطان محمد فاتح نے پچاس برس سے زیادہ حکومت کی۔ اس نے یہ قانون بنادیا تھا کہ جو بھی دعویدار تخت پر قابض ہوجائے تو وہ اپنے تمام بھائیوں کو قتل کرادے تاکہ خانہ جنگی کا کوئی خطرہ نہ رہے۔

یہ سراسر ظالمانہ قانون تھا۔ حرم میں بیگمات کی بہتات کی وجہ سے بچے بھی زیادہ پیدا ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا ان سب کو قتل کرنا سراسر درندگی ہوتی۔ ایسے میں اس قانون کو تبدیل کرکے یہ فیصلہ کیا گیا کہ تخت وتاج کے دعویدار جتنے شہزادے ہوں گے۔ ان سب کو محلوں کی چار دیواری میں نظر بند رکھا جائے گا اور وہ باہر کی دنیا دیکھے بغیر ایک قیدی کی طرح زندگی گزارتے رہیں گے۔

تیموری خاندان میں خانہ جنگی سے بچنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سلطنت کو بھائیوں میں تقسیم کردیا جائے۔ لہٰذا ہمایوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے اپنے تین بھائیوں کامران، عسکری مرزا اور ہندال کو مختلف علاقے حکمرانی کے لئے عطا کئے تھے۔ اس کے باوجود ان بھائیوں نے سازشیں کیں اور ہمایوں کو کبھی سکون سے بیٹھنے نہیں دیا۔

شہنشاہ جلال الدین اکبر نے بھی یہی کیا۔ مختلف شہزادوں کو مختلف علاقے بخش دیئے۔ لیکن وہاں کے تمام اختیارات اپنے پاس رکھے اور مغل شہزادوں کو اعلیٰ مناصب دے

کر انہیں سلطنت کا ملازم بنادیا۔ لیکن یہ تدبیر بھی کام نہیں آئی۔ اس کے بیٹے جہانگیر نے اپنے ہی بیٹے خسرو کی بغاوت کو کچلتے ہوئے اسے موت کی آغوش میں پہنچادیا۔

شاہجہاں نے بادشاہ بننے کے بعد تمام تخت کے دعویداروں کو قتل کرادیا۔ ان کے قتل کرانے کا یہ اخلاقی جواز تھا کہ اس کی وجہ سے خون ریزی اور قتل وغارت گری نہیں ہوگی۔ جب دعویدار شہزادے نابود ہوجائیں گے تو ان کی فوجیں آپس میں نہیں لڑیں گی۔ تخت وتاج حاصل کرنے کے لئے سیاسی مقاصد کس طرح اخلاقی بن جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ایسے دلائل سے لگایا جاسکتا ہے۔

اورنگزیب عالمگیر کو مغل سلطنت کا آخری بادشاہ کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جو بھی جانشین آئے وہ بالکل ہی نااہل تھے۔ ظہیر الدین بابر سے لے کر محی الدین اورنگزیب عالمگیر تک ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ صرف اورنگزیب نے اپنا بڑھاپا آرام وسکون سے گزارا۔ ورنہ تمام بادشاہ بڑھاپے میں اپنے شہزادوں کے باعث بیمار اور فکرمند رہے۔ ان کی وجہ سے انہوں نے اپنی آخری عمر قید تنہائی اور حبس بے جا میں گزاری۔

وہ اپنے آباؤ اجداد کے زمانے سے یہ تماشہ دیکھتا آیا تھا کہ شہزادے تخت وتاج کی ہوس میں کس طرح خون کے رشتوں کو بھول جاتے ہیں؟ خود اس نے بھی دوسرے شہزادوں کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اس لئے اس کی طبیعت میں شکوک وشبہات بہ درجہ اتم تھے۔ وہ اپنی کسی اولاد پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اندر اندر ہی ان سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اولاد بھی اس سے خوفزدہ رہتی تھی۔ تقریباً پچاس سال تک حکومت کرنے کے باوجود اس نے اپنے کسی بیٹے کو سلطنت کے معاملات میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کی کڑی نگرانی کرتا رہا اور ایک گہرے سائے کی طرح ان پر چھایا رہا۔

ایسے طریقہ کار سے اس کا بڑھاپا آرام سے تو گزر گیا۔ لیکن نااہل شہزادوں کے تخت نشین ہونے کے بعد مغل سلطنت تیزی سے زوال کی طرف جاتے ہوئے نابود ہوگئی۔ وہ اپنے آخری ایام میں جسمانی طور پر بہت ہی کمزور ہوگیا تھا۔ بستر پر پڑا رہتا تھا۔ ایسی طویل تنہائی اور خاموشی میں انسان چپ چاپ پڑا رہ کر اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے کہ اس نے زندگی میں

کیا پایا اور کیا کھویا....؟

خوابگاہ کی خاموشی اور تنہائی میں جیسے اس کا ہمزاد سامنے آ کر کہتا تھا۔"تمہاری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تم غیر مسلموں کے دشمن تھے۔ اتنے انتہا پسند مسلمان رہے کہ ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر انہیں مسلمان بننے پر مجبور کرتے رہے۔"

بستر پر پڑا ہوا اورنگزیب کہتا تھا۔"یہ سراسر ہم پر الزام ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ محبت اور رواداری سے دلوں میں جگہ بناتا رہا۔

ایک بار بندھیرا کے راجہ نے ہمارے بابا جانی کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اسے قیدی بنا کر دربار میں پیش کیا گیا۔ ان دنوں ہم دکن کے صوبیدار تھے۔ ہم نے ان سے استدعا کی کہ راجہ اِندرامن کی غلطیوں کو معاف کر کے اسے رہا کیا جائے۔

بابا جانی نے لکھ بھیجا کہ اِندرامن نے پے درپے ہمیں تکلیف پہنچائی ہے۔ یہ سرکشی سے باز نہیں آتا ہے۔ تم کہتے ہو تو اسے اس شرط پر رہا کیا جاسکتا ہے کہ یہ اسلام قبول کرلے۔

ہم نے اس بات کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ ایسا کرنا ناجائز اور تنگ نظری ہے۔ کوئی بھی خوفزدہ ہو کر اسلام قبول کرسکتا ہے۔ مگر دل سے مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ایک خدا کو اور آخری رسول ﷺ کو دل سے ماننے والا ہی صحیح معنوں میں مسلمان ہوسکتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ بابا جانی نے ہماری بات مان لی تھی اور راجہ پر جرمانہ عائد کر کے اسے رہا کر دیا تھا۔"

(یہ ایک تاریخی حسیقت ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کا یہ خط آدابِ عالمگیری یہ قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے)

عالمگیر کا ہمزاد بسترِ علالت کے پاس آ کر پوچھتا تھا۔"تم نے ہندوؤں کے ساتھ اور کیسا سلوک کیا؟"

عالمگیر نے بڑی نقاہت سے جواب دیا۔"کالانور کے پاس دیپال وال نامی ایک گاؤں ہے۔ وہاں شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے۔ ان بزرگ سے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں، ہندوؤں کو بھی بڑی عقیدت ہے۔ ایک دیپالی نام کے ہندو کو ان سے اس درجہ

عقیدت تھی کہ وہ دن رات اس مزار کی صفائی ستھرائی میں لگا رہتا تھا۔ اس کی عقیدت مندی دیکھ کر ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی متفقہ رائے سے اسے مزار کا متولی بنا دیا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مسلمانوں نے مذہب کی آڑ لے کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور اس ہندو کو نظامت کے عہدے سے ہٹانا چاہا۔ جب یہ خبر ہم تک پہنچی تو ہم نے ان شر پسند مسلمانوں کا محاسبہ کیا اور یہ حکم صادر کیا کہ اسی ہندو دیپالی کو مزار کا متولی رہنے دیا جائے۔

یہ واقعہ ہماری حکومت کے تیسرے سال پیش آیا تھا۔ منشی سبحان رائے اس وقت کا تاریخ نگار تھا۔ اس نے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔

ہم نے بنارس کے ایک ساکن جگ جیون کے لڑکے گردھر کو، مہیش پور پرگنہ حویلی کے ایک یدوناتھ مصر کو اور پنڈت بلبدر مصر کو جاگیریں عطا کیں۔ یہ سب کے سب مندر کے پجاری تھے۔"

اس کے ہمزاد نے پوچھا۔"تم اپنی صفائی میں اور کیا کہنا چاہو گے؟"

اس نے جواب دیا۔"نہ ہم پیغمبر ہیں، نہ ولی ہیں، نہ کبیر ہیں، نہ نانک ہیں۔ ہم تو صرف ایک حکمران رہے۔ ہمارے اندر دھنک کے سات رنگوں کی طرح سرخ، سبز، نیلا، پیلا ہر رنگ موجود ہے۔ ہم چاہتے ہیں، لوگ ہمیں فرشتہ نہ کہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی غلطی ہوگی اور ہمیں شیطان کہہ کر اس سے بھی بڑی غلطی نہ کریں۔ ہم پیدائشی انسان ہیں۔ خوبیوں اور خامیوں کو مجموعہ ہیں۔ ہمیں ایک انسان ہی سمجھا جائے۔"

عالمگیر کے ہمزاد نے سوال کیا۔"تم نے خواجہ سراؤں کو اپنے محل میں تو رکھا لیکن محل سرا سے نکال دیا۔ بیگمات اور شہزادیوں کو ان سے پردہ کرایا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

اس نے کہا۔"ایک نہایت ہی ذی رتبہ خواجہ سرا دیدار خاں نے دہلی میں اپنا ایک مکان بنوایا تھا۔ جہاں وہ کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات رات کو وہیں سو جایا کرتا تھا۔ اس کے پڑوس میں ایک ہندو رہتا تھا۔ جو عرائض نویسی کا کام کرتا تھا۔ اس کی بہن بہت ہی خوبصورت تھی۔ خواجہ سرا دیدار خاں اس پر عاشق ہو گیا۔ چونکہ وہ خوجہ تھا۔ اسے گھروں میں آنے جانے سے کوئی روکتا نہیں تھا۔ اس لئے اس کی بہن سے ناجائز تعلقات قائم ہو گئے۔"

ہمزاد نے پوچھا۔" بھلا ایک خواجہ سرا سے ناجائز تعلقات کیسے قائم ہو سکتے ہیں؟"

اس نے کہا۔" جانور کو خصی کیا جائے تو وہ بیچارہ غریب اور سیدھا ہو جاتا ہے۔ مگر انسان کسی حال میں بھی سیدھا نہیں رہتا۔ ایک مرد کو خواجہ سرا تو بنایا جا سکتا ہے۔ مگر نامرد نہیں بنایا جا سکتا۔ کسی کو گناہ سے روکو تو وہ گناہ کرنے کے لئے دوسرے کئی چور راستے نکال لیتا ہے۔

خواجہ سرا ایک پہلو سے محروم ہونے کے باوجود دوسرے کئی پہلوؤں سے فعال رہتے ہیں۔ ان میں بھی حسن نظر ہوتا ہے۔ وہ بھی کسی نازک اندام حسینہ کو دیکھ کر چھونے اور اسے جکڑنے کی خواہش دل ہی دل میں کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی حسینہ بھوکی ہو اور اسے کھانے کو پوری روٹی نہ مل رہی ہو تو آدھی سے گزارہ لیتی ہے اور کبھی دو چار لقموں سے بھی تسلی ہو جاتی ہے۔

اس پڑوسی نے ایک رات اپنی بہن کو اس خواجہ سرا دیدار خاں کے ساتھ سوتے دیکھ لیا اور اسی وقت ان دونوں کو قتل کر دیا۔ بادشاہوں کی تاریخ لکھتے وقت ایسی باتوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہی ہے کہ بادشاہ شادیوں پر شادیاں کرتا جاتا ہے اور حرم سرا میں کنیزوں کا میلا لگائے رکھتا ہے۔ آخر وہ کتنوں کی بھوک پیاس مٹاتا ہوگا؟ شاہوں کی غلطیوں سے گناہ کے جو راستے کھلتے ہیں۔ ان راستوں کو بند کرنے کے لئے خواجہ سراؤں کو پہریدار بنایا جاتا ہے۔

وہ خواجہ سرا اور اُردہ بیگنیاں حرم سرا کی کنیزوں' شہزادیوں اور بیگمات سے بھاری رشوتیں لے کر کیا گل کھلاتی رہتی ہیں؟ کس طرح گناہ کے راستے ہموار کرتی ہیں؟ ان حقائق کو اس دور کے تاریخ نگار نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح گناہ پر پردہ تو پڑ جاتا ہے۔ مگر وہ در پردہ جاری وساری رہتا ہے۔

یہ دنیا دیکھ رہی ہے کہ ہماری حرم سرا میں صرف بیگمات اور شہزادیاں ہیں۔ ہم نے اپنے لئے کبھی کوئی کنیز نہیں رکھی۔ نہ ہمیں شراب سے رغبت رہی' نہ شباب سے۔ اسی لئے ہم نے تمام خواجہ سراؤں کو محل سے نکال دیا ہے۔

ایک سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ دین اسلام کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے بیگمات کی مقررہ تعداد تک محدود رہا جائے۔ کسی نامحرم سے کبھی

رجوع نہ کیا جائے تو گناہ کے راستے خود بخود بند ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ بادشاہوں اور شہزادوں کو ہر حسین عورت اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس لئے وہ ہوس کے مارے اپنی حرم سرا میں ان کا ذخیرہ کرتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے' ہم نے ایسی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔"

اس کے ہمزاد نے کہا۔" تم کہتے ہو کہ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی کنیز نہیں آئی۔ یہ جھوٹ ہے۔ یاد کرو' کیا تم نے اسے بھلا دیا ہے؟ اپنے ماضی کی طرف گھوم کر دیکھو.....!"

اورنگزیب عالمگیر نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک حسینہ مسکرا رہی تھی۔ بڑی ہی رس بھری آواز میں گنگنا رہی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر بولا۔" وہ بڑی ہی مترنم آواز میں گاتی تھی۔ اس کی سریلی آواز کانوں سے سیدھی دل میں اترتی تھی۔

آہ ہمارے ہمزاد! تم نے عمرِ رفتہ کو آواز دی ہے۔ ہم کیا بتائیں کہ وہ رقاصہ نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کہاں سے رقص سیکھ لیا تھا؟ جب وہ سُر تال کے مطابق بدن کے زاویئے پیش کرتی تھی تو ہم اس کے تھرکتے ہوئے بدن کو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا' کہاں سے دیکھیں اور کہاں سے چھوڑیں؟

یہ الزام غلط ہے کہ ہم نے اسے کنیز بنایا۔ وہ ہماری نہیں بلکہ ہماری خالہ جان (ملکہ بانو) کی کنیز تھی۔ ہم نے خالہ جان کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کی تھی۔ وہاں سے جلد چلے آنا چاہتے تھے۔ لیکن انہوں نے کہا۔" صاحب عالم! ہماری ایک کنیز ایسا ناچتی اور گاتی ہے کہ دیکھنے والے داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم جانتے ہیں' آپ کو ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ پھر بھی ہمارے کہنے پر اسے ایک بار ضرور دیکھیں۔"

ہائے.....اور جب ہم نے اسے گاتے اور رقص کرتے دیکھا تو ہائے کہہ کر دل تھام لیا۔ وہ ہماری شہزادگی کا زمانہ تھا۔ ہم دوسرے شہزادوں کی طرح کبھی کسی حسینہ سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اسے دیکھنے کے بعد دل نے مچل مچل کر کہا' یہ ہمارے لئے ہے۔ ہمارے لئے ہی اس دنیا میں آئی ہے۔ ہم نے خالہ جان سے پوچھا۔" اس کا نام کیا ہے؟"

انہوں نے کہا۔" اس کی چنچل مٹک دیکھ کر سب ہی اسے ہیرا بائی کہتے

ہیں۔لیکن اس کا نام زین آبادی ہے۔"

ہم نے کہا۔"خالہ جان! ہم اسے اپنے دل میں آباد کرنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ پھر کہا۔"آپ کی دو شادیاں ہو چکی ہیں۔آپ اپنی بیگمات کے سوا کبھی کسی حسینہ کی طرف مائل نہیں ہوتے۔آپ پہلے شہزادے ہیں' جنہوں نے اپنے لئے ایک بھی کنیز نہیں رکھی ہے۔ پھر کیا سوچ کر اس کی آرزو کر رہے ہیں؟"

"سیدھی سی بات ہے' ہم کبھی کسی حال میں گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے۔اس سے نکاح پڑھوائیں گے۔"

خالہ جان نے حیرانی سے کہا۔"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے۔ہم اس کا حسب نسب بھی نہیں جانتے۔بادشاہ سلامت کبھی اس سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کا حسب نصب نہیں ہوتا' اُن سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔لیکن انہیں کنیز بنائے رکھنے کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ویسے بابا جانی یہ دیکھتے آرہے ہیں کہ ہم دینی احکامات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔شائد وہ ہمیں اس سے شادی کی اجازت دے دیں؟ آپ ہمارا یہ مقدمہ ان کے سامنے پیش کریں۔"

ہمارا یہ مقدمہ بابا جانی کے سامنے پیش کیا گیا۔جہاں آراء اور داراشکوہ ہماری مخالفت کے لئے ہمیشہ مناسب موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ان دونوں نے جم کر ہماری مخالفت کی اور کہا۔"ایک نیچی ذات کی عورت کو شاہی محل میں لایا جائے گا تو گویا شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی شہزادیوں اور بیگمات کے برابر اسے درجہ دیا جائے گا۔یہ غلط ہے۔بابا جانی! آپ ایسی شادی کی اجازت دے کر شاہی وقار کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔"

بابا جانی نے سختی سے منع کر دیا کہ ہم زین آبادی سے نکاح نہ پڑھوائیں۔اگر یہ بابا جانی کا تنہا فیصلہ ہوتا تو شاید ہم صبر کر لیتے۔اس دلربا کی آرزو کو دل ہی میں کچل ڈالتے۔لیکن جہاں آراء اور داراشکوہ کی مخالفت نے ہمیں شعلے کی طرح بھڑکا دیا تھا۔ہم نے اپنے صوبے میں آ کر زین آبادی کو وہاں طلب کیا۔ پھر اس سے نکاح پڑھوالیا۔ہمارے اس

اقدام سے داراشکوہ کو یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ ہم بادشاہِ وقت کی حکم عدولی کر کے باغی بن چکے ہیں۔

زین آبادی کو گلے لگا کر اگرچہ ہم نے بابا جانی کی ناراضی مول لی تھی۔تاہم بات کچھ زیادہ نہیں بگڑی۔داراشکوہ نے بھی ایسی کئی غلطیاں کی تھیں۔جنہیں بابا جانی نے فراخدلی سے معاف کر دیا تھا۔انہوں نے ہماری بھی اس غلطی کو بعد میں درگزر کر دیا۔"

عالمگیر کے ہمزاد نے کہا۔"تمہارے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی تم نے کبھی کسی کنیز کو اپنے حرم سرا میں جگہ نہیں دی اور جسے جگہ دی' اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔"

"بے شک....ہم خدا سے یہی دعا مانگتے رہتے ہیں کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ہم تو اپنی دانست میں ہمیشہ مثبت قدم اٹھانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔لیکن نہ جانے کیوں ہمارے متعلق متضاد آراء قائم کی جاتی ہیں؟"

"آخر میں تم کیا کہنا چاہو گے؟"

"ایسا ہوتا ہے کہ ہم صحیح کرتے ہیں۔لیکن وہ دوسروں کی نظروں میں غلط ہوتا ہے۔ہم ساری دنیا کو خوش نہیں کر سکتے۔ہر ایک کو راضی نہیں رکھ سکتے۔سیدھی سی بات ہے کہ اپنے بہترین اعمال سے چاہے دنیا کو خوش نہ کر سکیں۔خدا کو تو خوش کر سکتے ہیں۔اسے راضی رکھ سکتے ہیں....تعجب ہے' لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے؟"

ایسا کہتے کہتے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔وہ کلمہ پڑھ رہا تھا۔اس کے بعد چپ ہو گیا.....ایک دن سب ہی کو چپ لگ جاتی ہے۔

(ختم شد)

تاریخی پس منظر کے ماخذ

ہسٹری آف اورنگزیب: سرجادوناتھ سرکار
مغل شاسکوں کی دھارمک نیتی: سری رام شرما
خلاصۃ التواریخ : سجان رائے بٹالوی
اشوک اور موریہ سلطنت کا زوال: رومیلا تھاپر
برنیئر کا سفرنامہ: ڈاکٹر فرانسس برنیئر
شاہجہاں نامہ: مُلا محمد صالح کمبوہ

☆☆☆

انتہا

وہ لپک جھپک برقعہ سنبھالتی چلی جارہی تھی۔ ایسی جلدی تھی جیسے ٹرین چھوٹنے والی ہو۔ قدم اٹھ رہے تھے اور چال بگڑتی جارہی تھی۔ چال بگڑے تو چال چلن بگڑ جاتا ہے۔ فی الحال اس کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ سر سے پاؤں تک سیاہ عبا میں چھپی ہوئی تھی۔ عورتیں یوں ہی چیزوں کو چھپاتی ہیں یا تو اپنے بیش قیمت خزانوں کو یا پھر اپنے بدنما داغوں کو، وہ کیا چھپا رہی تھی؟ ابھی یہ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سیاہ دستانیں' پیروں میں جرابیں اور جوتے تھے، آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ اس کی رنگت کیا ہے؟ یہ سراغ لگانے کی بات تھی۔ جب تک یہ معلوم نہ ہوتب تک دیکھنے والے یوں بار بار دیکھتے ہیں جیسے پتھر کو تراش کر حسن کا مجسمہ تلاش کرنا چاہتے ہوں۔

وہ کومن روم کے دروازے سے اندر داخل ہوئی وہاں کچھ لڑکیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اور کچھ پڑھ رہی تھیں۔ سب نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے اپنا

بیگ شانے سے اتار کر ایک صوفے پر رکھا۔ لڑکیاں بھی متجسس ہو رہی تھیں۔ اس نے سیاہ چشمہ اتار کر بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو گھما کر لڑکیوں کو دیکھا، پھر دستانے اتار کر میز پر رکھ دیئے۔ اس کے دودھیا نازک سے ہاتھ نقاب کی طرف بڑھے تو جیسے عبا کی رات سے صبح طلوع ہونے لگی۔

یوں تو بے شمار چہرے حسین ہوتے ہیں۔ لیکن حسینوں کی چکا چوند میں ایک آدھ چہرہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ جہاں نظر ٹھہر جاتی ہے۔ پھر اس چہرے کو دیکھنے کے بعد کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔ کہیں اور دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔

اس نے اپنی عبا اتار کر ایک طرف رکھی۔ جدید تراش خراش کے لباس میں اس کا قیدی وجود ادھر ادھر سے نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے بیگ سے دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ دوپٹے کی بساط ہی کیا جو چیختے ہوئے نظاروں کو چھپالے۔ پھر بھی ایک پردہ سا ہو گیا۔

کچھ لڑکیاں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں، کچھ اسے دیکھنے کے بعد نظر انداز کر رہی تھیں۔ اس نے ایک لڑکی کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر کہا۔ ''میں ایم اے پریویس (previous) کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ آج میرا فرسٹ ڈے ہے۔ مجھے بتا سکتی ہیں کہ ماسک کمونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کس طرف ہے؟''

اس لڑکی نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی ماس کام کی ہی اسٹوڈنٹ ہوں۔ تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یو آر سو نائس ٹو می۔ تھینک یو۔''

اس نے اپنی عبا کو اتار کر ایک اسٹینڈ پر لٹکا دیا۔ پھر سیاہ چشمہ اوپر کرتے ہوئے ہیئر بینڈ کی طرح اوپر رکھ لیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے دکھائی دینے والی لڑکی سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہے جو سر سے پاؤں تک سیاہ عبا میں نیک پروین بن کر آئی تھی۔ لباس کی بے باکی اور اس کا اسٹائل اسے ایک نیا روپ دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ دو تہذیبوں کے درمیان الجھی ہوئی ہے۔ اور اپنی متضاد شخصیت سے بہت سوں کو الجھانے والی ہے۔

وہ بیگ اٹھا کر اس لڑکی کے ساتھ باہر آئی۔ لڑکی نے کہا۔ ''میرا نام شائستہ ہے۔

اور تمہارا؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آفرین۔ آفرین ھی۔ تم مجھے آفرین کہہ سکتی ہو۔''

شائستہ نے پوچھا۔ ''تم نے گریجویشن کہاں سے کیا؟''

''ڈگری گرلز کالج سے۔''

''تو تم یونیورسٹی پہلی بار آئی ہو؟''

''مجھے یونیورسٹی کے ماحول میں رہنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے ایڈمیشن لے لیا۔ حالانکہ بابا جانی راضی نہیں تھے۔''

وہ بڑے فخر سے بول رہی تھی۔ ''ویسے بابا جانی کے پتھر دل کو موم کرنا مجھے آتا ہے۔ آخر ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ میری خوشی پوری نہیں کریں گے تو اور کس کی کریں گے؟''

''تمہارے بابا جانی کیا کرتے ہیں؟''

''ویسے تو انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جدی پشتی رئیس ہیں۔ میرے بابا جانی ایک معتبر عالم دین ہیں۔ تم نے شائدان کا نام بھی سنا ہو۔ میر عبدالسلام حقی.......''

شائستہ نے حیرت اور دلچسپی سے کہا۔ ''کیا تم میر عبدالسلام حقی کی بیٹی ہو؟ وہ تو بہت مشہور عالم دین ہیں۔ میں نے ٹی وی کے کئی پروگراموں میں انہیں دیکھا ہے۔ تم۔ تم ان کی صاحبزادی ہو؟''

آفرین نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟''

شائستہ نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں اتنے بڑے عالم دین کی بیٹی سے مل رہی ہوں۔''

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی کلاس روم کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ شائستہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آفرین! تم مائینڈ نہ کرو تو ایک بات پوچھوں؟''

اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ ''ہاں پوچھو۔ کیا بات ہے؟''

''یونیورسٹی کے ماحول میں سب ہی کا اپنا لائف اسٹائل ہوتا ہے۔ بہت سی لڑکیاں پردہ کرتی ہیں اور بہت سی ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن ہوتی ہیں۔ کچھ میری طرح بھی

ہیں۔نہ۔بہت زیادہ پردہ کرتی ہیں اور نہ ہی سر پر ہر وقت آنچل رکھتی ہیں۔کوئی کسی سے سوال نہیں کرتا لیکن میں تم سے کر رہی ہوں۔"

اس نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔"تم جب آئیں تو سیاہ عبا اوڑھے ہوئے تھیں۔اب لگ رہا ہے جیسے پردے کو نوچ کر پھینک چکی ہو۔اور اس عبا کو ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ہمارے ہاں سختی سے پردہ کیا جاتا ہے۔"

پھر وہ بات بدل کر بولی۔"بہرالحال۔آج ہی تو ہم مل رہے ہیں۔اور آج ہی سب کچھ جان لینا چاہتی ہو۔ہمارے درمیان انڈراسٹینڈنگ بڑھتی رہے گی۔تو اندر کی باتیں بھی معلوم ہوتی رہیں گی۔چلو کلاس میں چلتے ہیں۔"

وہ دونوں کلاس روم میں داخل ہو گئیں۔وہاں کچھ پرانے طالب علم تھے اور کچھ آفرین کی طرح نئے تھے۔ان نئے چہروں میں وہ نمایاں تھی۔کچھ اس کا حسن تھا اور کچھ حسن کا غرور تھا۔خاص طور پر لڑکے اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔وہ ایک خالی کرسی کی طرف بڑھی، پیچھے سے آواز آئی۔"یقین نہیں آتا۔"

دوسری آواز نے کہا۔"یقین کرلو۔یہ نئی امپورٹڈ ہے۔"

پہلی آواز نے تائید کرتے ہوئے کہا۔"یو آر رائٹ۔نئی ہے۔اس کے سامنے باقی چہرے پرانے لگ رہے ہیں۔"

اس نے شائستہ نے کہا۔"چلو۔ہم کہیں اور بیٹھتے ہیں۔"

شائستہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔"یہ تو شروعات ہے۔تم ابھی سے گھبرا گئیں؟"

پھر وہ چونکتے ہوئے بولی۔"ارے۔میں اپنا موبائل فون تو کومن روم میں بھول آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔آفرین وہیں کھڑی رہ گئی۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔کچھ اسٹوڈنٹ اب بھی اسے دیکھ رہے تھے۔وہ ان سے دور ایک کرسی کی طرف بڑھ گئی۔پھر بیٹھنے لگی۔لیکن بیٹھتے بیٹھتے ٹھہر گئی۔

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔کلاس روم میں ایک قد آور جوان داخل ہو رہا تھا۔اس کے ہاتھوں میں کچھ کتابیں اور آنکھوں پر بھاری فریم کا چشمہ تھا۔چہرے پر مردانہ وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔نہایت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔آفرین اس کی شخصیت سے زیادہ اس کے ٹیچرز گاؤن سے مرعوب ہو رہی تھی۔جو اس نے پہن رکھا تھا۔

اس کے داخل ہوتے ہی کلاس باادب ہو گئی تھی۔اس نے رعب دار آواز میں کہا۔"سٹ ڈاؤن۔"

پوری کلاس بیٹھ گئی۔آفرین اس کا جائزہ لینے میں اس قدر محو تھی کہ بیٹھنا بھول گئی۔پھر اسے اچانک احساس ہوا تو دھپ سے بیٹھ گئی۔

اس نے آفرین کی بدحواسی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔"نیو ایڈمیشن؟"

اس نے کہا۔"یس سر!"

سر نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔"ہوں۔کیا تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ ٹیچر سے کھڑے ہو کر بات کرتے ہیں؟اسٹینڈ اپ۔"

وہ پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔کھڑے ہوتے ہوتے یوں ڈگمگائی کہ پھر بیٹھ گئی۔پھر جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔پیچھے سے ایک اسٹوڈنٹ نے دبی سی سرگوشی میں کہا۔"سہارا دوں؟"

اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔سر نے کہا۔"ادھر دیکھو!کیا نام ہے تمہارا؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔"آفرین....."

کہیں سے آواز آئی۔"آفرین ہے تم پر..."

کلاس میں قہقہوں کی آواز ابھری۔پھر خاموشی چھا گئی۔سر نے پوچھا۔"پورا نام؟"

"آفرین حقی....."

"ہوں۔تم نیو ایڈمیشن ہو۔اس لئے ساری کلاس کو قومی ترانہ پڑھاؤ گی۔"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔"سر!میں۔میں کیسے.....؟"

اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔"کیوں؟کیا تم پاکستانی نہیں ہو؟تمہیں قومی ترانہ نہیں آتا؟"

"یہ۔ یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟ اسکول سے کالج تک ہر صبح قومی ترانہ پڑھایا جاتا ہے۔ پھر تم کیوں نہیں پڑھا سکتیں؟ چلو۔ جلدی کرو۔"

آفرین کا چہرہ روہانسی ہو گیا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ مجبوراً ڈائس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ پوری کلاس میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ چہروں پر دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ اس نے ایک بار پھر رحم طلب نظروں سے سر کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ "ہری اپ....."

وہ پوری کلاس کے روبرو پڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ کسی سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں پڑھنے لگی۔

"پاک سرزمین شاد باد۔"

"کشورِ حسین شاد باد۔"

تو نشانِ عزمِ عالی شان...."

دروازے سے گرجدار آواز سنائی دی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

آفرین نے آنکھیں کھول کر ادھر دیکھا۔ وہاں ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا تھا۔ اس نے بھی ٹیچرز گاؤن پہن رکھا تھا۔ اس نے آفرین کے سامنے آ کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ یہ کوئی اسکول نہیں ہے، جہاں صبح صبح قومی ترانہ پڑھایا جائے؟"

آفرین نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر سر!"

"یو شٹ اپ۔ اپنی سیٹ پر جاؤ۔"

وہ الجھ گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے آنے والا ٹیچر وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ انکشاف ہوا کہ آنکھیں بند کرنے سے لوگ بدل جاتے ہیں۔ ماحول بدل جاتا ہے۔ وہاں کلاس کا ڈسپلن بھی بدل چکا تھا۔ پروفیسر نے ایک بار پھر کہا۔ "آپ نے سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا ہے؟ اپنی سیٹ پر تشریف لے جائیں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی۔ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر سر نے کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آج کلاس کا پہلا دن ہے۔ بہت سے اسٹوڈنٹس نئے ہیں۔ لہٰذا ایک دوسرے سے متعارف ہونا بھی ضروری ہے۔ تعارف کی ابتداء میں کرتا ہوں۔"

پروفیسر نے چند لمحے رک کر کلاس کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ "میرا نام حسام بیگ ہے۔ میں نے جرنلزم میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور پچھلے پانچ برسوں سے اس یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم دے رہا ہوں۔ فی الحال اتنا تعارف ہی کافی ہے۔ رفتہ رفتہ آپ سب میرے بارے میں بہت کچھ جانتے رہیں گے۔ اب آپ اپنا اپنا مختصر تعارف کروائیں۔"

اس دوران میں شائستہ بھی آفرین کے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

پروفیسر نے شائستہ کی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تو پرانی اسٹوڈنٹ ہیں؟"

وہ اٹھ کر بولی۔ "سر! یہ میرا تھرڈ ائیر ہے۔"

سر نے کہا۔ او کے۔ پھر آفرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنا تعارف کراؤ۔"

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "سر! میرا نام آفرین حقی ہے۔ میرے والد کا نام میر عبدالسلام حقی ہے۔ میں نے ڈگری گرلز کالج سے گریجویشن کیا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ پروفیسر نے پوچھا۔ "تم نے اپنے والد کا کیا نام بتایا ہے؟"

وہ بولی۔ "میر عبدالسلام حقی..."

پرفیسر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ "اینی تھنگ ایلس سر....؟"

پروفیسر اسے دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر چونک کر بولا۔ "نو۔ سٹ ڈاؤن۔"

تعارف کا سلسلہ چلتا رہا۔ تمام اسٹوڈنٹس باری باری اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ لیکن پروفیسر کی سوچتی ہوئی نظریں بار بار آفرین کی طرف ہی بھٹک رہی تھیں۔ آفرین ان نظروں میں چھپی ہوئی حیرانی کو سمجھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ "کسی عالم دین کی بیٹی ہونا اس قدر حیرانی کی بات کیوں ہے؟ لوگ مجھے عجوبہ سمجھ کر کیوں دیکھتے ہیں؟"

وہ سوچتے سوچتے ایک دم سے چونک گئی۔ پروفیسر نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کلاس کے بعد میرے روم میں آ کر ملاقات کریں۔"

کلاس مختصر تھی۔جلد ختم ہوگئی۔آفرین نے باہر نکلتے ہوئے شائستہ سے
پوچھا۔''پروفیسر بیگ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''
وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی۔''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ شائد وہ بھی تمہارے
والد کے نام سے متاثر ہوگئے ہیں۔ملاقات کروگی تو معلوم ہوگا۔''
آفرین کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔جیسے کسی کو تلاش کر رہی
ہوں۔شائستہ نے پوچھا۔''ایسا لگتا ہے، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو؟''
اس نے چونکتے ہوئے کہا۔''میں اس جھوٹے پروفیسر کو تلاش کر رہی ہوں جو
آنکھیں کھولتے ہی غائب ہوگیا تھا اور پھر دکھائی نہیں دیا۔''
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے؟''
''میں خواب نہیں' حقیقت بتا رہی ہوں۔''
شائستہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''بند آنکھوں کے پیچھے تو خوابوں کا شہزادہ ہی
آتا ہے اور آنکھیں کھلتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔پھر وہ یہاں کیسے نظر آسکتا ہے؟''
اس نے کہا۔''یہاں تھا اور اس نے پوری کلاس کے سامنے مجھ سے قومی ترانہ بھی
پڑھوایا تھا۔''
شائستہ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔''یہ بڑا عجیب شہزادہ
ہے۔جس نے پیار بھرے گیت نہیں گائے۔تم سے قومی ترانہ پڑھوا کر چلا گیا۔مجھے تو عاشق
سے زیادہ محب وطن لگ رہا ہے۔''
وہ ذرا ناراضگی سے بولی۔''اسے نہ تو مذاق سمجھو اور نہ ہی میرا مذاق اڑاؤ۔پہلے
ہی اس نے مجھے بے وقوف بنا کر پوری کلاس کے سامنے میری انسلٹ کی ہے۔میں اسے
نہیں چھوڑوں گی۔ایسی خبر لوں گی کہ آئندہ ایسا بے ہودہ مذاق کرنے سے توبہ کرلے گا۔وہ
اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ میں چھوڑوں گی نہیں اس بدتمیز کو....''
''ارے۔کس پر اس طرح برس رہی ہو؟ کس کی بات کر رہی ہو؟''
''وہی جو جھوٹا پروفیسر بن کر آیا تھا۔''
شائستہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''کہیں تم عامر کی بات تو نہیں کر رہی ہو؟''

''عامر؟ کون عامر؟ مجھے اس کا نام نہیں معلوم...''
''حلیہ تو معلوم ہے؟ لمبا چوڑا ہے۔باڈی بلڈر جیسا بڑی بڑی براؤن
آنکھیں۔گندمی رنگت اور وجیہہ شخصیت......کیا یہی حلیہ تھا اس کا؟''
شائستہ کی بات سنتے سنتے وہ اس کے تصور میں ابھرنے لگا تھا۔پھر مسکرانے لگا
تھا۔شائستہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''بتاؤ ناں۔وہ ایسا ہی تھا؟''
آفرین نے چونک کر کہا۔''ہاں۔کچھ کچھ...''
شائستہ نے ذرا جوشیلے انداز میں کہا۔''کچھ کچھ نہیں۔وہ سو فیصد ایسا ہی
ہے۔عامر جان ہمارے ڈیپارٹمنٹ اور آرٹس فیکلٹی کا سب سے پاپولر نوجوان ہے۔اور
کیوں نہ ہو؟ وہ دیکھنے میں جتنا ہینڈسم ہے۔اتنا ہی جینئس بھی ہے۔''
وہ اس کے گن گا رہی تھی اور اس کی شخصیت آفرین کے اندر گنگنا رہی
تھی۔شائستہ نے کہا۔''پتہ ہے۔وہ یونیورسٹی کا سب سے تیز طرار مقرر ہے۔جب بولتا ہے
تو اچھے اچھے بولنا بھول جاتے ہیں۔اکثر اساتذہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ صرف صحافی ہی نہیں
بنے گا۔بہت بڑا سیاست داں بن کر بھی ابھرے گا۔''
آفرین بڑی دلچسپی سے اس کے متعلق سن رہی تھی اور متاثر ہو رہی تھی۔واقعی اس
کی شخصیت حواس پر چھا جانے والی تھی۔لیکن وہ اس سے متاثر ہونا نہیں چاہتی تھی۔وہ تو جیسے
اس کا دشمن تھا۔اس نے اس کی انسلٹ کی تھی۔اور وہ اس سے بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی
تھی۔اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔''بس کرو۔اس نے میری انسلٹ کی ہے۔اور تم اس کی
تعریفوں کے پل باندھ رہی ہو۔''
وہ مسکراتے ہوئے بولی۔''جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔جو سچ ہے وہی بتا رہی
ہوں۔وہ زندہ دل ہے۔اس لئے ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے۔ویسے بھی پہلے دن نئے آنے
والوں کو تھوڑا سا پریشان تو کیا جاتا ہے۔اس طرح کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں تو ہوتی ہی رہتی
ہیں۔آج میں ساتھ نہیں تھی۔اس لئے تم بے وقوف بن گئیں۔آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''
''آئندہ میں اسے ایسا کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گی۔وہ خود کو سمجھتا کیا
ہے؟ وہ اس طرح کے بے ہودہ مذاق کرے گا اور میں برداشت کرلوں گی؟''

شائستہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم جیسا چاہو اس سے نمٹ لینا، لیکن اس وقت تمہیں پروفیسر بیگ سے ملنا چاہئے۔“

آفرین نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے اس کم بخت نے ایسا الجھایا ہے۔ کہ پروفیسر کے پاس جانا ہی بھول گئی۔“

وہ ذرا شوخی سے بولی۔ ”اتنا مت الجھنا کہ کسی دن خود کو ہی بھول جاؤ۔“

آفرین نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر پروفیسر کے روم کے پاس آ گئی۔ خود باہر ہی رک گئی۔ آفرین نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ”مے آئی کم ان سر!۔؟“

حسام بیگ نے ایک فائل پر سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ہاں۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“

وہ اس کے سامنے ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ پروفیسر چند لمحوں تک اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”کیا تم واقعی معروف عالم دین میر عبدالسلام حقی کی بیٹی ہو؟“

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”سر! آپ اس قدر حیران کیوں ہیں؟ کیا میں ان کی بیٹی نہیں ہو سکتی؟“

وہ ذرا سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”وہ۔ دراصل میں نے حقی صاحب کے لیکچرز اٹینڈ کئے ہیں۔ وہ شریعت پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اور میں نے سنا بھی ہے کہ ان کے خاندان میں خواتین پردے کی سختی سے پابندی کرتی ہیں۔ اس لئے تمہیں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔“

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سر! یہ سچ ہے کہ میرے والد دینی احکامات پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اور میں بھی یہی کرتی ہوں۔ صبح منہ اندھیرے اٹھتی ہوں۔ فجر کی نماز کے بعد کلام پاک کی تلاوت کرتی ہوں۔ پابندی سے پانچوں وقت کی نمازیں بھی پڑھتی ہوں۔ اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے میں اور اپنے والد محترم کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ”میں اس انداز میں اپنے بابا جانی کے سامنے بھی

نہیں جاتی۔ میں بھی کیا کروں؟ یہ کمپیوٹر ایج ہے۔ میں الیکٹرونک میڈیا کے دور میں سانس لے رہی ہوں۔ دوسری لڑکیوں کی طرح خوبصورت لباس پہننا چاہتی ہوں۔ اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنا چاہتی ہوں، تو لوگ حیران کیوں ہوتے ہیں؟“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟ کیا میں تہذیبی حدود میں رہ کر اپنی پسند سے اپنی زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتی ہوں؟ میں ایک مشہور عالم دین کی بیٹی ہوں۔ کیا اس لئے مجھے پردے میں رہنا چاہئے؟“

پروفیسر چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ تم اپنے طور پر زندگی گزارنے کا پورا حق رکھتی ہو۔ میں بحث نہیں کروں گا۔ تم جا سکتی ہو۔“

وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی طرف جانے لگی۔ پھر پلٹ کر بولی۔ ”سر! میں نے سر سے پاؤں تک خود کو برقعے میں نہیں چھپایا، لیکن حیاء کا پاس رکھنا مجھے آتا ہے۔ میں بے پردہ ہو کر کسی کلب میں نہیں، ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے میں آئی ہوں۔ یہاں مشرقی تہذیب کی ضمانت ملتی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر چلی گئی۔ پروفیسر خالی دروازے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆☆

وہ حقی ہسپتال کہلاتا تھا۔ وہاں غریبوں اور لاچاروں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ مہنگی دوائیں بھی مفت دی جاتی تھیں۔ وہاں انتہائی قابل اور تجربہ کار ڈاکٹرز تھے۔ جو نہایت توجہ سے مریضوں کا معائنہ کرتے تھے۔ کامیاب آپریشن اور کامیاب علاج کے باعث امیر کبیر مریض بھی عطیات کے طور پر بھاری بھاری رقومات ادا کرتے تھے۔ اور اپنے علاج کے سلسلے میں اسی ہسپتال کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اچانک ہی اطلاع ملی کہ میر عبدالسلام حقی تشریف لا رہے ہیں۔ پورے ہسپتال کا عملہ الرٹ ہو گیا۔ سب ہی مستعدی سے اپنے اپنے فرائض میں مصروف ہو گئے۔

وہ اپنے مصاحبین کے ساتھ پجیرو میں آئے تھے۔ احاطے میں گاڑی سے اترے تو کوئی ان کے استقبال کے لئے نہیں آیا۔ انہوں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ مسیحائی کے

فرائض کو چھوڑ کر انہیں سلام کرنے اور جی حضوری کرنے کوئی نہ آیا کرے۔ وارڈ میں موجود ڈاکٹر نے انہیں سلام کیا۔ پھر مصافحہ کیا۔ وہ سفید ململ کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھے۔ چہرے پر اس قدر تقدس اور وقار تھا کہ دیکھنے والے ان سے مرعوب ہو جایا کرتے تھے۔ ویسے ان کے انداز میں انکساری اور شفقت رہا کرتی تھی۔

انہوں نے ڈاکٹر سے مصافحہ کیا۔ پھر ایک ایک مریض کے پاس جا کر ان کا حال پوچھنے لگے۔ یہ معلوم کرنے لگے کہ علاج معالجے کے سلسلے میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے؟

وہ جس بیڈ پر جاتے تھے۔ مریض اٹھ کر بیٹھنے لگتے تھے اور وہ بڑی محبت سے سمجھاتے تھے کہ انہیں لیٹے رہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”حقی صاحب! یہ لوگ آپ سے اس قدر محبت اور عقیدت رکھتے ہیں کہ میں یا کوئی بھی انہیں کتنا ہی سمجھائے یہ آپ کا احترام کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔“

ایک مریض نے کہا۔ ”محترم! آپ جیسے فرشتے کے احترام میں اٹھ کر بیٹھنے سے اور کھڑے ہونے سے ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ آپ نے ہم غریبوں کے لئے اتنا کچھ کیا ہے، ایسا ہسپتال بنوایا ہے کہ یہاں تمام جدید سہولیات کے ساتھ ساتھ ہمارا مفت علاج ہوتا ہے۔ پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا حق صحیح طور پر ہمیں مل رہا ہے یا نہیں؟ آپ اچانک ہی یہاں پہنچ جایا کرتے ہیں۔“

دوسرے مریض نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج کے دور میں ایسے خدا ترس فرشتہ صفت لوگ کہاں ملتے ہیں؟ حقی صاحب نے تو میری زندگی کا سب سے بڑا بوجھ اتار دیا۔ میرے دروازے پر کھڑے ہو کر میری بیٹی کی شادی کرا دی۔ آج یہ نہ ہوتے تو میں بیٹی کی فکر سے اور بیماری سے مر جاتا۔“

عبدالسلام حقی نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”نہیں بھائی! ایسا نہ کہو۔ میری کیا حیثیت ہے۔ جو میں کسی کے لئے کچھ کر سکوں۔ یہ تو میرے پروردگار کی ذات ہے، جس نے مجھے وسیلہ بنا کر تم سب کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن تمہیں اپنا وعدہ تو یاد ہے ناں؟“

اس نے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”جی۔ بالکل یاد ہے۔ بلکہ میں نے تو آپ کی ہدایت پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرتا ہوں، اپنے گھر والوں کو بھی تاکید کرتا ہوں، میں وعدے کے مطابق آپ کی نیک تعلیمات پر پابندی سے عمل کر رہا ہوں۔“

ایک اور مریض نے کہا۔ ”حقی صاحب! میں بھی نماز کا پابند ہو گیا ہوں اور میں نے اپنی ویڈیو فلموں کی دوکان بھی بند کر دی ہے۔ ہسپتال سے صحت یاب ہوتے ہی آپ کی دی ہوئی رقم سے پرچون کی دُکان کھولوں گا۔ پچھلے کاروبار کا تمام سامان بیچ کر جو رقم حاصل ہوگی۔ اسے آپ کے اس ہسپتال میں یا یتیم خانے میں جمع کروا دوں گا۔ میں نے حرام کی کمائی سے توبہ کی ہے اور آئندہ بھی اس پر قائم رہوں گا۔“

حقی صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ حضرات برائیوں سے توبہ کر کے صحیح راہ پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یاد رکھیں! اللہ رب العزت ہم سب کو دیکھ رہا ہے، ہمارے برے اعمال کو جانتا ہے۔ اس لئے خود کو نیک اعمال کی طرف اور نمازوں کی طرف مائل کرتے رہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔“

وراڈ میں موجود تمام افراد نے بیک وقت کہا۔ ”آمین......!“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”حقی صاحب! ایک خاتون مریضہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے انہیں کہا ہے کہ آپ خواتین سے براہِ راست گفتگو نہیں کرتے۔ لیکن وہ اصرار کر رہی ہیں۔ کسی بہت ضروری مسئلے پر آپ سے مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔“

انہوں نے کہا۔ ”آپ انہیں سمجھائیں، کسی بھی نامحرم سے ملنا یا بات کرنا سخت گناہ ہے۔ میں کسی حال میں ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی انہیں اس بات پر اصرار کرنا چاہیئے۔ اگر بہت ہی مجبوری ہے تو وہ تحریر کے ذریعے اپنا مسئلہ مجھ تک پہنچا سکتی ہیں۔ بات نہایت ہی سنگین ہوگی تو وہ میرے حجرے میں آئیں گی۔ پردے کے پیچھے رہیں گی اور مجھ سے اپنے مسئلے پر کھل کر گفتگو کر سکیں گی۔“

”جناب! انہوں نے آپ کے نام ایک رقعہ لکھا ہے۔ وہ آپ کی میز پر رکھا ہوا ہے۔“

وہ تمام مریضوں کا معائنہ کرنے کے بعد اور ہسپتال کے عملے سے ملاقات کرنے کے

بعد اپنے دفتری کمرے میں پہنچے۔ وہاں ہسپتال کا منتظم اعلیٰ اور دو ڈاکٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں طرح طرح سے سوالات کرنے لگے۔ پھر انہوں نے مطمئن ہو کر ڈاکٹر سے کہا۔ "آپ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے جا سکتے ہیں۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ انہوں نے منتظمِ اعلیٰ سے کہا۔ "ہاشمی صاحب! یہاں میز پر ایک خاتون کی تحریر رکھی ہوئی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں کسی خاتون کی تحریر بھی تنہائی میں نہیں پڑھتا۔ نہ ہی فون پر گفتگو کرتا ہوں۔ آپ کو اسی لئے روک رکھا ہے۔ اب آپ کی موجودگی میں اسے پڑھ رہا ہوں۔"

وہ میز پر رکھے ہوئے کاغذ کو اٹھا کر دھیمی آواز میں پڑھنے لگے۔ "محترم قبلہ و کعبہ! جناب عبدالسلام حقی! السلام علیکم....."

حقی صاحب اور ہاشمی صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر کہا۔ "وعلیکم السلام۔"

وہ پھر پڑھنے لگے۔ "جناب عالی! میں ایک چالیس برس کی بیوہ ہوں۔ میری ایک بائیس برس کی جوان بیٹی ہے۔ اس کا نام عظمیٰ ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ ابنارمل ہے۔ لیکن ایک ماہر نفسیات نے اس کا معائنہ کرنے اور اس سے طرح طرح کے سوالات کرنے کے بعد یہ یقین سے کہا ہے کہ وہ ابنارمل نہیں ہے۔ بلکہ دوہری کیفیات سے گزرتی رہتی ہے۔

وہ دوہری کیفیات یہ ہیں کہ ہمارے دینی احکامات کے مطابق وہ نمازیں پڑھتی ہے۔ لیکن پانچوں وقت کی پابند نہیں ہے۔ جب بھی وقت ملتا ہے۔ نماز پڑھ لیتی ہے، صرف جمعے کے دن کلام پاک کی تلاوت کرتی ہے۔ سر سے دوپٹہ اترنے نہیں دیتی۔ نظریں نیچی رکھتی ہے۔ شرم وحیاء کے تمام تقاضے پورے کرتی ہے۔ لیکن.....

جب وہ کالج جاتی ہے یا شاپنگ وغیرہ کے لئے جاتی ہے تو لپ اسٹک لگاتی ہے۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی کرتی ہے۔ ایک سنجیدہ اور سمجھدار لڑکی کو جس حد تک بننا سنورنا چاہئے، اور اپنے آپ کو نکھارنا چاہئے۔ اس حد تک وہ نکھرتی ہے۔ اور باہر جاتی ہے۔ میں اعتراض کرتی ہوں، اسے پردے میں رہ کر باہر نکلنا چاہئے۔

میری ضد پر وہ چادر لپیٹ کر گھر سے نکلتی ہے۔ لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ

کالج پہنچتے ہی یا شاپنگ سینٹر پہنچتے ہی وہ چادر کو اتار کر بیگ میں رکھ لیتی ہے، پھر بڑی بے باکی سے گھومتی پھرتی ہے۔ مجھ سے بھی کہتی ہے کہ ہمیں وقت اور زمانے کے مطابق چلنا چاہئے۔ یہ کمپیوٹر کا دور ہے، میں پردے کی بوا بن کر نہیں رہ سکتی۔ میں آج کی جوان نسل کے شانہ بشانہ نہیں چلوں گی تو ان سے پیچھے رہ جاؤں گی۔

اس کی باتیں اور اس کے دلائل سن کر میں چپ رہ جاتی ہوں۔ الجھنے لگتی ہوں۔ واقعی ہم اپنے بیٹوں کو تو ایسی آزادی سے، ترقی کرنے سے اور دوسروں کے مقابلے میں آگے بڑھنے سے نہیں روکتے، پھر بیٹیوں پر ہی کیوں سختی کرتے ہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیاں ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہیں۔ انہیں کانچ کے برتن کی طرح سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ لیکن سنبھلنے والے ہاتھوں سے بھی برتن گر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ سات پردوں میں رہنے والی لڑکیوں کو بھی اغواء کیا جاتا ہے، ان کی عزت کی دھجیاں اڑا دی جاتی ہیں، جو لڑکیاں سرعام گھومتی پھرتی ہیں۔ پڑھنے لکھنے جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ شریف زادیاں نہیں ہیں اور شرم وحیاء کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ہیں، اغواء کی وارادات کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ کون نمازیں پڑھتی ہے اور کون نہیں پڑھتی۔ مجرم تو پھر مجرم ہوتے ہیں۔ وہ شیطانی حرکتوں سے باز نہیں آتے، وہ سنبھالنے اور تحفظ دینے والے ہاتھوں کو بھی کمزور بنا دیتے ہیں۔

پھر کیوں نہ ہم اپنی بیٹیوں کے اندر اتنی خود اعتمادی اور اتنا حوصلہ پیدا کریں کہ وہ ہر آنے والے برے حالات کا بڑے عزم واستقلال سے مقابلہ کر سکیں۔

دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک کروڑوں اور اربوں بے پردہ گھومنے والی عورتیں اور مردوں کے شانہ بشانہ ترقیاں کرنے والی عورتیں بے حیاء اور بدچلن نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے کردار کی پختگی سے یہ ثابت کر رہی ہیں کہ وہ اگر عزت اور آبرو سے زندگی گزارنا چاہیں تو بے شک گزار سکتی ہیں۔ ورنہ جو بدچلن ہوتی ہیں، وہ پردے میں رہ کر بھی گل کھلاتی ہیں۔

محترم حقی صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اپنی بیٹی کو ابنارمل سمجھتی تھی، اب نہیں سمجھ رہی ہوں۔ وقت اور بدلتے ہوئے زمانے کے

مطابق میرے اندر یہ بات پک رہی ہے کہ اپنی بیٹی کو لگام نہیں دے سکوں گی اور جب ایسا نہیں کرسکوں گی تو مجھے اس کے اندر عزم و استقلال حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا کرنا چاہئے ،تا کہ وہ اپنے حالات کے مطابق زندگی گزار سکے۔

آپ سے سوال ہے، کیا میں درست سوچ رہی ہوں؟ اور اگر اس سلسلے میں کوئی غلطی کررہی ہوں تو آپ دینی احکامات کے مطابق میری رہنمائی فرمائیں۔ اپنے گھر کا فون نمبر اور موبائل فون نمبر نیچے درج کررہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کریں گے ،اور فون کے ذریعے میری راہنمائی فرمائیں گے۔ فقط ایک الجھی ہوئی ماں نجمہ خاتون....''

وہ تحریر پڑھنے کے بعد حقی صاحب نے ہاشمی صاحب کو دیکھا پھر کہا۔ ''ان خاتون نے اپنا مسئلہ بھی پیش کیا ہے، اور اپنی طرف سے اس کا حل بھی پیش کردیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کچھ فرمائیں گے؟''

ہاشمی صاحب نے کہا۔ ''محترم حقی صاحب! میں آپ کی علمی قابلیت اور دینی معلومات کے سامنے ایک طفلِ مکتب ہوں۔ بھلا کیا عرض کرسکتا ہوں؟''

''ہر شخص اپنی معلومات کے مطابق مشورے دیتا ہے۔ آپ بھی اپنی معلومات کے مطابق اپنا خیال ظاہر کریں۔''

ہاشمی صاحب نے کہا۔ ''اس دنیا کی مادی ترقی بڑی حیرت انگیز ہے۔ انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے دنیا جہاں کی معلومات ہمارے گھر کے ڈرائینگ روم اور بیڈ روم تک پہنچ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ناچ گانے، رنگا رنگ کے فیشن، بے حیائی اور فحاشی کے تماشے بھی ہمارے گھروں میں پہنچ رہے ہیں۔ انسانی ذہانت انتہائی عروج پر ہے۔ اور ان ترقیوں سے جتنے فائدے پہنچ رہے ہیں، اس سے زیادہ نقصانات بھی پہنچ رہے ہیں۔''

انہوں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہم ان تمام فوائد اور نقصانات کے درمیان الجھنے لگے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے؟ کہاں جانا چاہئے اور کہاں نہیں جانا چاہئے؟ ایسے وقت صرف ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے، اور وہ ہے دین

ایمان کی روشنی، قرآن مجید سے ملنے والے احکامات اور حضرت محمد ﷺ کی سیرت کاملہ....''

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''بس۔ ہم تو ایک ہی آخری بات جانتے ہیں کہ جب ہمیں کلام پاک اور احادیث کی روشنی میں سکون مل رہا ہے۔ مکمل اطمینان حاصل ہو رہا ہے، کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ عزت آبرو سے نیکی اور شرافت سے زندگی گزر رہی ہے اور عاقبت سنور رہی ہے تو ہمیں کسی جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہئے۔ حضور ﷺ کی ہدایات پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتے رہنا چاہئے۔''

حقی صاحب نے کہا۔ ''جزاک اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو مزید دین و ایمان کی روشنی عطا فرمائے۔ آپ نجمہ خاتون کا فون نمبر پڑھیں۔ پھر ان سے رابطہ کریں۔ جو مجھ سے کہا ہے، وہی انہیں سمجھائیں۔ باقی اللہ تعالیٰ ہی صراط مستقیم پر چلانے والا ہے۔''

ہاشمی صاحب نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر گفتگو کرنے لگے۔

اس خاتون کی جوان بیٹی کا مسئلہ تھا۔ اس بیٹی کے حوالے سے حقی صاحب اپنی بیٹی کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔

وہ بھی یونیورسٹی جایا کرتی تھی۔ انہوں نے بھی بیٹی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اسلامک لٹریچر میں پی ایچ ڈی کرے، لیکن وہ ماس کمیونیکیشن کا کورس کررہی تھی۔ اس کورس کا تعلق پبلک ریلیشن یعنی تعلقات عامہ سے تھا۔ تعلیم کا شعبہ ہو یا زراعت کا' طب کا شعبہ ہو یا سیاست کا۔ ہر شعبے کے ماہرین سے رابطہ کرنا ہوتا ہے۔ ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔ تمام شعبوں کے چھوٹے بڑے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔

یعنی ان کی بیٹی آفرین بھی آئندہ ان کی مرضی اور مزاج کے مطابق پردہ داری قائم نہیں رکھ سکے گی۔ اسے متعلقہ ہر چھوٹے بڑے فرد سے ملنا ہوگا۔ اور ہر موضوع پر بے باکی سے گفتگو کرنی ہوگی۔

وہ کچھ بے چین سے ہوگئے۔ سوچنے لگے۔ ''کیا کروں؟ لاڈلی بیٹی ہے۔ میں بڑی احتیاط سے سوچ سمجھ کر اس کا ہر شوق پورا کرتا ہوں۔ پھر بھی یہ فکر کھاتی رہتی ہے کہ بیٹی لاکھ سمجھ دار سہی پھر بھی دھوکہ کھا سکتی ہے۔ گمراہ ہوسکتی ہے۔''

ہاشمی صاحب نے فون کا اسپیکر آن کیا ہوا تھا۔ وہاں سے نجمہ خاتون کی آواز ابھر رہی

تھی۔وہ کہہ رہی تھی۔ ’’محترم! آپ درست فرماتے ہیں۔کلام پاک اور احادیث کے مطابق
ہم ایک صاف ستھری محدود زندگی آرام سے گزار سکتے ہیں۔لیکن یہ زمانہ آرام کا نہیں‘ کام‘ کام
اور کام کا ہے۔سب ہی آگے بڑھتے رہنے کی دوڑ میں مصروف رہتے ہیں۔ایسا نہ کریں تو پیچھے
رہ جائیں۔زندگی پیچھے رہنے کا نام نہیں ہے۔آج کے جوانوں کو دوسروں کی طرح ترقی
اور عروج حاصل کرنا پڑتا ہے۔کیا بعض حالات میں آپ مجبور نہیں ہوتے ، کہ اپنے اصولوں
میں لچک پیدا کریں؟‘‘

’’محترمہ! ہم ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے اصولوں میں کوئی تبدیلی نہ
آئے۔جب اصول مستحکم ہوں تو ان میں نہ تبدیلی آتی ہے‘ نہ لائی جاتی ہے۔‘‘

’’میں ایک مثال دیتی ہوں اگر کوئی عورت ماں، بہن بیٹی نہیں ہے نامحرم ہے تو اسے
پردہ کرنا چاہئے۔اسی طرح اگر کوئی باپ بھائی اور بیٹا نہیں ہے تو کسی نامحرم کو بھی کسی بھی
خاتون کے سامنے نہیں آنا چاہئے۔لیکن محترم! آپ بھی ٹی وی اسکرین پر آتے ہیں۔اگرچہ
ایمان افروز گفتگو فرماتے ہیں۔اپنی دینی تعلیمات سے لوگوں کے ذہنوں کو روشن کرتے ہیں۔
لیکن یہ اصول کے خلاف یوں ہیں کہ وہ ہر گھر کے ڈرائینگ روم اور بیڈ روم میں ہر گھر کی
خواتین کے روبرو آتے ہیں۔نامحرم ہو کر خود کو ہم خواتین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔‘‘

’’محترمہ! بعض ناگریز حالات میں ایک نامحرم کسی خاتون کے سامنے آسکتا
ہے۔مثلاً قاضی صاحب نکاح پڑھاتے وقت دلہن کے روبرو آتے ہیں۔ان کے ساتھ
وکیل اور گواہ بھی ہوتے ہیں۔وہ سب وہاں ایک نامحرم کے سامنے ہوتے ہیں۔اور یہ دیکھتے
ہیں کہ دلہن نے نکاح قبول کیا ہے اور نکاح نامے پر دستخط کئے ہیں، اسی طرح دینی احکامات
اور دینی تعلمات گھر گھر پہنچانے کے لئے جب کوئی بھی عالم دین ٹی وی اسکرین پر آتا ہے تو
وہاں مجسم نہیں ہوتا‘ اس کا محض عکس ہوتا ہے اس کے ساتھ خدا کا فرمان ہوتا ہے۔ایسے وقت
ایک پاکیزہ اور مقدس فضا قائم رہتی ہے۔آپ سے عرض ہے کہ آپ کا علم آپ کی دینی
معلومات محدود ہیں۔اس لئے آپ ان موضوعات پر بحث نہ کریں۔صرف اپنا مسئلہ
دیکھیں کہ بیٹی کو آپ کھلی آزادی دے سکتی ہیں یا پردے کی پابندی کرتے ہوئے تعلیم جاری
رکھنے کی اجازت دیتی ہیں۔ہمارا مشورہ ہے کہ اپنی بیٹی سے صرف ایک بات کہہ دیں ، اگر

اس کی سمجھ میں آئے تو ٹھیک اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو نتائج افسوس ناک ہو سکتے ہیں۔‘‘

’’میں اپنی بیٹی کو سمجھاؤں گی۔آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’آپ صرف یہ کہہ دیں کہ تیز دوڑنے والوں کے ساتھ ریس نہیں لگانی چاہئے۔
یوں ترقی کی دوڑ میں اکثر لوگ اوندھے منہ گرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کی بیٹی کو دین
وایمان کی روشنی عطا فرمائے۔آمین۔‘‘

ہاشمی صاحب نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔حقی صاحب نے کہا۔’’جزاک اللہ۔
آپ نے نہایت شائستگی سے خاتون کو سمجھایا ہے خدا کرے کہ ان ماں بیٹی کی سمجھ میں بات
آجائے۔‘‘

بات تو حقی صاحب کو بھی سمجھنی تھی۔وہ اپنے بیٹی کے معاملے میں اندر ہی اندر الجھ
رہے تھے۔ایسے وقت وارڈ بوائے نے آکر کہا۔’’جناب! پارٹی لیڈر حشمت شیرازی آئے
ہیں۔آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔‘‘

حقی صاحب نے ہاشمی صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔پھر کہا۔’’یہ اتنے
بڑے لیڈر صاحب یہاں مجھ سے ملنے آئے ہیں۔یہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔‘‘

ہاشمی صاحب نے پوچھا۔’’یہ آخر آپ سے چاہتے کیا ہیں؟‘‘

’’اور کیا چاہیں گے؟ میری حمایت چاہتے ہیں۔یہ حضرت جانتے ہیں کہ میں ان
کی پارٹی کی حمایت کروں گا، اور ان کے جلسوں میں ان کی پارٹی کی حمایت کروں گا تو اس
علاقے کے سارے ووٹ ان کے امیدوار کو ہی ملیں گے۔‘‘

’’یہ تو آپ پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی ہے، اس علاقے کے بچے بوڑھے عورتیں
اور مرد سب ہی آپ کو دل وجان سے چاہتے ہیں۔‘‘

انہوں نے وارڈ بوائے سے کہا۔’’جاؤ۔انہیں یہاں بھیج دو۔‘‘

وہ چلا گیا۔انہوں نے کہا۔’’اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جو لوگ مجھے دل وجان سے
چاہتے ہیں، مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔میں انہیں کسی غلط امیدوار کو ووٹ دینے کا مشورہ
دوں۔چھ برس پہلے ان کی پارٹی نے اقتدار حاصل کیا تھا۔لیکن یہ لوگ زیادہ سے زیادہ تین
برس تک حکومت کر پائے ، ایسی لوٹ کھسوٹ مچائی کہ فوج کو مداخلت کرنی پڑی۔اس کے

بعد جو الیکشن ہوئے اس میں یہ نا کام ہوئے۔ یہ پھر کامیابی حاصل کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں اپنا اثر رسوخ بڑھا رہے ہیں۔ امیدوار تبدیل کر رہے ہیں۔ اور ہماری نیک نامی سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔ انہوں نے کہا۔ ''تشریف لے آئیں۔''

حشمت شیرازی نے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے کہا۔ ''السلام علیکم۔''

پھر اس نے ان دونوں سے مصافحہ کیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا بڑا سا کین تھا۔ اس نے کین کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آبِ زمزم آپ کے لئے ہے۔ مجھے عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ وہاں بھی آپ کے لئے دعائیں کرتا رہا۔''

حقی صاحب نے کہا۔ ''تشریف رکھیں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کو عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔''

اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''حضور! آپ نے تو میری دنیا ہی بدل دی ہے۔ پہلی بار آپ کے پاس آیا تو بہت خود غرض تھا۔ اپنے امیدوار کو کامیاب کرانے کے لئے آپ کی حمائت چاہتا تھا۔ دنیاوی خواہشات نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی اور فرمایا کہ آپ آئندہ الیکشن میں اس کی حمایت کریں گے، جو دین دار ہوگا، اور جس کے دل میں خدا کا خوف ہوگا۔ اور میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ دینی احکامات کی سختی سے پابندی کرتا رہوں گا۔''

انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک۔ آپ نے ایسا وعدہ کیا تھا۔''

حشمت شیرازی نے کہا۔ ''آپ نے دوسری ہی ملاقات میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں یہ تسبیح تھی۔ اور میں پانچوں وقت کا نمازی بن چکا تھا۔ آپ کی صحبت سے اس قدر فیض حاصل ہو رہا ہے کہ تیسری بار یہاں آنے سے پہلے خانہ کعبہ میں نمازیں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت محمد ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری بھی دی۔ یہ سب کچھ آپ کے طفیل ہو رہا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ دل و جان سے دینی احکامات کی پابندی کر رہے

ہیں؟ اور سیاست سے باز آ چکے ہیں؟''

وہ ذرا گھبرایا۔ ذرا سیدھا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''حضور! جب تک سانس چلتی رہتی ہے، دنیا کے کام پیچھا نہیں چھوڑتے۔ دین کے ساتھ ساتھ دنیاداری بھی چلتی رہتی ہے۔ اگر میں ایک عام سا لیڈر ہوتا تو سیاست چھوڑ دیتا، لیکن میرے پیچھے تمام صوبوں کے سیاست داں ہیں۔ میں نے سیاست چھوڑی تو تمام سیاست داں ڈوب جائیں گے۔ ہماری پارٹی ملک کی ایک بڑی پارٹی کہلاتی ہے۔''

''اس بڑی پارٹی نے اپنے دورِ حکومت میں غریب عوام کو پہلے سے بھی زیادہ غریب بنا دیا۔''

وہ عاجزی سے بولا۔ ''بے شک۔ ہم سے کچھ غلطیاں ہوئیں۔ لیکن جب سے میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کیا ہے۔ نمازیں پڑھنے لگا ہوں تو اب خدا کا خوف مجھ پر طاری رہنے لگا ہے۔ مجھے ہدایات کی روشنی مل رہی ہے۔ اور میں نے خانہ کعبہ میں نماز ادا کرتے وقت گڑگڑا کر دعاء مانگی ہے' آئندہ مجھے اقتدار حاصل ہوگا، تو میں اپنے ملک و قوم کی خدمت کروں گا، اور اسلامی قوانین پر اس طرح عمل کراؤں گا کہ ہمارا ملک دوسری تمام اسلامی ممالک کے لئے ایک بہترین مثال بن جائے گا۔''

حقی صاحب نے کہا۔ ''آپ دین کے تمام احکامات پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا آپ کو داڑھی رکھنی چاہئے۔''

وہ اپنی تھوڑی کو چھوتے ہوئے بولا۔ ''حضور! میں نے رکھی تھی۔ عمرہ سے واپسی تک داڑھی تھی پھر اچانک ہی ایسے دانے ابھرنے لگے کہ علاج کی خاطر مجھے کلین شیو ہونا پڑا۔''

ہاشمی صاحب نے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دانے تو نظر نہیں آ رہے؟''

''جی ہاں۔ علاج سے افاقہ ہو رہا ہے۔ آج سے شیو بڑھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ۔ آئندہ ملاقات میں آپ مجھے داڑھی کے ساتھ ہی دیکھیں گے۔''

حقی صاحب نے کہا۔ ''اللہ آپ کو ہدایت دے۔ ہمارا کام تو صرف سمجھانا ہے۔ اور صحیح راستہ دکھانا ہے۔''

''آپ یقین کریں۔ میں آپ کے بتائے ہوئے راستوں پر عمل کر رہا ہوں۔

آپ نے بھی وعدہ کیا ہے کہ میں دینی احکامات کی تعمیل کرتا رہوں گا تو آئندہ الیکشن میں آپ میری حمایت کریں گے۔''

''آپ پہلے تمام احکامات کی تعمیل تو کریں۔ صرف نمازیں پڑھنے سے احکامات کی تعمیل نہیں ہوگی۔ قران پاک کی تعلیمات اور حضورﷺ کی ہدایات کے مطابق دنیاوی فرائض بھی ادا کرنے ہوں گے۔ اپنے اعمال سے ثابت کرنا ہوگا کہ آپ کے اندر خوف خدا ہے۔ آپ انسانوں کے صحیح حقوق ادا کر رہے ہیں۔ ایک بہت بڑے سیاست داں اور ایک بڑے رہنما کی حیثیت سے عوام کی مشکلات دور کر رہے ہیں۔''

''یہ تو اسی وقت ممکن ہے۔ جب مجھے اقتدار حاصل ہوگا۔''

''کوئی ضروری نہیں ہے کہ حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر آپ عوام کی مشکلات دور کریں۔ حکمرانی کے بغیر کتنے ہی باحیثیت بااختیار اور دولت مند لوگ ہیں جو مختلف ادارے قائم کرتے ہیں۔ اور عوام کے مسائل حل کرتے ہیں۔ میں اس ملک کا تو کیا اپنے علاقے کا بھی حاکم نہیں ہوں۔ پھر بھی میں نے اپنے اعمال سے لوگوں کے دل جیت لئے ہیں۔ میں حکومت کی کرسی پر نہیں، لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ بھی یہی ثابت کریں۔ میں آپ کے اعمال کا حساب کرتا رہوں گا۔ جب آپ خود کو سچے محب وطن اور مومن ثابت کرلیں گے۔ تو خدا گواہ ہے کہ میں صرف اور صرف آپ کی حمایت کروں گا۔''

انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔''میں باتوں میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتا، آپ کو بھی نہیں کرنا چاہئے، اپنے اپنے دینی اور دنیاوی فرائض میں مصروف رہنا چاہئے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔''

وہ سب ہسپتال سے باہر آئے، حشمت شیرازی نے مصافحہ کر کے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔''میرا وعدہ ہے کہ میں اپنے اعمال سے خود کو ایک سچا مومن ثابت کر کے دکھاؤں گا۔''

اس دوران میں وہ تسبیح حشمت شیرازی کی انگلیوں کے درمیان تھی۔ اور انگلیاں اس کے دانوں پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کیا پڑھ رہا تھا؟ جب کہ تمام وقت باتوں میں مصروف رہا تھا۔

☆☆☆

آفرین آئینے کے سامنے بیٹھی بن سنور رہی تھی۔ صابرہ پھوپھی اس کے پیچھے کھڑی بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی''بھائی جان اصولوں کے پابند ہیں۔ تم ان کی بیٹی ہو میں ان کی سگی بہن ہوں۔ لیکن وہ ہمارے کمروں میں کبھی نہیں آتے۔ وہ ہر حال میں شرم وحیاء کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔''

آفرین نے کہا۔''میرے بابا جانی بہت اچھے ہیں۔ مگر ان کے اصولوں سے وحشت سی ہوتی ہے۔ ہمیں کچھ تو آزادی ہونی چاہئے۔''

پھوپھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اتنی پابندیوں میں بھی تمہارا یہ حال ہے۔ زبردست میک اپ کرتی ہو۔ بہترین تراش خراش کے لباس پہنتی ہو۔ بھائی جان کے سامنے سے گزرتی ہو تو عبا میں چھپی رہتی ہو۔ چہرے پر نقاب ہوتا ہے۔ ہونٹوں پر چیختی ہوئی لپ اسٹک دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔ کسی دن بھائی جان نے تمہارا یہ روپ دیکھ لیا تو مجھ پر مصیبت آجائے گی۔''

''بابا جانی تو کبھی اس کمرے میں آتے ہیں، نہ ہی کبھی آئیں گے۔ میں ان کے سامنے ڈھیلے ڈھالے لباس پہن کر سر پر چادر رکھ کر جاتی ہوں۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ میں یوں چوری چھپے اپنی حسرتیں پوری کرتی رہتی ہوں۔''

اس نے سنگھار میز کے پاس سے اٹھ کر الماری کھولی۔ وہاں سے ایک البم نکالی۔

صابرہ پھوپھی نے کہا۔''اب کالج جانے کا وقت ہو رہا ہے تو البم نکال رہی ہو۔ بچپن کی تصویریں کتنی بار دیکھوگی؟''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ہاں۔ بابا جانی نے بچپن ہی میں تصویریں اتروانے کی اجازت دی تھی۔ جوان ہونے پر کسی فوٹو گرافر کو کبھی روبرو آنے نہیں دیا۔''

یہ کہہ کر اس نے البم کھولی تو صابرہ پھوپھی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہاں کسی ماہر کیمرہ مین کے ذریعے کھنچی ہوئی اس کی بہت ہی خوبصورت سی ایک تصویر تھی۔ پھر دوسرے صفحے پر دوسری مختلف پوز میں تصویر تھی، اس کے بعد تیسرے پر تیسری اور چوتھے پر چوتھی تصویر بڑی حشر سامانیوں کے ساتھ تھی۔

ایسے ایسے پوز ایسے ایسے انداز کہ صابرہ پھوپھی نے حیرت سے بڑی ہی دھیمی مگر

چیختی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ ''یہ۔یہ کہاں سے کھنچوائی ہے؟ ارے! بھائی جان دیکھیں گے تو قیامت آجائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا پھوپھی جان! بابا جانی میری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ جب کمرے کے اندر نہیں آتے ہیں تو یہ البم کیسے دیکھ لیں گے؟''

اس نے البم سے ایک تصویر نکالی پھر اسے کتاب میں رکھ لی۔ پھوپھی نے پوچھا۔ ''کیا اسے یونیورسٹی لے جارہی ہو؟''

''ہاں۔ایک لڑکی سے دوستی ہوگئی ہے۔ اس نے کہا ہے' آج مجھے اپنی تصویر لاکر دے گی۔ اور میں اسے اپنی تصویر دوں گی۔''

''یہ کسی نامحرم کے ہاتھ میں بھی جاسکتی ہے۔''

''اس نے وعدہ کیا ہے کسی کے ہاتھ لگنے نہیں دے گی۔ زیادہ سے زیادہ اس کے والد اس کے بھائی اور دوسرے رشتے دار دیکھیں گے۔ اب میں ایسی موم کی تو نہیں ہوں کہ کسی کے دیکھنے سے ہی پگھل جاؤں گی۔''

اس نے عباء پہنی چہرے پر نقاب ڈالی آنکھوں پر سیاہ چشمہ رکھا پھر کتابیں اور کاپیاں اٹھا کر پھوپھی کے آگے سر جھکایا۔ اس کی امی بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ تب سے صابرہ خاتون نے ایک ماں کی بھرپور ممتا کے ساتھ اس کی پرورش کی تھی۔ اس نے پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''جاؤ بیٹی! اللہ خیر خیریت سے واپس لائے۔''

وہ باہر جانے سے پہلے اپنے بابا جانی کے سامنے پیش ہوتی تھی۔ انہیں سلام کرتی تھی ان سے دعائیں لیتی تھی۔ پھر باہر قدم نکالتی تھی۔ اس وقت وہ موجود نہیں تھے۔ باہر اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ بوڑھے ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آکر گاڑی اسٹارٹ کرکے وہاں سے جانے لگا۔

عبدالسلام حقی نے اپنی بیٹی کی خدمات کے لئے ایک بوڑھے ڈرائیور کو مامور کیا تھا۔ پہلے اس کے متعلق اچھی طرح چھان بین کی تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی تھا اور جوانی سے ہی داڑھی رکھتا ہوا آیا ہے۔ ان کے کئی معزز احباب نے گواہی دی تھی کہ یہ بوڑھا نیک نیت ہے۔ پھر یہ کہ بیٹی باہر آکر بھی پوری طرح نقاب میں ہی رہتی ہے۔ انہوں نے پوری

طرح اطمینان حاصل کرنے کے بعد اسے اسکول سے کالج' پھر کالج سے یونیورسٹی تک جانے کی اجازت دی تھی۔

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی گھر سے تعلیمی اداروں تک کھڑکی سے باہر دنیا کو اور دنیا والوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ چار دیواری سے باہر دنیا اتنی دور تک پھیلی ہوئی تھی کہ دیکھتے دیکھتے دل نہیں بھرتا تھا۔ دل میں یہ خواہش مچلتی تھی کہ وہ اس سے بھی آگے دنیا کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھتی چلی جائے۔

نوخیز عمر کا تقاضہ بھی یہی ہوتا ہے کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک محبت کرنے والا خوبرو ہمسفر بھی ہو۔ کل سے اس کی سوچ میں ایک اہم تبدیلی آگئی تھی۔ ایک ہمسفر کے متعلق سوچتے ہی عامر جان تصور میں چلا آتا تھا۔ اگرچہ اس نے انسلٹ کی تھی۔ اور وہ اس سے انتقام بھی لینا چاہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنی جاگیر سمجھ کر اس کے خیالوں میں زبردستی آنے لگا تھا۔

یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں عامر جان کو تلاش کرنے لگیں۔ ایک گھنٹے کے بعد کلاس شروع ہونے والی تھی۔ وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی لائبریری میں آئی۔ وہاں کئی میزوں کے اطراف اسٹوڈنٹس بیٹھے ہوئے یا تو پڑھنے میں مصروف تھے۔ یا ایک دوسرے سے دھیمی سرگوشیاں کررہے تھے۔

وہ ایک کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ پڑھتا بھی جارہا تھا اور کاپی پر کچھ نوٹ بھی کرتا جارہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ والی ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ اس وقت وہ پوری طرح نقاب میں تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ پچھلے روز اس نے آفرین کی جو صورت دیکھی تھی، وہ صورت اسے نظر نہیں آئی تھی۔

وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی ایک پلاننگ پر عمل کرنے آئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کس طرح منصوبے پر عمل شروع کرے۔ عامر جان نے اس کی کتابیں اور کاپیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں صرف بیٹھنے آئی ہو یا لائبریری کی کتابیں بھی پڑھنا چاہو گی؟''

''میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ مجھے پتہ نہیں ہے کہ اسلامک لٹریچر سے تعلق رکھنے والی کتابیں کس طرف رکھی ہوئی ہیں۔''

"کوئی بات نہیں۔ میں لا کر دے سکتا ہوں۔ آپ کون سی کتاب پڑھنا چاہیں گی؟"

"آپ اپنی ہی چوائس سے کوئی سی بھی کتاب لے آئیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "ابھی آتا ہوں۔"

وہ اپنی کتابیں اور کاپیاں وہیں میز پر چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی آفرین نے ایک کتاب سے اپنی تصویر نکالی پھر فوراً ہی اس کی ایک کتاب کے اندر اسے رکھ دیا۔ اس کے بعد سیدھی ہو کر بیٹھ گئی،

زندگی میں پہلی بار کسی سے انتقام لینے کے لئے وہ ایسی حرکت کر رہی تھی، اندر سے گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد کتاب لے کر آیا۔ اسے دیتے ہوئے بولا۔ "اسے پڑھ کر دیکھیں۔ اگر گھر لے جا کر اسٹڈی کرنا چاہو تو میں اسے تمہارے نام پر جاری کرا دوں گا۔"

وہ اپنی جگہ بیٹھ کر پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "عجیب بدذوق ہے۔ ایک جوان لڑکی عباء میں چھپی ہوئی پاس بیٹھی ہے۔ اس کے اندر ذرا سا بھی تجسس نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟ اسے کوئی تو سوال کرنا چاہئے تھا۔ کچھ تو دلچسپی لینی چاہئے تھی۔ اونہہ....."

عامر خان آخر انسان تھا۔ اس کے اندر بھی تجسس تھا' ایک ذرا بے چینی سی تھی۔ لیکن وہ بہت ہی ریزرو رہنے کا عادی تھا۔ اس لئے اس سے کچھ بولنے کی خواہش ہونے کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔ اسے کتابِ حسن کو پڑھنا چاہئے تھا' مگر اپنی کتاب پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

ایسے وقت شائستہ نے آ کر کہا۔ "ہائے! تم یہاں بیٹھی ہو؟"

آفرین فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر شائستہ کو ذرا دور لے جاتے ہو سمجھانے لگی۔ "یہاں میرا نام نہ لینا۔ کل اس نے مجھے الو بنایا تھا۔ آج میں اسے بنا رہی ہوں۔"

شائستہ نے مسکرا کر کہا۔ "اوہو۔ یہی تو میں دور سے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ کل تمہیں اتنی نفرت تھی اس سے اور آج اس کے ہی ساتھ لگی بیٹھی ہو۔ آخر ہو کیا رہا ہے؟"

"ہونا کیا ہے۔ کل اس نے مجھے پوری کلاس کے سامنے تماشہ بنایا تھا۔ آج میں

اسے تماشہ بنا کر رہوں گی۔"

"دیکھو آفرین! اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ اسے اپنا عاشق بنا کر الو بنا سکو گی تو ابھی سے لکھ کر دے دوں کہ ناکام رہو گی۔ یہ لڑکیوں کے معاملے میں بالکل ہی ٹھس ہے۔ کسی سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ کوئی لڑکی بات کرے تو مختصر سی گفتگو کرتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔"

"میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ جو بات کرنے کے بہانے اس کے قریب ہونا چاہتی ہیں۔ بس میرا کام ہو گیا۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ابھی تو کلاس شروع ہونے میں بہت وقت ہے۔ میں یہاں ایک کتاب لینے آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر اسٹڈی کروں گی۔ تم بھی بیٹھو۔"

"نہیں۔ اب میں جاؤں گی۔ سر عزیز الدین سے ایک ضروری کام ہے۔"

وہ پلٹ کر اپنی کتابوں کے پاس آئی۔ انہیں اٹھاتے ہوئے ایک نظر عامر جان پر ڈالی پھر زیر لب مسکراتی ہوئی لائبریری ہال سے باہر آ گئی۔

پچھلے روز شائستہ نے اسے سر عزیز الدین کے بارے میں بتایا تھا۔ کہ وہ بہت ٹوہ لینے والے پروفیسر ہیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر کوئی محبت کی پینگیں بڑھاتا ہوا دکھائی دے، یا کوئی محبت نامہ لکھتی ہوئی پکڑی جائے تو اس کے خلاف سخت ایکشن لیتے ہیں۔

وہ پہلے کومن روم میں آئی۔ وہاں اس نے اپنی عباء اتاری۔ نقاب سے باہر ہوئی پھر سر عزیز الدین کے دروازے پر پہنچ کر اسے ذرا سا کھول کر پوچھا۔ "مے آئی کم ان سر!"

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "آ جاؤ۔"

وہ مسکین سی صورت بنائے' سر جھکائے میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

انہوں نے پوچھا۔ "ہوں۔ کیا پرابلم ہے؟"

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "سر! میں یہاں بالکل نئی ہوں۔ آج دوسرا دن ہے۔ کل یہاں آئی تو ایک نوجوان اسٹوڈنٹ میرے پیچھے ہی پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ مجھ سے دوستی کرو گی تو یہاں بہت فائدے میں رہو گی۔ میں تم سے سینئر ہوں۔ تمہاری مدد کرتا رہوں گا۔"

انہوں نے غرّانے کے انداز میں کہا۔ "ہوں...."

وہ بولی۔ "میں نے اس کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ ایسے وقت میرے ہاتھوں

سے کتابیں چھوٹ کر گر پڑیں۔ میری کتابوں کے درمیان اپنی ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی اس نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اسے اپنی کتاب میں رکھتے ہوئے بولا' اسے میں یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔ دن رات اسے دیکھتا رہوں گا۔ تمہاری پوجا کرتا رہوں گا۔ اور پتہ نہیں کیا کچھ بکتا رہا۔ میں نے تصویر مانگی تو دینے سے انکار کر دیا اور پلٹ کر چلا گیا۔''

سر عزیز الدین نے غصے سے پوچھا۔ ''کون ہے وہ نالائق؟''

''میں نے دوسروں سے معلوم کیا تو پتہ چلا' اس کا نام عامر جان ہے۔ اگرچہ ایک طالب علم ہے لیکن خود کو بہت بڑا سیاست دان سمجھتا ہے۔''

سر نے بے یقینی سے کہا۔ ''تعجب ہے، وہ لڑکا ایسا تو نہیں ہے۔ بہت ذہین اور سمجھدار ہے۔ اخبارات میں اس کے کالم شائع ہوتے ہیں۔ اور اس کی بڑی تعریفیں ہوتی رہتی ہیں۔''

آفرین نے کہا۔ ''سر! جو ذہین ہوتے ہیں کیا وہ کسی دوسرے پہلو سے ابنارمل نہیں ہوتے؟ اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو آپ اس کی کتاب کھول کر دیکھیں، پھر اس کا محاسبہ کریں کہ اس نے زبردستی میری تصویر کیوں لی؟ کیوں اپنی کتاب میں رکھی؟''

انہوں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک۔ اگر یہ ثبوت مل جائے گا تو میں سختی سے پیش آؤں گا۔ چلو اٹھو! کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔ وہ بھی کلاس میں ضرور آئے گا۔''

اس نے کہا۔ ''سر! ایک عرض ہے.........''

''بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں لڑکی ہوں۔ بدنام ہونا نہیں چاہتی۔ آپ سختی سے کوئی نوٹس نہ لیں۔ اسے یہاں تنہائی میں بلا کر ذرا ڈانٹ دیں۔ اسے تاکید کریں کہ آئندہ کبھی مجھے تنگ نہ کیا کرے۔''

''میں کوشش کروں گا کہ معاملہ اسکینڈل نہ بنے۔''

''سر! پہلے میں جاتی ہوں۔ آپ تھوڑی دیر کے بعد آئیں۔ اسے یہ نہ معلوم ہو کہ میں نے شکایت کی ہے۔ آپ اپنے طور پر اس کا محاسبہ کریں۔''

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر شکریہ ادا کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کا دل کھلکھلا کر ہنسنے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ صبر کر رہی تھی۔ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

سر عزیز الدین پندرہ منٹ کے بعد کلاس میں پہنچے تو وہاں تمام اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ انہوں نے کلاس میں آ کر سب سے پہلے عامر جان پر نظر ڈالی، پھر طلبا اور طالبات کے درمیان سے گزرتے ہوئے بولے۔ ''بعض افراد کا ظاہر کچھ ہوتا ہے۔ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ آج میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں' کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟''

وہ بولتے ہوئے عامر جان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اس کی کتاب اٹھا کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس کتاب میں کچھ نہیں تھا۔ عامر جان کچھ بے چین سا ہو گیا۔ پریشان ہو کر کبھی پروفیسر کو اور کبھی دور بیٹھی ہوئی آفرین کو دیکھنے لگا۔ انہوں نے دوسری کتاب اٹھا کر اسے کھولا تو اندر سے آفرین کی ایک خوبصورت سی مسکراتی ہوئی تصویر نکل آئی۔

انہوں نے کتاب کو بند کیا۔ پھر تمام کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''عامر جان ہماری پوری یونیورسٹی کا ایک قابل فخر اسٹوڈنٹ ہے۔ ہم پیش گوئی کرتے ہیں کہ یہ آئندہ سیاست میں بہت نمایاں مقام حاصل کرے گا۔ لیکن انسان کتنا ہی ذہین سنجیدہ اور باشعور ہو۔ اس کے اندر بھی کوئی نہ کوئی کمزوری چھپی رہتی ہے۔''

پروفیسر نے کتاب کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''موصوف کی ایک کمزوری آج ظاہر ہوئی کہ یہ لڑکیوں کو چھیڑتے بھی ہیں۔''

کلاس کے تمام اسٹوڈینٹس نے چونک کر پروفیسر کو دیکھا۔ پھر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ پروفیسر نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن اب میں یہ بات ٹھوس ثبوت کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔''

انہوں نے تصویر کو کتاب میں سے نکال کر فضا میں ہاتھ بلند کیا۔ اسے پوری کلاس کو دکھایا، سب ہی حیرانی سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ عامر جان نے پریشان ہو کر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''سر! یہ۔ یہ تصویر میں نے کسی سے لی نہیں ہے۔ پتہ نہیں یہ کتاب میں کہاں سے چلی آئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اسے کس نے یہاں رکھا ہے۔''

پروفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اچھا۔ یہ خود بخود آ گئی۔ غیب سے تمہاری کتاب کے اندر پہنچ گئی۔ تم کس قدر ذہین کہلاتے ہو، اور کس قدر بچکانہ باتیں کر رہے ہو۔''

پروفیسر نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چلو! اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور پوری کلاس کو بتاؤ کہ تم نے کس طرح اس تصویر کو جبراً مس آفرین سے چھین لیا۔ اور اسے اپنی کتاب میں رکھ کر یہاں چلے آئے۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر سر گھما کر آفرین کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پروفیسر سے پوچھا۔ ”سر! یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ میں نے مس آفرین سے یہ تصویر چھینی ہے؟“

پروفیسر نے کہا۔ ”آفرین! جھجکنے اور شرمانے کی بات نہیں ہے۔ سب کے سامنے بتاؤ کہ عامر جان کے کردار کا ایک ڈارک پہلو یہ بھی ہے۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سر جھکائے بولی۔ ”میں کیا بتاؤں سر! جو کہنا تھا وہ تو آپ سے کہہ چکی ہوں۔“

عامر جان نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ”مس آفرین! کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ پروفیسر درست کہہ رہے ہیں؟ میں نے جبراً یہ تصویر تم سے حاصل کی ہے؟“

آفرین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر یوں کھڑی رہی جیسے پروفیسر کے لگائے ہوئے الزام کی تائید کر رہی ہو۔

عامر جان نے زیر لب طنزیہ انداز میں مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ”مس آفرین! جب بات کھل ہی گئی ہے تو ہمیں بھی دنیا والوں سے کچھ نہیں چھپانا چاہئے۔ جو سچ ہے وہ سب کے سامنے کہہ دینا چاہئے۔“

پروفیسر نے پوچھا۔ ”سچ کیا ہے؟“

”حقیقت یہ ہے سر! تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مس آفرین کو چاہنے لگا ہوں۔ اور یہ سلسلہ کوئی یک طرفہ نہیں ہے۔ یہ بھی مجھے دل و جان سے چاہتی ہیں۔“

آفرین نے ایک دم سے چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے ایسی بات کہہ دی تھی، جسے سننے کے لئے جوان لڑکیوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ پھر عامر جیسا خوبرو اور ذہین نوجوان سب کے سامنے کہہ رہا تھا کہ اسے چاہنے لگا ہے۔

ان لمحات میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی اس چاہت سے انکار کر دینا چاہئے، صاف کہہ دینا چاہئے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور وہ تصویر اس نے مجھ سے چھین لی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فوری طور پر وہ کیا فیصلہ کرے؟ اور سب کے سامنے کیا جواب دے؟

عامر جان نے کہا۔ ”سر! ایسے حالات میں لڑکیاں تو ویسے ہی بے زبان ہو جاتی ہیں۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتیں۔ چونکہ مجھ پر یک طرفہ الزام عائد ہو رہا ہے، اس لئے میں صاف طور پر کہہ رہا ہوں جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟ ہم دونوں نے تنہائی میں ایک دوسرے سے محبت کے قول و قرار کئے ہیں۔ میں نے ان سے تصویر مانگی تو انہوں نے دے دی۔ انہوں نے مجھ سے بھی مانگی تو میں نے بھی انہیں دے دی۔ جس طرح میری کتاب میں ان کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ اسی طرح آپ دیکھ سکتے ہیں' ان کی کتاب میں بھی میری تصویر رکھی ہوئی ہے۔“

یہ ایسی بات تھی کہ آفرین ایک دم سے چونک گئی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میری کتاب میں عامر جان کی تصویر کیسے آ جائے گی؟ نہیں یہ حضرت باتیں بنا رہے ہیں۔“

تمام طالب علم ڈیسک بجا کر کہنے لگے۔ ”ہائے محبت ہائے ہائے، واہ محبت واہ......“

ایک لڑکے نے اٹھ کر کہا۔ ”سر! انصاف کا تقاضہ ہے کہ مس آفرین کی کتابیں بھی چیک کی جائیں۔“

پروفیسر آفرین کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت تک وہ بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ عامر جان جیسے خوبرو اور ذہین نوجوان نے ساری کلاس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا۔ اب دل کہہ رہا تھا کہ کل سے وہ بھی اس سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتی آ رہی تھی۔ اس سے انتقام لینے کا تو محض ایک بہانہ تھا۔ اپنی تصویر اس کی کتاب میں رکھنے کا مطلب یہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس کے نام سے بدنام ہونا چاہتی ہے۔ اور اب بدنام ہو رہی تھی۔ اور ایسے ہی وقت کہا جاتا ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا.....؟

پروفیسر نے اس کی ایک کتاب اٹھائی۔ تمام کلاس میں خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ بڑے ہی تجسس بھرے لمحات تھے۔ جب وہ کتاب کھولی گئی تو آفرین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ عامر جان کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ کتاب سے اس کی مسکراتی ہوئی ایک تصویر برآمد ہوئی تھی۔

ایک طالب علم نے کہا۔ ”سر! جس طرح آپ نے مس آفرین کی تصویر سب کو دکھائی، اسی طرح اس تصویر کو بھی دکھائیں۔ معلوم تو ہو کہ واقعی تالی دونوں ہاتھوں سے بج رہی ہے۔“

پروفیسر نے اس تصویر کو آفرین کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا مذاق ہے؟ تم لوگ یہاں پڑھنے نہیں محبتیں کرنے آتے ہو۔ محبت نامے لکھتے ہو۔ تصویروں کے تبادلے کرتے ہو۔“

وہ غصے سے چلتے ہوئے ڈائس پر آئے تو عامر جان نے کہا۔ ”سر! ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اگر تصویروں کا تبادلہ کیا ہے تو اس کے پیچھے ایک بہت اہم اور شریفانہ مقصد ہے۔“

پروفیسر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ”ذرا میں بھی تو سنوں کہ وہ شریفانہ مقصد کیا ہے؟“

”میں نے مس آفرین کی تصویر اس لئے لی ہے کہ گھر جا کر اپنے والدین کو دکھاؤں گا۔ اور ان سے صاف طور پر کہوں گا کہ یہ میری پسند ہے، اور یہی میری شریک حیات بن سکتی ہیں۔ لہٰذا میرے بزرگوں کو رشتہ مانگنے کے لئے ان کے گھر جانا چاہیے۔“

تمام طلبہ اور طالبات ڈیسک بجا کر کہنے لگے۔ ”ویل ڈن عامر جان! ویل ڈن۔“

پروفیسر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کیپ کوائٹ.....“

سب خاموش ہو گئے۔ پروفیسر عزیز الدین نے کہا۔ ”پہلے میرے سامنے مس آفرین نے جھوٹی رپورٹ دی اور عامر جان نے کہا کہ وہ تصویر کتاب میں پتہ نہیں کہاں سے چلی آئی ہے۔ جب چوری پکڑی گئی تو محبت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔“

انہوں نے دونوں کو گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ”جب یہ کہا گیا کہ تعلیمی ادارے میں

عشق اور محبت کے تماشے نہیں ہونے چاہئیں تو اب یہ بات شادی تک پہنچائی جا رہی ہے۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ' یہ دونوں ہی جانتے ہیں۔ میں ان دونوں کو کلاس سے باہر جانے کا حکم دیتا ہوں۔ آئندہ جب یہ کلاس میں آئیں تو ہم خیال ہوں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی نہ کریں۔ کم آن... گٹ آؤٹ فرام ہیئر.....“

آفرین کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اپنی کتابیں اور کاپیاں اٹھائے کلاس روم سے باہر آ گئی۔ بوجھل قدموں سے ایک طرف چلنے لگی۔ وہ عجیب کیفیات سے دو چار ہو رہی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انتقام لینا چاہے گی یا بدلہ لینا چاہے گی تو خود اس کے نام سے بدنام ہو جائے گی۔ اور یہ بے حد پریشانی کی بات تھی کہ اسے یہ بدنامی اچھی لگ رہی تھی۔

”مس آفرین.....!“

عامر جان کی آواز جیسے جان سے آ کر ٹکرائی، اس کے قدم رک گئے۔ وہ قریب آ کر بولا۔ ”جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ اگر مجھے یکطرفہ بدنام نہ کیا جاتا تو میں تنہائی میں سب سے چھپ کر تم سے محبت کا اظہار کرنے والا تھا۔ بہرالحال جو بھی ہوا بہتر ہی ہوا کل میں نے تمہارا مذاق اڑایا لیکن زندگی میں پہلی بار میرا دل تمہاری محبت میں ایک مذاق بن گیا۔ میں نے چاہا کہ یہ محبت عارضی ہو صرف جذباتی ہو، اور جلد ہی ختم ہو جائے لیکن تمام رات تمہیں ہی یاد کرتا رہا، تمہارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔“

وہ چپ چاپ سر جھکا کر سنتی رہی۔ وہ کھلے دل سے محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔ اس کی ایک ایک بات پر دل تیزی سے دھڑکتا جا رہا تھا۔ وہ پاس والی دیوار سے لگ گئی تھی۔ اگر نہ لگتی تو خود کو سنبھال نہ پاتی شائد گر پڑتی۔

”میں نے لائبریری میں تم سے دور جا کر دیکھا تو تم میری کتاب کھول کر کچھ رکھ رہی تھیں۔ تب ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ میں اپنی تصویر بھی تمہاری کتاب میں رکھ دوں۔ اس طرح تم سے کچھ بات کرنے کا بہانہ ہاتھ آئے گا۔“

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”جب تم شائستہ سے بات کرنے کے لئے ذرا دور ہو گئی تھیں۔ اسی وقت میں نے موقع پا کر اپنی تصویر تمہاری کتاب میں رکھ دی۔ تمہارے جانے کے بعد جب میں نے اپنی کتاب کھول کر دیکھا تو حیران رہ گیا' جو میں

نے تمہارے ساتھ کیا تھا' وہی تم نے میرے ساتھ کیا۔ دل نے پورے یقین کے ساتھ سمجھایا کہ تمہارے دل میں بھی میرے لئے جگہ ہے۔ تب ہی تو تم نے پیش رفت کے لئے اپنی تصویر مجھے دی ہے۔"

وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پا رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی' توبہ ہے میں اتنی بے باک تو نہیں ہوں کہ اپنی تصویر دے کر پیار کے معاملے میں پیش رفت کروں۔ میں نے کیا کچھ اور ہو گیا کچھ......

عامر جان نے کہا۔ "پروفیسر عزیز الدین بہت ہی جہاں دیدہ اور تجربہ کار ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ہمیں کلاس سے باہر نکالا ہے۔ تاکہ ہم کہیں آرام سے بیٹھ کر اپنے بارے میں فیصلہ کریں کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟ ہمارے بارے میں یہاں بہترین رائے اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی رہے...."

وہ ایک ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ "آؤ کیبن میں چلیں....."

وہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ساتھ چلنے پر راضی ہے یا نہیں؟ دل میں یہ اعتماد تھا کہ وہ کچے دھاگے سے چلی آئے گی۔

وہ دس منٹ کے بعد ایک میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "گرم پیو گی یا ٹھنڈا؟"

وہ سر جھکائے ہوئے تھی۔ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں تو بہت گرم تھی، کل کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ آپ نے تو بالکل ہی ٹھنڈا کر دیا۔"

"انسان کو ٹھنڈا نہیں ہونا چاہئے۔ گرما گرمی رہنی چاہئے، لہٰذا ہم گرما گرم چائے پئیں گے۔"

اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ پھر کہا۔ "میں کچھ زیادہ ہی بول رہا ہوں یا پھر پہلی ملاقات میں لڑکیاں بہت ہی کم بولتی ہیں۔ لڑکے خوب ڈینگیں مارتے ہیں۔ بعد میں لڑکیاں سارے کس بل ڈھیلے کر دیتی ہیں۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ چائے آ گئی۔ وہ دونوں چائے پیتے رہے' بولتے رہے اور ہنستے رہے۔ آہستہ آہستہ اس کی جھجک مٹتی رہی۔ اس نے کتاب سے اس کی تصویر

نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میں گھر لے جا رہا ہوں۔ اپنی امی اور ابو کو دکھاؤں گا۔ کیا تمہیں منظور ہے؟"

اس نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔ وہ بولا۔ "خاموشی نیم رضامندی کہلاتی ہے۔"

پھر اس نے اپنی تصویر نکال کر کہا۔ "یہ تم کلاس روم میں چھوڑ آئی تھیں۔ میں اسے پھر ایک بار تمہاری کتاب میں رکھ رہا ہوں۔ اگر اعتراض ہو تو کلاس روم کی طرح اسے یہاں چھوڑ جانا۔"

عامر جان نے اس کی ایک کتاب اٹھائی اسے کھول کر اپنی تصویر وہاں رکھی۔ پھر کتاب کو بند کر دیا۔ وہ جھکی جھکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی شائستگی سے محبت کا اقرار کر رہا تھا۔ ایسے وقت اسے چپ لگ گئی تھی اور اس کی یہ چپ چپکے چپکے اقرار بنتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

آفرین نے کوئی دو برس پہلے اپنے اس چچازاد بھائی جرار حقی کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ فیصل آباد میں رہتا تھا۔ اچھی خاصی زمینیں اور جائیدادیں تھیں' مگر اس نے سیاست کو کاروبار بنا رکھا تھا۔ ایک بڑی سیاسی پارٹی سے منسلک تھا۔ لیکن پچھلے الیکشن میں بری طرح ناکام رہا تھا۔

اس ناکامی کے باوجود سیاسی جوڑ توڑ میں ہی مصروف رہا کرتا تھا۔ پارٹی لیڈر نے کہا تھا کہ وہ فیصل آباد سے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس نے مشورہ دیا۔ "تم اگر کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو کراچی جاؤ، سید عبد السلام حقی تمہارے بڑے ابا ہیں۔ پورے ملک میں وہ ایک عالم دین کی حیثیت سے بہت مقبول ہیں۔ وہ جس علاقے میں رہتے ہیں' وہاں سے الیکشن لڑو گے تو ایک ایک عورت اور ایک مرد کا ووٹ تمہیں ملے گا۔ وہاں بڑے سے بڑا سیاست داں بھی تمہیں شکست نہیں دے سکے گا۔"

وہ رہائش کے لئے وہاں چلا آیا۔ آفرین نے اسے حیرانی سے دیکھا دو برس پہلے وہ کلین شیو تھا۔ بڑی سی پگڑی باندھ کر ہاتھوں میں رائفل لئے ایک وڈیرے کی شان سے گھومتا تھا۔ سینہ تان کر گردن اکڑا کر چلتا تھا۔ اب وہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ سر سے پگڑی اتر چکی تھی۔ ایک گول سی ٹوپی پہنے ہوا تھا۔ چہرے پر اچھی خاصی ایک مٹھی سے زیادہ لمبی داڑھی

تھی۔اور ایک ہاتھ کی انگلیوں میں تسبیح کے دانے پھسلتے جا رہے تھے۔

آفرین نے حیرانی سے کہا۔"ہائے جرار بھائی! آپ تو پہچانے نہیں جا رہے ہیں۔کیا دنیاداری چھوڑ چکے ہیں؟"

اس نے کہا"دنیا داری کہاں چھوٹتی ہے؟ زندہ رہنے کے لئے روٹی کپڑا اور مکان ضروری ہے۔پھر یہ کہ آباؤ اجداد کی عزت اور نیک نامی کو قائم رکھنے کے لئے اپنے زرعی پیشے سے وابستگی بھی لازمی ہے۔"

اس کے چچا میر عبدالکلام حقی نے کہا۔"بیٹی! انسان جب تک سانس لیتا رہتا ہے تب تک دین کے ساتھ دنیاداری بھی لازمی ہوتی ہے۔میں تمہارے باباجانی سے ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔صبح کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔ایسا کرو کہ میرے لئے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آؤ۔"

"ابھی لاتی ہوں چچا جان!"

وہ پلٹ کر جانے لگی۔سید عبدالکلام حقی نے کہا۔"بھائی جان! میں اپنے بیٹے کو آپ کی غلامی میں دینے آیا ہوں۔"

آفرین جاتے جاتے ٹھٹھک گئی۔پھر فوراً ہی کمرے سے باہر آ کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔اس کے چچا کہہ رہے تھے۔"آپ نے ایک بار فرمایا تھا اگر جرار آپ کے معیار کے مطابق ہو گا۔دینی احکامات کے پابندی کرے گا تو آپ اسے ضرور اپنا داماد بنائیں گے۔"

میر عبدالسلام حقی نے بڑی محبت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے اپنے بھتیجے کو دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔"میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کا ظاہر بدل چکا ہے۔ابھی اور دیکھوں گا'سوچوں گا'پرکھوں گا۔اگر ظاہر کی طرح باطن میں بھی خوف خدا ہے اور یہ نیک نیتی سے دینی احکامات پر عمل کر رہا ہے تو میں ضرور اسے اپنا داماد بناؤں گا۔"

عبدالکلام حقی نے کہا۔"بھائی جان! اب یہ آپ ہی کے پاس رہے گا۔ہم یہاں ایک کوٹھی خرید لیں گے۔میں تو فیصل آباد واپس چلا جاؤں گا۔وہاں زمینوں کا کام سنبھالتا رہوں گا۔یہ آپ کے پاس رہ کر دینی معاملات میں آپ کے نقشِ قدم پر چلتا رہے گا۔"

انہوں نے کہا۔"یہی بہتر ہو گا۔یہ میرے ساتھ رہے گا ہمیشہ نظروں کے سامنے رہے گا تو میں اسے اچھی طرح سمجھ پاؤں گا۔میری ایک ہی بیٹی ہے۔میں اس کے معاملے میں دھوکہ نہیں کھانا چاہتا۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں آپ کا سگا بھائی ہوں۔یہ آپ کا بھتیجا ہے۔ہمارا خون ہے۔کیا ہم آپ کو کبھی دھوکہ دے سکتے ہیں؟"

"دانش مندی کا تو یہی تقاضہ ہے کہ دو پیسے کی ہانڈی سے لے کر انسان تک کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھنا، جاننا اور پرکھنا چاہئے۔یہی میرا بھی طریقہ کار ہے۔تم بحث نہ کرو۔"

"میں تو آپ کی ہر بات پر سر جھکاتا آیا ہوں۔آپ سے بحث نہیں کروں گا۔آپ جو بہتر سمجھتے ہیں وہی کریں۔بس آج سے میرا بیٹا آپ کے حوالے ہے۔"

آفرین دروازے کے پیچھے کھڑی سن رہی تھی۔اس کا دل ڈوب رہا تھا۔وہ فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائینگ روم میں آئی پھر ٹیلی فون کے سامنے بیٹھ کر ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کرنے لگی۔

اس کے اندر ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے کہا۔"عامر جان! آپ کہاں ہیں؟ میں بہت پریشان ہوں۔"

عامر جان نے دوسری طرف سے پوچھا۔"میری جان کو کیا پریشانی لاحق ہو گئی ہے؟ فوراً بتاؤ، میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ کیا کریں گے؟ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں آئیں اور رشتے کی بات کریں۔لیکن آپ نے میری بات کو ٹال دیا تھا۔یہاں چچا جان فیصل آباد سے میرا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لائے ہیں۔بلکہ اسے یہاں میرے سر پر مسلط کر کے جائیں گے۔"

"آفرین! میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے ڈیڈی پچھلے ایک مہینے سے لندن میں ہیں۔کاروباری معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔وہ یہاں آئیں گے تو میں ان کے ساتھ تمہارے باباجانی سے ملنے آؤں گا۔پھر اپنا مدعا بیان کروں گا۔"

"آپ اسی انتظار میں رہیں گے تو میں اس بہروپیے کے پلے باندھ دی جاؤں گی۔ میں اس چچا زاد کو بچپن سے جانتی ہوں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ اس بار مذہب کا لبادہ اوڑھ کر بابا جانی کا دل جیتنے آیا ہے۔"

"شادی اور خانہ آبادی کے لئے لڑکی کا دل جیتنا پڑتا ہے۔ اور وہ میں جیت چکا ہوں۔ تمہاری پریشانی مجھے بھی پریشان کر رہی ہے۔ میں ابھی امی سے کہتا ہوں کہ وہ فون پر تمہارے بابا جانی سے بات کریں۔"

"وہ کسی بھی خاتون سے فون پر بات نہیں کرتے ہیں۔ آپ اپنی امی سے کہیں کہ میری پھوپھی جان سے بات کریں۔ انہیں قائل کریں۔ پھر پھوپھی جان ہماری بات کو بابا جانی تک پہنچائیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم فون بند کرو۔ میری امی ابھی تمہاری پھوپھی جان سے بات کریں گی۔"

وہ فون بند کر کے تیزی سے چلتی ہوئی صابرہ پھوپھی کے پاس آئی۔ پھر ان سے بولی۔ "پھوپھی جان! آپ ڈرائینگ روم میں آئیں۔"

"کیا بات ہے بیٹی! کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟"

"میں نے آپ کو عامر جان کے بارے میں بتایا تھا۔ ابھی ان کی امی آپ سے بات کرنے والی ہیں۔"

صابرہ پھوپھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائینگ روم میں آئی۔ اس نے کہا۔ "پتہ ہے۔ چچا جان یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"کیوں آئے ہیں؟"

"اپنے بیٹے کے لئے میرا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ وہ آپ کا بھی بھتیجا ہے۔ لیکن آپ تو جانتی ہیں کہ کیسا بہروپیا ہے۔ گز بھر کی داڑھی رکھ کر تسبیح اٹھا کر بابا جانی کو دھوکہ دینے آیا ہے۔"

پھوپھی نے کہا۔ "میں عبدالکلام حقی اور اس کے بیٹے کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ ایک میرا سگا بھائی ہے۔ دوسرا میرا اپنا بھتیجا ہے۔ پھر بھی میں تمہیں اس سے منسوب

نہیں ہونے دوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد ہی عامر جان کی والدہ نے فون کے ذریعہ ان سے کہا۔ "عامر جان میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں اس کی پسند کو اپنی پسند سمجھتی ہوں اور آپ کی بھتیجی آفرین کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ کیا رشتہ مانگنے کے لئے آج ہی آسکتی ہوں؟"

اس کی پھوپھی نے کہا۔ "کیا اپنے شوہر اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گی؟"

وہ بہت کچھ بتانے لگیں۔ صابرہ پھوپھی سنتی رہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔ "آپ ابھی فون بند کریں۔ میں بھائی جان سے بات کرتی ہوں۔ آج شام پانچ بجے ان سے ملاقات کا وقت لیتی ہوں۔ پھر آپ کو فون پر بتاتی ہوں۔"

صابرہ پھوپھی نے فون بند کر دیا۔ آفرین بے چینی سے ان کا منہ تک رہی تھی۔ ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ شائد ابھی فون پر اس کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔

صابرہ خاتون نے حقی صاحب کے بیڈ روم میں آ کر دیکھا وہاں عبدالکلام حقی اور جرار حقی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بولی۔ "بھائی جان! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

حقی صاحب نے کہا۔ "آؤ! یہاں بیٹھو۔ ہم سب ہی تمہارے اپنے ہیں۔ کسی سے کوئی پردہ نہیں ہے۔"

اس نے کہا۔ "پردہ نہ ہونے کے باوجود اپنے اپنے کچھ ذاتی معاملات ہوتے ہیں۔ میں آپ کا تھوڑا سا وقت لینا چاہوں گی۔"

عبدالکلام حقی نے کہا۔ "آپا! آپ نے تو ہمیں بالکل ہی پرایا سمجھ لیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم باپ بیٹے اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔ آپ بھائی جان سے بات کریں۔"

وہ باپ بیٹا وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ حقی صاحب نے کہا۔ "صابرہ! تم نے چھوٹے بھائی کا دل دکھا دیا۔ کیا ابھی وہ بات بہت ضروری تھی؟"

اس نے کہا۔ "جی ہاں۔ کلام کو اور اس کے بیٹے کو میں اچھی طرح جانتی ہوں اور آپ

بھی جانتے ہیں۔ ہم تمام بہن بھائی ہمیشہ ایک ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہنا چاہتے تھے ۔لیکن ابو جان کی وفات کے بعد ہی یہ اپنے حصے کی نقد رقم اور جائیداد لے کر الگ ہو گیا تھا۔ آپ نے یہ بھی دیکھا تھا۔ کہ یہ کبھی کبھی جمعے کی نماز پڑھ لیا کرتا تھا۔ ورنہ اسے دنیاوی معاملات سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی اور اب یہ ہمارا بھتیجا نمازی اور دین دار بن کر آیا ہے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولے۔ "میں انہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ وقت اور حالات کے مطابق اپنا مزاج اور اپنی طرز زندگی کو بدلتے رہتے ہیں۔"

"بھائی جان! میں یقین سے کہتی ہوں کہ یہ ہماری آفرین کو بہو بنانے کے لئے ڈھونگ رچا رہے ہیں۔"

"صابرہ! میں نادان نہیں ہوں۔ سب کچھ دیکھ رہا ہوں سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تو صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ آج جیسا کہ جرار کا ظاہر ہے۔ پوری ایمان داری سے باطن بھی ہو گا۔ تب ہی میں اسے اپنا داماد بنانا قبول کروں گا۔"

اس نے کہا۔ "بہروپیے بڑی چالاکی سے ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کا باطن بھی ظاہر کی طرح ہے۔ انہیں دھوکہ دیتے دیر نہیں لگتی۔"

"جھوٹ اور فریب چھپائے نہیں چھپتے۔ ایمان دار بننا جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ بعض اوقات ایمان کی راہ پر بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں یہی تو دیکھوں گا کہ جرار کس طرح اپنے ظاہر کے مطابق ان آزمائشوں سے گزرتا رہے گا۔"

"آپ نے ایک اور سیاست داں حشمت شیرازی کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ آئندہ الیکشن میں آپ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے نمازیں پڑھنے لگا ہے۔ عمرہ کر کے بھی چلا آیا ہے۔ کیا اس سے صاف پتہ نہیں چلتا کہ کوئی آپ کا داماد بننے کے لئے، اور کوئی سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لئے مذہب کا سہارا لے رہا ہے؟"

"بے شک۔ بہروپیے ہر دور میں اور ہر دوسرے تیسرے گھر میں ہوتے ہیں۔ میری آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں کسی سے دھوکہ نہیں کھاؤں گا۔"

"میں بھی ایک عرض کرنے آئی ہوں۔ ایک بڑے خاندان سے ہماری آفرین کے لئے رشتہ آنا چاہتا ہے۔ لڑکے کی والدہ آج ہی آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔"

انہوں نے بہن کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا تم انہیں ذاتی طور پر جانتی ہو کہ وہ کون لوگ ہیں؟"

"میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ لڑکے کا نام عامر جان ہے۔ اس کے والد بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کے مالک ہیں۔ حسب و نسب کے اعتبار سے ان کا شجرہ حضرت نظام الدین اولیا سے ملتا ہے۔"

وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ "سبحان اللہ ایسے دین دار اور خاندانی افراد سے ہم ضرور ملیں گے۔ لیکن لڑکے کی والدہ سے نہیں۔ والد سے........"

"اس کے والد ابھی لندن میں ہیں۔ آپ اجازت دیں گے تو اس کی امی یہاں آ کر پردے میں رہ کر آپ سے بات کر سکیں گی۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ لڑکے کے باپ کو لندن سے آجانے دو۔"

"بھائی جان! جلدی اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے انتہا دولت اور بے حد و حساب دینی مقبولیت عطا فرمائی ہے۔ لوگ آپ کی اس شہرت اور مقبولیت سے نا جائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ آفرین بیٹی کے لئے جتنے بھی رشتے آ رہے ہیں۔ ان میں اس لڑکے عامر جان کا نام بھی شامل ہو جائے اور ایک بار آپ ان سے ملاقات کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم کہتی ہو تو ان سے کہو کہ خاتون کا آنا ضروری نہیں ہے پہلے اپنے بیٹے کو یہاں بھیج دیں۔ میں اس سے بات کروں گا۔ بعد میں اس کے والد سے بھی ملاقات کروں گا۔"

"آپ اس سے کب ملاقات کرنا چاہیں گے؟"

"کسی وقت بھی بلا لو۔ آج میں گھر سے باہر نہیں جاؤں گا۔"

شام کے پانچ بجے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ آفرین خوشی کے مارے پھوپھی جان سے لپٹ گئی۔ "آپ بہت اچھی ہیں۔ میری امی بھی ہیں اور میری سہیلی بھی۔"

صابرہ نے پوچھا۔ "تم نے عامر جان کو تو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ یہاں آ کر کس طرح بابا جانی سے بات کرنی ہے اور کیسا سیدھا سادہ سا لباس پہن کر آتا ہے؟"

''میں پہلے ہی بابا جانی کے متعلق انہیں بہت کچھ بتا چکی ہوں۔وہ بہت ذہین ہیں۔بابا جانی کو ضرور متاثر کریں گے۔''

پچھلے ایک ماہ میں اس نے عامر جان کو اچھی طرح دیکھا تھا اور جانا تھا۔وہ یونیورسٹی کے پرنسپل، پروفیسر حضرات اور طلبا و طالبات کو اپنی گفتگو سے اور اپنے بہترین طور طریقوں سے متاثر کرتا رہتا تھا۔خود وہ بھی پہلی ہی ملاقات میں اس سے متاثر ہو گئی تھی اور پھر یہی تاثرات پیار و محبت میں تبدیل ہو گئے تھے۔

وہ شام کے ٹھیک پانچ بجے پہنچ گیا۔میر عبدالسلام حقی ڈرائینگ روم میں ہی تھے۔اس نے سر کو جھکا کر سلام کیا۔پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔''الحمد اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی ہی عزت اور شہرت سے نوازہ ہے۔یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔''

انہوں نے کہا۔''تشریف رکھیں اور اپنا مکمل تعارف پیش کریں۔''

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔''خاکسار کا نام سید عامر جان ہے۔اور میرے والد محترم کا نام سید توقیر جان ہے۔آپ نے توقیر ٹیکسٹائل مل کا نام تو سنا ہوگا۔وہ ہماری ہی ملکیت ہے۔ہماری پروڈکٹس اوورسیز کی مارکیٹ میں بھی مقبول ہیں۔ہمارے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے ہیں اور حسب و نسب کا سلسلہ حضرت نظام الدین اولیا سے ملتا ہے۔''

''سبحان اللہ! حضرت نظام الدین اولیا ہندوستان کے مشہور و معروف اولیا کرام میں سے ایک ہیں۔تمہارا شجرہ وہاں سے چلا آرہا ہے۔لیکن تمہیں دیکھ کر یہ یقین نہیں ہو رہا ہے۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔''میں یقین نہ کرنے کی وجہ معلوم کرنا چاہوں گا۔''

''میں تمہاری پیشانی دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ تم باقاعدہ نماز نہیں پڑھتے اور شائد پڑھتے ہی نہیں ہو۔تم ایک بہت ہی نامور اور کامل ولی اللہ کے شجرے سے تعلق رکھتے ہو۔یقیناً تمہارے بزرگ داڑھیاں رکھتے ہوں گے۔لیکن تم کلین شیو ہو۔''

آفرین دروازے کے پیچھے اپنی پھوپھی کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔بابا جانی کی تنقید سن کر دل ڈوبنے لگا تھا۔اس نے پریشان ہو کر پھوپھی جان کو دیکھا۔انہوں نے اس کے شانے کو خاموشی سے تھپک کر تسلی دی۔

عامر جان نے کہا۔''ہمارے دین اسلام میں جبر نہیں ہے۔بعض بڑے بڑے دکان دار اور چھوٹی بڑی ملوں کے مالک جو نہایت ہی دین دار ہوتے ہیں۔دینی احکامات پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔وہ بے روزگار افراد کو اس شرط پر ہی روزگار فراہم کرتے ہیں کہ وہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھیں گے۔جو بہت ہی ضرورت مند ہوتے ہیں۔وہ روزی روٹی کی خاطر ان شرائط پر عمل کرتے ہیں۔جبراً نماز پڑھوانا اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہے۔یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔سب ہی مانتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔بلکہ محبت سے اور تعمیری ہدایات سے پھیلتا رہا ہے۔میں آپ کو خوش کرنے کے لئے آپ کا دل جیتنے کے لئے نماز پڑھ سکتا ہوں۔داڑھی رکھ سکتا ہوں۔اور آپ سے اپنی ضرورت کی کوئی بھی اہم چیز حاصل کر سکتا ہوں۔لیکن یہ تو آپ کو خوش کرنے کے لئے ہوا۔اللہ تعالیٰ کی خوشنودی تو حاصل نہیں ہوگی۔یہ تو سراسر فریب ہی ہوگا۔''

انہوں نے کہا۔''تو تم جھوٹ کیوں بولو گے؟ فریب کیوں دو گے؟ سچے دل سے دینی احکامات کی تعمیل کرنا کیوں نہیں چاہو گے؟''

''ہر مسلمان اپنی استطاعت اور اپنے حالات کے مطابق دینی احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔آپ جیسے محترم بزرگ بھی دن رات عبادت میں اور تبلیغ دین میں مصروف رہتے ہیں۔کچھ اپنی کم علمی کے باعث صرف نماز پڑھتے ہیں۔اور کلام پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔اور جو یہ بھی نہیں کر پاتے وہ جمعہ کی نماز ضرور ادا کرتے ہیں۔اس مشینی دور میں انسان اس قدر مصروف ہو گیا ہے کہ اسے نماز پڑھنے کا وقت ملتا ہے تو وہ پڑھتا ہے ورنہ مجبور ہو جاتا ہے۔''

''دوسروں کی نہیں۔اپنی بات کرو۔''

''اپنی بات تو یہ ہے کہ میں تعلیم کے میدان میں نمایاں مقام حاصل کرتا رہتا ہوں۔اپنے ابو کا کاروبار بھی میں ہی سنبھالتا ہوں۔ان مصروفیات کے دوران میں جب بھی وقت ملتا ہے، نماز پڑھ لیتا ہوں۔اور کلام پاک کی تلاوت کرتا ہوں۔ہر مسلمان مکمل طور پر بے دین نہیں ہوتا۔اور نہ ہی مکمل طور پر دین دار ہوتا ہے۔''

وہ اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔وہ کہہ رہا تھا۔''ہم اکثر اپنے حالات سے مجبور ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔جیسا کہ میں ابھی آپ کے سامنے شلوار قمیض پہن

کرآیا ہوں۔ یہ ہم مسلمانوں اور پاکستانیوں کا لباس ہے۔ لیکن اسکول سے کالج تک ہمیں پہننے کے لئے جو یونیفارم دیا جاتا ہے۔ وہ انگریزوں کا لباس پینٹ اور شرٹ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے اداروں اور دفاتر میں یہ حکم ہوتا ہے کہ ملازمین کو پینٹ شرٹ میں آنا چاہئے۔ بڑی بڑی فرموں میں کام کرنے والے بہت کم افراد ہی داڑھیاں رکھتے ہوں گے۔ داڑھیاں تو ہندو بھی رکھتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی بھی رکھتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی تو خاص پہچان نہیں ہے۔ اور ہر مسلمان کے لازمی بھی نہیں ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ انہوں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "اور کچھ کہنے کو رہ گیا ہے؟"

"ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں لاکھ کوشش کروں تب بھی اپنے جیسا کسی دوسرے کو نہیں بنا سکتا۔ آپ بھی لاکھ کوشش کریں گے۔ دوسروں کو داڑھی رکھنے والا، پانچ وقت کا نمازی نہیں بنا سکیں گے۔ آپ کی بات تو وہی مانے گا جو روزی روٹی حاصل کرنا چاہے گا۔ یا پھر اس کا کوئی بہت بڑا مقصد آپ سے وابستہ ہوگا۔ جب تک وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ وہ آپ کو نمازی بن کر فریب دیتا رہے گا۔ مقصد کے پورا ہوتے ہی وہ پھر اپنی اصلیت پر آجائے گا۔"

"تم نے اپنی آخری بات بھی کہہ دی۔ اب میری بھی آخری بات سنو۔ ہم مسلمانوں کے لئے نماز کا حکم ہے۔ اگر میں تمہیں دینی احکام پر عمل کرنے کے لئے مائل کرتا ہوں۔ اور تم بظاہر میری بات مان لیتے ہو، مگر دل سے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے ہو تو تمہارے اندر کی باتیں وہی معبود جانتا ہے، اور وہی تمہیں گمراہی سے راہ راست پر لانے والا ہے۔"

انہوں نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ "میرا کام سمجھانا ہے۔ ہدایت دینا ہے، اور تمہارے لئے یہ ہدایت ہے کہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھو۔ داڑھی رکھو، ہندو یہودی اور عیسائیوں کی باتیں نہ کرو۔ ہم اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ داڑھی رکھنا تو سنت رسول ﷺ ہے۔ لہٰذا تمہیں بھی رکھنی چاہئے۔ تم ایک ماہ بعد اپنے والد صاحب کے ساتھ آسکتے ہو۔ میں ان سے بھی ملوں گا اور دیکھوں گا کہ وہ کس حد تک

دینی احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ انہیں بھی ہدایات دوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نماز ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! اب تم جاسکتے ہو۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ان سے مصافحہ کرنے کے بعد خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ آفرین کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ پھوپھی کا بازو پکڑ کر وہاں سے چلتی ہوئی اپنے بیڈروم میں آئی پھر بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ عامر جان نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے جیسا نہیں بنا سکتے لیکن بابا جانی ہر ایک کو اپنے جیسا بنانے پر تلے رہتے ہیں۔"

"ذرا صبر کرو۔ جس طرح وہ دوسروں کو اپنے جیسا نہیں بنا سکتے اسی طرح تم اور عامر جان مل کر انہیں اپنے جیسا نہیں بنا سکو گے۔ پریشان ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں بھائی جان سے بات کروں گی۔"

باپ بیٹا ایک کمرے میں تھے۔ سید عبدالکلام حقی ایک جگہ بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا اور جرار حقی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ عبدالکلام حقی نے ایک کش لینے کے بعد کہا۔ "بھائی جان کی عادت ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ تمہاری پھوپھی جان چھپا رہی تھیں۔ لیکن بھائی جان نے ہمیں صاف طور پر بتا دیا کہ ایک نوجوان لڑکا آفرین کے رشتے کے لئے آرہا ہے۔"

جرار ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ پھر بولا۔ "میں نے اس جوان کو دیکھا ہے۔ بڑا تگڑا بڑا قد آور ہے۔ ان کی ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل بھی ہے۔ اس جوان میں بظاہر تو کسی بات کی کمی نظر نہیں آئی۔ پتہ نہیں۔ وہ کیسی لچھے دار باتیں بنا کر بابا جانی کو اپنی طرف مائل کرے گا۔"

وہ پھر ایک کش لینے کے بعد بولا۔ "مجھے اطمینان ہے کہ بھائی جان اسے اپنا داماد بنانا قبول نہیں کریں گے۔"

"آپ کو اطمینان کیسے ہے؟"

"تم نے اس جوان چھوکرے میں سب کچھ دیکھا یہ نہیں دیکھا کہ وہ کلین شیو تھا۔ بھائی جان تو میرے پیچھے بھی پڑے رہتے ہیں کہ داڑھی رکھنی چاہئے۔ نماز پڑھنا چاہئے۔ تو پھر اس چھوکرے کو کب بخشیں گے؟ اس سے بھی یہی مطالبہ کریں گے۔ وہ اسے نصیحت

کریں گے۔ مگر آج کل کے جوان کہاں نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں۔"

"آپ کی یہ بات تو دل کو لگ رہی ہے۔ اسے کتنی ہی دولت مند لڑکیاں مل جائیں گی۔ یہاں سے ایک لڑکی کا رشتہ لینے کے لئے نہ تو وہ داڑھی رکھے گا اور نہ تسبیح ہاتھ میں لے کر ہوٹلوں اور کلبوں میں جائے گا۔"

وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "یہ تو میں ہی ہوں۔ جو اتنی لمبی داڑھی پال رہا ہوں۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلنا چاہئے۔ آپ نے یہاں آتے ہی میرے اور آفرین کے رشتے کی بات کی سیاسی معاملات کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ جب کہ آفرین کی اہمیت ثانوی ہے۔ پہلے تو بابا جانی کی سیاسی حمایت حاصل ہونی چاہئے۔"

"بات کو سمجھا کر۔ ایک ہی وقت میں اپنی ساری باتیں اگلنا نہیں چاہئیں۔ بھائی جان سمجھ لیں گے کہ ہم صرف اپنے ہی مطلب کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ذرا عقل سے سوچ جب وہ تجھے اپنا داماد بنالیں گے تو پھر آئندہ الیکشن میں تیری سیاسی حمایت کیوں نہیں کریں گے؟ تیری کامیابی ان کی بیٹی کی بھی کامیابی ہوگی۔ تیری زندگی سنورتی رہے گی تو ان کی بیٹی کی بھی زندگی سنورتی رہے گی۔"

اس نے سر کو ہلایا پھر کہا۔ "ہاں۔ اس پہلو سے سوچتا ہوں تو اطمینان ہوتا ہے کہ اکلوتی بیٹی ہے۔ جب وہ اسے ساری دولت اور جائیداد دیں گے تو پھر میری سیاسی حمایت کیوں نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے....."

وہ ٹہلنے کے انداز میں دوسری طرف گیا پھر رک کر بولا۔ "مگر بابا جانی مجھے کتنے عرصے تک آزماتے رہیں گے؟ آج دوپہر کھانے سے پہلے مجھے سورۃ یسین پڑھنے کو کہا۔ میں پڑھنے لگا تو کتنی ہی تلفظ اور زیر زبر کی غلطیاں نکالنے لگے۔ بچپن میں ہی کلام پاک پڑھا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے کچھ سورتیں یاد کر کے آیا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ زیر زبر کی غلطیاں بھی نکالنے بیٹھ جائیں گے۔ مجھے تو ان کا سامنا کرتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔"

وہ جھاگ کی طرح ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ مسلمان بننا جتنا آسان ہے۔ ایک مکمل دین دار بننا اُتنا ہی دشوار ہے۔

☆☆☆

میر عبدالسلام حقی صبح ناشتہ کرنے کے بعد چائے پی رہے تھے اور معمول کے مطابق اخبار پڑھ رہے تھے۔ ایک صفحے پر حشمت شیرازی کی تصویر دیکھ کر چونک گئے۔ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

شیرازی تصویر میں ایک عورت اور دو مردوں کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ سب کے ہاتھوں میں شراب کے جام تھے۔ وہ اپنا اپنا جام فضا میں یوں بلند کئے ہوئے تھے، جیسے ایک دوسرے کو چیئرز کہہ رہے ہوں۔

اس تصویر کے ساتھ ایک خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ حشمت شیرازی پچھلے ماہ عمرہ کرنے گئے تھے۔ پھر وہاں سے لندن چلے گئے۔ انہیں ایک یہودی سرمایہ دار مسٹر گولڈ اسمتھ کی ایک برتھ ڈے پارٹی میں انوائٹ کیا گیا تھا۔ جہاں صرف شراب ہی نہیں شباب کا بھی میلہ لگا ہوا تھا۔ موصوف عمرہ کرنے گئے تھے۔ ایسے حضرات کے متعلق ہی کہا جاتا ہے۔

اِک ہاتھ میں کعبہ ہے
اِک ہاتھ میں مے خانہ.....

حقی صاحب وہ تصویر دیکھنے اور اخبار پڑھنے کے بعد غصے سے تلملا گئے۔ "کم بخت! ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر جھوٹ بھی بولتا ہے کہ نمازی ہے۔ پتہ نہیں عمرہ کرنے گیا بھی تھا یا نہیں؟"

انہوں نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر سوچا۔ "وہ عمرہ کرنے گیا تھا اور جھوٹ کہہ رہا تھا کہ اس نے داڑھی رکھی تھی۔ اگر داڑھی رکھتا تو شراب و شباب کی پارٹی میں کیسے شامل ہوتا؟"

انہوں نے سوچا کہ اس نے عمرہ کرتے وقت داڑھی رکھی ہوگی پھر وہاں سے لندن روانہ ہوتے وقت داڑھی منڈوالی۔ ان خود غرض اور مطلب پرست سیاست دانوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔

انہوں نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔ دل ہی دل میں کہنے لگے۔ ''ان مسلمانوں کا کیا کیا جائے، جو داڑھی رکھ کر ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ اس طرح بڑے بڑے مالی اور سیاسی فائدے اٹھاتے رہتے ہیں۔''

رابطہ ہونے پر حشمت شیرازی کے سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے کہا۔ ''میں میر عبدالسلام حقی بول رہا ہوں۔ حشمت صاحب سے بات کراؤ۔''

اس نے بڑی معذرت سے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ وہ اس وقت گہری نیند میں ہیں۔ کوئی ضروری پیغام ہو تو نوٹ کروا دیں۔''

''ان سے کہو۔ جب بھی آنکھ کھلے تو مجھے فون کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ جرار حقی تسبیح کے دانے گنتا ہوا وہاں پہنچا۔ سلام کر کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''بابا جانی! خیریت تو ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟''

انہوں نے اخبار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس تصویر کو دیکھو، خبر کو بھی پڑھو۔ یہ وہی حشمت شیرازی ہے، جو آئندہ الیکشن میں میری حمایت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے مذہبی چولا پہن رکھا ہے۔''

جرار نے وہ تصویر دیکھی پھر خبر پڑھی۔ اس کے بعد اخبار کو سینٹر ٹیبل پر پھینک کر گالوں پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''توبہ توبہ۔ اللہ کا نام لے کر دھوکہ دینا تو گناہ کبیرا ہے۔''

حقی صاحب نے اپنے بھتیجے کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی پھر کہا۔ ''کس پر بھروسہ کیا جائے؟ لوگ اندر سے کتنے جھوٹے فریبی ہوتے ہیں۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ میں تو نیک نیتی سے پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور سنت رسول ﷺ کے مطابق زندگی گزارنے کی نصیحت کرتا رہتا ہوں۔''

اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''بابا جانی! آپ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق اپنے دینی فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ اب کوئی اندر سے چور بدمعاش ہو تو آپ کیا کر سکیں گے؟ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہر انسان اپنے برے اعمال کی سزا ضرور پاتا ہے۔ یہ شیرازی بھی ضرور سزا پائے گا۔''

وہ واقعی مایوس ہو رہے تھے۔ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ جرار نے کہا۔ ''آپ دوسروں پر کبھی بھروسہ نہ کریں۔ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میری ذات سے آپ کو اطمینان حاصل ہوگا۔ آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی دیانتداری سے آپ کے نقش قدم پر چلتا ہوں اور آخری سانس تک چلتا رہوں گا۔''

''بیٹے! انسان جو کرتا ہے، وہ نفع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لئے کرتا ہے۔ تم بھی اگر اچھا کرو گے تو اچھا ہی پاؤ گے۔ برا کرو گے تو نقصان ہی اٹھاؤ گے۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ ''میں دارالعلوم جا رہا ہوں۔ ہسپتال کا بھی معائنہ کروں گا۔ دوپہر کو کھانے پر ملاقات ہوگی۔''

وہ زیرلب کچھ پڑھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ جرار نے پھوپھی کے پاس آ کر پوچھا۔ ''آفرین آج کل دیر سے واپس آتی ہے؟ کالج کی پڑھائی تو ایک یا ڈیڑھ بجے تک ہوا کرتی ہے؟''

صابرہ نے کن انکھیوں سے اس کی تسبیح کی طرف دیکھا' پھر ناگواری سے کہا۔ ''وہ کالج نہیں۔ یونیورسٹی جاتی ہے۔ جب کلاس نہیں ہوتی تو لائبریری میں بیٹھ کر اسٹڈی کرتی ہے۔ ویسے تم اس کی مصروفیات کا حساب کیوں کر رہے ہو؟''

''کیا مجھے کرنا نہیں چاہئے؟ وہ میری کزن ہے۔ ہمارے خاندان کی عزت ہے۔ مجھ سے منسوب ہونے والی ہے۔''

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''پھوپھی جان! آفرین کی طرح میں بھی آپ کا سگا بھتیجا ہوں۔ پھوپھی تو ماں کے برابر ہوتی ہے۔ کیا آپ مجھے تھوڑی سی بھی محبت نہیں دے سکتیں؟ میری ایک ذرا سی حمایت نہیں کر سکتیں؟''

''میں کس بات پر تمہاری حمایت کروں؟''

''یہی رشتے کے سلسلے میں۔ اگر آپ زور دیں گی تو جلد ہی ہماری شادی ہو سکے گی۔''

''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم آفرین کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ اور بھائی ہی سمجھتی رہے گی۔''

"میں کوئی سگا بھائی تو نہیں ہوں۔ آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔"

"تو پھر یہی سمجھ لو، اس سلسلے میں مجھ سے کسی بات کی توقع نہ کرو۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر منہ پھیر کر پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میر عبدالسلام حقی اپنے دارالعلوم میں تھے۔ دوپہر کے دو بجے حشمت شیرازی نے انہیں فون پر مخاطب کیا۔ "السلام علیکم حقی صاحب......!"

انہوں نے کہا۔ "وعلیکم السلام۔ کیا آنکھ کھل گئی؟"

"جی۔ ابھی آنکھ کھلی تو میرے سیکرٹری نے بتایا کہ آپ نے یاد فرمایا ہے۔"

"جب آپ دوپہر تک سوتے رہتے ہیں تو فجر کی نماز کیسے ادا کرتے ہیں؟"

"حضور! میں پچھلی رات داتا دربار میں تھا۔ وہاں ایسی ایمان افروز محفل سماں جمی ہوئی تھی۔ کہ رات سے صبح ہوگئی، میں نے فجر کی نماز بھی وہیں ادا کی، پھر آٹھ بجے کی فلائٹ سے یہاں پہنچ گیا۔ آتے ہی سو گیا۔ آپ یقین کریں اب میں نماز کبھی قضا نہیں کرتا۔ دیکھئے ابھی ظہر کا وقت ہورہا ہے۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔"

"آج کے اخبار میں آپ کا فوٹو دیکھ کر میری بھی آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "اخبار میں میری تصویر؟ کیا آج کے اخبار میں؟"

"جی ہاں۔ آپ ذرا اخبار کا مطالعہ کریں۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا۔ وہ اپنے بہت بڑے دارالعلوم والے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کے منتظم اعلیٰ اور اکاؤنٹنٹ بھی تھے۔ وہ اخراجات کا حساب پیش کر رہے تھے۔ فون پر حشمت شیرازی کی آواز سن کر انہیں غصہ آرہا تھا۔ اب کسی حساب کتاب میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کا خیال بار بار حشمت شیرازی کی طرف بھٹک رہا تھا۔

انہوں نے ان سے کہا۔ "میں معذرت چاہتا ہوں۔ ذرا تنہا رہوں گا۔"

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر سلام کرکے وہاں سے چلے گئے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ سکون سے ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ بے چینی تھی کہ وہ اخبار پڑھ رہا ہو

گا، اور اپنے جھوٹ اور فریب پر پردہ ڈالنے کے لئے کوئی منصوبہ بنا رہا ہوگا۔ پھر ایک نیا جھوٹ بول کر کوئی نیا دھوکہ دے گا۔

ادھر شیرازی اخبار میں اپنی تصویر دیکھ کر بوکھلا گیا تھا' پھر تصویر کے ساتھ اپنے بارے میں خبر پڑھی تو اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ اس نے پرسنل سیکرٹری کو بلا کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "اخبار کے آتے ہی تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ میرے بارے میں ایسی خبر شائع ہوئی ہے؟"

وہ مودبانہ انداز میں بولا۔ "سر! آپ کا ہی حکم ہے کہ نیند سے جگایا نہ جائے۔ میں نے سوچا' آپ سو کر اٹھیں گے تو ایسی خبر شائع کرنے والوں سے نمٹ لیں گے۔"

وہ اخبار کو ایک طرف پھینکتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "میں کیا کروں؟ اس خبر کو کیسے جھٹلاؤں؟ کم بختوں نے تصویر کے ساتھ خبر شائع کی ہے۔ خبر کو تو جھٹلایا جاسکتا ہے لیکن تصویر کو کیسے جھٹلاؤں؟"

"سر! آپ اس اخبار کے خلاف سختی سے نوٹس لیں۔"

"تم جانتے ہو کہ یہ ایک اسلامی جماعت کا اخبار ہے۔ اس کی ادارت ایسے علماء کرام نے سنبھالی ہوئی ہے' جو حکمرانوں کے دباؤ میں بھی نہیں آتے۔ کیسا ہی حاکم ہو کتنے ہی وسیع ذرائع کا مالک ہو، اگر دینی احکامات کے خلاف وہ کوئی غلطی کرتا ہے تو اسے من وعن اپنے اخبار میں شائع کردیتے ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہوں گا تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"سر! آپ کی طرف سے کچھ تو تردیدی بیان شائع ہونا چاہیے۔"

"جاؤ۔ کچھ اس طرح کا بیان لکھواؤ کہ وہ شراب وشباب کی محفل نہیں تھی۔ لندن کے معززین نے ایک گٹ ٹوگیدر پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں ہم شراب نہیں' سوفٹ ڈرنک پی رہے تھے۔"

وہ پرسنل سیکرٹری وہاں سے چلا گیا۔ شیرازی فون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر اسے ہاتھ لگانے سے پہلے یوں گھور کر دیکھنے لگا جیسے میر عبدالسلام حقی کو دیکھ رہا ہو۔ ان کے سامنے باتیں بنا رہا اور اپنی صفائی پیش کررہا ہو۔

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا' الجھتا رہا پھر فون اٹھا کر نمبر پنچ کئے۔ حقی صاحب تو جیسے

انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔اسی کا انتظار کر رہے تھے۔رابطہ ہوتے ہی ان کی طنزیہ آواز سنا
ئی دی۔"جی فرمائیے۔حشمت شیرازی صاحب......؟"

شیرزای نے کہا۔"معافی چاہتا ہوں۔آپ سے رابطہ کرنے میں ذرا دیر ہو
گئی۔دراصل میں یہ خبر پڑھتے ہی اپنی تصویر کو دیکھتے ہی ششدر رہ گیا۔اب کوئی جرم نہ
کرے کوئی گناہ نہ کرے اور اسے اس ناکردہ گناہ کی سزا ملے تو اس کی کیسی حالت ہوتی
ہے۔یہی میری بھی ہو رہی ہے۔آپ یقین کریں۔اس وقت میں بہت ہی ذہنی اذیت سے
دوچار ہو رہا ہوں۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اس شراب کی محفل میں شریک نہیں تھے؟اور
وہ تصویر غلط ہے؟اس تصویر میں آپ نہیں کوئی دوسرا ہے؟"

"محترم!یہ بات نہیں ہے۔تصویر میں میں ہی ہوں۔لیکن وہ شراب کی محفل نہیں
تھی۔مسٹر گولڈ اسمتھ طویل بیماری سے صحت یاب ہوئے تھے۔اسی خوشی میں انہوں نے
پارٹی دی تھی۔ہم ان کا جام صحت نوش کر رہے تھے۔وہ شراب نہیں تھی۔ایک صحت افزا
مشروب تھا۔"

"آپ شائد مجھے نادان بچہ سمجھ رہے ہیں؟شراب پینے کے نازک سے جام سب
سے مختلف ہوتے ہیں۔ان میں صرف شراب ہی پی جاتی ہے شربت کبھی نہیں پیا جاتا۔"

"جناب!اپنا اپنا ماحول ہوتا ہے،اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔اپنی ماں کو
گلے لگا کر پیار کیا جا سکتا ہے۔لیکن انگریزوں کے ماحول میں اسی ماں کو گلے لگا کر پیار کیا
جائے تو تصویریں اتارنے والے اس ماں کو محبوبہ یا جان محفل ثابت کرنے کی شرمناک
کوشش کرتے ہیں۔"

"تم واقعی باتیں بنانے کے ماہر سیاست داں ہو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں' آپ یقین نہیں کریں گے۔لیکن سچ تو یہی ہے کہ وہ انگریزوں
کے ماحول میں اتاری ہوئی تصویر ہے۔اس لئے شربت کو شراب ثابت کیا جا رہا ہے۔"

"آپ پچھلے الیکشن میں تقریر کرتے وقت فلسطینی مسلمانوں کی حمایت میں
یہودیوں کے خلاف بہت کچھ بولتے رہے ہیں۔مسٹر گولڈ اسمتھ یہودی ہے۔آپ

یہودیوں کی تقریب میں شامل ہوئے تھے۔یہ کیا دوغلا پن ہے؟پاکستان میں رہ کر ان کے
خلاف بولتے ہیں۔اور ملک سے باہر جاتے ہی ان کی گود میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"محترم!میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔اور آپ مجھے دوغلا کہہ رہے ہیں؟"

"تمہارے جیسے دوغلے سیاست دان قرآن وحدیث کے مطابق کبھی اس ملک
مین اسلامی جمہوریت قائم نہیں ہونے دیتے۔جب ان کی خودغرضی اور بے ایمانی کی
نشاندہی کی جائے تو تلملا جاتے ہیں۔آئندہ آپ مجھ سے کسی طرح کی توقع نہ رکھیں۔میں
کبھی آپ کی سیاسی حمایت نہیں کروں گا۔خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فون کو بند کر دیا۔ریسیور پٹخنے کی آواز حشمت شیرازی کو یوں
لگی جیسے انہوں نے منہ پر جوتا مارا ہو۔وہ تلملا کر گالیاں بکنے لگا۔"یہ مولوی کا بچہ!خود کو سمجھتا
کیا ہے؟یہ اگر میری سیاسی حمایت نہیں کرے گا تو کیا میں مر جاؤں گا؟مرے گا تو یہ
مولوی۔میں اسے اس طرح بدنام کروں گا کہ یہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے
گا۔اس کی ساری عزت شہرت اور نیک نامی خاک میں ملا کر رکھ دوں گا۔"

جو لوگ عزت دار اور ہردلعزیز ہوتے ہیں۔ان کی نیک نامی شیشے سے بھی زیادہ
نازک ہوتی ہے۔ایک ذرا سی ٹھیس لگتے ہی یہ شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ماؤں بہنوں اور
بیٹیوں کو کانچ سے بھی زیادہ نازک کہا جاتا ہے۔یہ اس لئے کہ ہر خاندان اور ہر گھر کی عزت اور
نیک نامی ان کی ہی شرم وحیاء سے قائم رہتی ہے۔ان میں سے کسی کی بھی عزت پر آنچ آ جائے
'دامن پر ذرا سا بھی دھبہ لگ جائے تو برسوں کی کمائی ہوئی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔

ایک صبح آفرین یونیورسٹی گئی تو اس کے ایک گھنٹے کے بعد ہی ایک پولیس آفیسر
نے میر عبدالسلام حقی کے پاس آ کر انہیں سلام کیا پھر کہا۔"آپ کا ڈرائیور بری طرح زخمی ہو
گیا ہے۔ہم نے اسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچایا ہے۔"

انہوں نے ایک دم سے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔"میری بچی کہاں ہے؟"

"ہم نے کار کی اگلی سیٹ پر صرف آپ کے بوڑھے ڈرائیور کو زخمی پایا تھا۔آپ
کی بیٹی وہاں نہیں تھی۔"

وہ اسی وقت پولیس افسر کے ساتھ ہسپتال پہنچے،ڈرائیور ہوش میں آ چکا تھا۔زخمی

ہونے کے باعث بہت زیادہ کمزور ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر بتانے لگا کہ اس کی کار کے سامنے ایک گاڑی آ کر رک گئی تھی۔ اس کا راستہ روکا گیا تھا۔ پھر اس میں سے تین شخص منہ پر ڈھاٹا باندھے باہر نکلے۔ انہوں نے آتے ہی ڈرائیور کو بری طرح مارا۔ سر پر ایسی ضرب لگائی کہ وہ اسی لمحے میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد اسے معلوم نہ ہو سکا کہ آفرین بی بی کے ساتھ کیا ہوا؟ اور وہ لوگ اسے کہاں لے گئے؟

حقی صاحب نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ چشم تصور میں اخبارات کی سرخیاں پڑھ رہے تھے۔ لکھا ہوا تھا کہ میر عبدالسلام حقی کی صاحبزادی کو اغواء کر لیا گیا ہے۔ کسی گمنام غریب کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہوتا تو لوگ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے۔ لیکن یہ تو ذہنوں میں نقش ہونے والی خبر تھی کہ ایک بہت بڑے عالم دین کی صاحبزادی کو اٹھایا گیا ہے۔ اور کسی لڑکی کو اٹھانے کے بعد اس کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اسے چھپایا نہیں جا سکتا۔ اب وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ان کی بیٹی کی آبرو لوٹ لی گئی ہے اور ان کے پورے خاندان کے منہ پر کالک پوت دی گئی ہے۔

وہ اس پولیس افسر کے ساتھ یونیورسٹی پہنچے۔ ایک بے نام امید سی تھی کہ شائد بیٹی کسی طرح بچ بچا کر وہاں پہنچ گئی ہو گی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ پرنسپل نے پروفیسر نے طلبا اور طالبات نے ان سے پوچھا۔ "جناب عالی! آفرین آخر کہاں چلی گئی ہے؟"

انہوں نے سب کے سامنے یہ نہیں کہا کہ اسے اغواء کیا گیا ہے۔ وہ بولے۔ "شائد اپنے عزیز اقارب میں سے کسی کے ہاں گئی ہے۔ ہم ابھی معلوم کر لیں گے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

عامر جان بھی انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی باتیں سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا' کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ کوئی بڑی حقیقت چھپائی جا رہی ہے۔

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے لئے آئے تو اس نے کہا۔ "انکل! وہ آپ کی اجازت کے بغیر کسی رشتے دار کے ہاں بھی نہیں جاتی ہے۔ یہ بات مجھے آفرین نے ہی بتائی ہے۔ ابھی آپ بہت زیادہ پریشان ہیں۔ ضرور ایسی کوئی بات ہے جسے آپ ہم سے چھپا رہے ہیں۔"

وہ اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ قانون کے محافظ میرے ساتھ ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں نہ پریشان ہونا چاہئے اور نہ ہی کوئی سوال کرنا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس نے فوراً ہی موبائل فون کے ذریعے صابرہ پھوپھی سے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ "پھوپھی جان! آفرین کہاں ہے؟"

وہ پریشان ہو رہی تھیں۔ روتے ہوئے بولیں۔ "کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ میں نے تو اتنا ہی سنا ہے کہ بوڑھے ڈرائیور کو زخمی کر دیا گیا ہے۔ اسے ہسپتال پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اس گاڑی میں آفرین نہیں تھی۔"

"پھوپھی جان! اس طرح یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسے اغواء کیا گیا ہے۔ اور انکل یہ بات سب سے چھپا رہے ہیں۔"

"بیٹے! ساری عمر کی جدوجہد کے بعد جو کمایا ہے وہ صرف عزت اور نیک نامی ہے۔ وہ ایک ڈوبنے والے کی طرح ایک تنکے کا' ایک جھوٹی امید کا سہارا لے رہے ہیں کہ شاید اسے اغواء نہیں کیا گیا ہے۔ شاید وہ کہیں محفوظ ہے۔"

وہ بہت عزت دار بہت ہی مشہور اور معروف تھے۔ انہیں قانون کے محافظ بھی سلام کرتے تھے۔ وہ سب جی جان سے آفرین کو تلاش کر رہے تھے۔ مجرمانہ زندگی گزارنے والے ہر چھوٹے بڑے بدمعاش کو پکڑ کر اس کی پٹائی کر رہے تھے۔ اس سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یہ واردات کس نے کی ہے؟

وہ حقی صاحب سے بھی پوچھ رہے تھے۔ "آپ کو کسی پر بھی شبہ ہے تو ہمیں بتائیں۔ ہم اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر حقیقت اگلوا لیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "میں کس پر شبہ کروں؟ بظاہر تو کوئی بھی میرا دشمن نہیں ہے۔"

افسر نے کہا۔ "آپ خود اچھے ہیں اس لئے آپ کو دوسرے بھی اچھے لگتے ہیں۔ آپ کسی کے اندر کوئی برائی نہیں دیکھتے۔ پھر بھی سوچ سمجھ کر مجھے بتائیں' کیا حال ہی میں کسی سے جائیداد کے لین دین میں یا کسی اور معاملے میں بدکلامی ہوئی ہے؟"

ان کا ذہن فوراً ہی حشمت شیرازی کی طرف گیا۔ انہوں نے بتایا کہ شیرازی

سیاسی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا۔اورانہوں نے اس کی حمایت کرنے سے انکار کردیا تھا۔

وہ پوری تفصیل سے بتانے لگے کہ شیرازی کس طرح عمرہ کرنے گیا تھا، پھراس نے لندن پہنچ کر یہودیوں کی ایک پارٹی میں شرکت کی تھی۔ وہاں شراب بھی پی تھی۔اس بات پرانہوں نے اسے دوغلا مسلمان کہا تھا، کیونکہ وہ عبادت کرنے کا ڈھونگ بھی رچاتا ہے۔عمرہ کرنے بھی جاتا ہے۔اور شراب بھی پیتا ہے۔ایک طرف فلسطینی مسلمانوں کی حمایت کرتا ہے۔اوردوسری طرف یہودیوں سے بھی دوستی کرتا ہے۔

پولیس افسر نے حشمت شیرازی کے خلاف انکوائری کی تو پتہ چلا کہ وہ ہوسپٹل میں ہے۔اس کے گردے میں پتھری ہوگئی ہے۔اوردوسری صبح اس کا آپریشن ہے۔

اس نے حقی صاحب کے پاس آکر کہا۔"جناب عالی!وہاں کی میڈیکل رپورٹ بتاتی ہے کہ وہ شدید بیمار ہے اورکل صبح اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔جس وقت آپ کی صاحبزادی کواغواء کیا گیا اس وقت وہ ہوسپٹل میں داخل ہوچکا تھا۔اوراس بات کے کئی چشم دید گواہ ہیں۔"

انہوں نے یہ سب کچھ سن کر سر جھکالیا۔اور کہہ بھی کیا سکتے تھے۔پولیس افسر نے کہا۔"ہم جانتے ہیں کہ بڑے مجرم بڑے ہی گھاگ ہوتے ہیں۔یقیناً اس بڑے آدمی نے بھی خودواردات نہیں کی ہوگی۔اپنے غنڈوں سے اغواء کرایا ہوگا۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔"کون اچھا ہے کون برا۔اس کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے۔میں اپنے ہرچھوٹے بڑے معاملے میں اسی رب کریم پر بھروسہ کرتا ہوں۔وہی بہتر جاننے والا ہے۔وہی بہتر کرنے والا ہے۔"

ان کی نیند اڑ گئی تھی۔بھوک مرگئی تھی۔ایک ہی بیٹی تھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔یہ محبتیں تواپنی جگہ ہیں۔لیکن بدنامی کا زہر حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔وہ سوچنا نہیں چاہتے تھے کہ اغواء کرنے والے بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کررہے ہوں گے۔لیکن ذہن گھوم پھر کراسی خیال کی طرف جاتا تھا کہ بیٹی کی عزت کے چیتھڑے اڑ رہے ہوں گے۔وہ شرم سے مرے جارہے تھے۔پھر بھی موت نہیں آرہی تھی۔اب جتنی زندگی رہ گئی تھی۔وہ بدنامیاں سہنے کے لئے ملنے والی تھی۔

پتہ نہیں۔کتنی رات گزر گئی تھی۔وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھے۔ایسے وقت انہیں فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔انہوں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔"میں میر عبدالسلام حقی بول رہا ہوں۔آپ کون ہیں؟"

دوسری طرف سے حشمت شیرازی کی طنزیہ آواز سنائی دی۔"مولوی!کیا تجھے نیند نہیں آرہی ہے؟ دیکھ بدنامی کا خنجر کس طرح دل میں اترتا ہے۔اخبار والوں نے مجھے ایک شرابی کبابی کہہ کر بدنام کیا۔کوئی بات نہیں۔لیکن تونے مجھے دوغلا کہا.....تُو چاہتا تو میری غلطی کو درگزر کرسکتا تھا۔میری حمایت میں بول سکتا تھا۔اب تیری بیٹی اغواء ہوگئی کون جانے اس کے ساتھ کیسا سلوک ہورہا ہوگا؟اگراس کے کے ساتھ کچھ نہ ہوا' تب بھی کون یقین کرے گا کہ وہ پارسا ہے؟"

"کیا تم نے یہی کہنے کے لئے فون کیا ہے؟"

"مولوی!تُو دوسروں کو نصحت کرتا ہے۔آج میں بھی نصیحت کررہا ہوں۔اگر میرے ہاتھ میں شراب کا جام دیکھا گیا تو ضروری نہیں کہ اس میں شراب ہی ہو۔اس میں شربت بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح اگر تیری بیٹی کو اغواء کیا گیا ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ اس کی عزت کی دھجیاں اڑائی گئی ہو۔اس کی عزت آبرو سلامت بھی ہوسکتی ہے۔وہ ایک پارسا کی طرح گھرواپس آسکتی ہے۔لیکن کیا تو دنیا والوں کو یقین دلاسکے گا،کہ بیٹی پارسا ہے؟ کیا میں یقین دلاسکوں گا کہ میرے ہاتھ میں جو جام تھا اس میں شراب نہیں تھی؟"

انہوں نے کہا۔"ایک بے گناہ کے ہاتھ پر کلام پاک ہوتو وہ سچ بولے گا۔ایک گناہ گار کے ہاتھ میں شراب کا جام ہوتو کوئی اس کی سچائی پر یقین نہیں کرے گا۔تمہارا سیاسی اعمال نامہ غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔میں بھی انسان ہوں۔مجھ سے بھی غلطی ہوسکتی ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ نیتوں کو سمجھتا ہے۔جونیک نیت ہوتے ہیں۔انہیں راہ راست پر چلاتا رہتا ہے۔ان کی غلطی کو معاف بھی کرتا ہے۔اورانہیں راہ راست پر چلنے کی توفیق بھی عطا کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔میرے اعمال درست نہیں ہیں۔لیکن تم چاہو تو درست ہوسکتے ہیں۔تمہاری بیٹی آبرو باختہ ہوچکی ہے۔اب کوئی اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔لیکن میں تمہاری بدنامی کو گلے لگا کر تمہارے کام آسکتا ہوں۔نکاح کے تین بول پڑھا کراپنی بیٹی

کو میرے بھائی کی جھولی میں ڈال دو۔ ہم ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ میں تمہاری بدنامی پر پردہ ڈال دوں گا۔ اور تم بھی مجھے داڑھی رکھنے اور نمازیں پڑھنے پر مجبور نہیں کرو گے۔ میری سیاسی حمایت کرو گے۔ اسی طرح ہم دونوں کا بیڑہ پار لگے گا۔"

"میں مصیبت کے وقت صرف اللہ تعالیٰ سے ہی رحم کی بھیک مانگتا ہوں اور شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ میں تم سے ایسا کوئی سمجھوتہ کروں گا۔"

"تو تناور درخت ہے جھکنا نہیں جانتا، ٹوٹ جاتا ہے۔ لہذا ٹوٹ ہی جا۔ تیری بیٹی کالا منہ لے کر واپس آنے والی ہے۔"

"تیرے اندر ذرا سا بھی خدا کا خوف ہے تو بتا دے کہ وہ کہاں ہے؟"

"پولیس والوں سے پوچھ... اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر... نماز پڑھ... سجدے میں جا... اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ... پھر بھی تیری بیٹی کل شام سے پہلے واپس نہیں ملے گی۔ تو مجھے مجرم ثابت نہیں کر سکے گا۔ میرے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکے گا۔ میں تو ویسے بھی بیمار ہوں۔ اس وقت ہسپتال سے بول رہا ہوں۔ کل صبح دس بجے آپریشن ہونے والا ہے۔"

"خدا تجھے عقل دے، کیسی عجیب سی بات ہے کہ انسان موت کے منہ میں جاتے جاتے بھی شیطانی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ کیا تجھے ایک ذرا سا بھی خوف نہیں ہے کہ کل آپریشن کے نتیجے میں مر بھی سکتا ہے؟ تجھے تو ابھی سے توبہ کرنی چاہئے۔ کل صبح تک جتنی نیکیاں کما سکتا ہے' کما لے، یہی تیرے کام آئیں گی۔"

"میرے گردے سے پتھری نکالنی ہے۔ کوئی بہت بڑا آپریشن نہیں ہے۔ اور میں نے آج تک یہ نہیں سنا کہ گردے کے آپریشن میں کوئی مر گیا ہو۔"

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں بڑا محتاط رہنے والا شخص ہوں۔ میں نے ایک نجومی کو اپنا ہاتھ بھی دکھایا ہے، اس نے کہا ہے کہ میری زندگی بہت لمبی ہے۔ کل آپریشن کے بعد پھر تجھ سے رابطہ کروں گا۔ پھر ایک بار پوچھوں گا کہ سمجھوتہ منظور ہے یا نہیں؟ جا اب آرام سے سوجا۔ کل شام تک بیٹی واپس آجائے گی۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ حقی صاحب نے بڑی بے بسی سے ریسیور کو

دیکھا۔ مجرم سامنے تھا، اپنے جرم کا اعتراف بھی کر رہا تھا، لیکن وہ اسے قانون کی گرفت میں نہیں دے سکتے تھے۔ بیٹی کی واپسی اور بہتری کے لئے لازمی تھا کہ وہ خاموش رہتے۔ فی الحال اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتے ورنہ واپس آنے والی کا راستہ ہمیشہ کے لئے روکا بھی جا سکتا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ سوچنے لگے' کیا جائے؟ جو عزت لٹ چکی ہے وہ تو بیٹی کو واپس ملنے والی نہیں تھی اور وہ اس کی عزت کی خاطر یا اپنی جان بچانے کی خاطر کسی بے ایمان کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔

وہ صبح نو بجے ہسپتال پہنچ گئے۔ اس وقت حشمت شیرازی کو آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔ "تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ میں تمہارے لئے دعائیں مانگتا رہوں گا۔ خدا کے لئے آخری وقت برائیوں سے توبہ کر لو۔ شیطانی حرکتوں سے باز آجاؤ۔"

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "مولوی! تیرے کہنے سے توبہ کر لیتا ہوں۔ جا میرا پیچھا چھوڑ۔ آپریشن کے بعد ملاقات ہوگی۔"

وہ آپریشن تھیٹر کے دروازے پر ہی رک گئے۔ شیرازی کو اندر پہنچا دیا گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے سر گھما کر دیکھا تو ذرا فاصلے پر عامر جان کھڑا ہوا تھا۔ اس نے قریب آکر کہا۔ "انکل......!"

انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "تم نے پہلے بھی مجھے انکل کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مجھے یہ انگریزوں کا انداز تخاطب بالکل پسند نہیں ہے۔ تم لوگ اپنی مشرقی تہذیب کو بھول رہے ہو۔ کسی رشتے سے مخاطب کیا کرو۔ اگر رشتہ نہ ہو تو اسے اس کی سماجی حیثیت سے مخاطب کر سکتے ہو۔"

"میں تو رشتہ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے آپ ہی کے گھر پر گیا تھا۔ دیکھا کہ آپ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جا رہے ہیں۔ آپ کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔ یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ آپ حشمت شیرازی جیسے کرپٹ سیاست داں کی عیادت کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہسپتال کے ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ پھر بولے۔ ''تم حشمت شیرازی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں صرف پاکستان کی ہی نہیں پوری بین الاقوامی سیاست کا بھی مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ بڑے بڑے سیاست دانوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں۔ میں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ آپ کی سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ میں تسبیح لے کر گھومنے لگا تھا۔ اور یہ ظاہر کرنے لگا تھا کہ پانچوں وقت کی نمازیں بھی پڑھتا رہتا ہے۔ جب کہ پرسوں کے اخبار نے اس کے جھوٹ اور فریب کو بے نقاب کر دیا۔ آپ نے وہ تصویر دیکھی اور خبر پڑھی ہوگی۔''

''تم میرے پیچھے یہاں تک کیوں آئے ہو؟''

''میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آفرین واپس آچکی ہے یا نہیں؟''

''تم آفرین کے سلسلے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟''

''آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں پہلے بھی آپ سے رشتے داری چاہتا تھا۔ اور اب بھی چاہتا ہوں۔''

انہوں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ''تم شائد یہ سمجھ رہے ہو کہ میری بیٹی اب بدنام ہو چکی ہے، کہیں سے اس کا رشتہ نہیں آئے گا۔ تم یہاں ہمدردی کر کے رشتہ مانگنے آئے ہو۔''

''اس واردات سے پہلے بھی میں آپ کے پاس آیا تھا، احسان کرنے نہیں بلکہ آپ کا احسان لینے آیا تھا۔ آج بھی آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ خدارا...! مجھے مایوس نہ کریں۔''

''مجھے افسوس ہے کہ اس کی نسبت طے پا چکی ہے۔ اس کی شادی میرے بھتیجے جرار حقی سے ہی ہوگی۔ میں تمہیں ایک بزرگ کی حیثیت سے سمجھاتا ہوں آئندہ میری بیٹی کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لاؤ۔''

''جناب! آپ نے یہ دیکھا ہے کہ شیرازی کس طرح تسبیح ہاتھ میں لے کر آپ سے جھوٹ بولتا تھا۔ خود کو عبادت گزار ظاہر کرتا تھا۔ آخر اس کا جھوٹ کھل گیا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' آپ کا بھتیجا جرار حقی بھی پہلے نہ تو داڑھی رکھتا تھا، اور نہ ہی نماز

پڑھتا تھا۔ اب اچانک وہ روپ بدل کر آگیا ہے۔ یقیناً وہ بھی جانتا ہے کہ آپ جیسا بن کر رہے گا تو آپ اسے داماد بنانا قبول کریں گے۔''

انہوں نے گھور کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو کہ جرار پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟''

''میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بین الاقوامی سیاست کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میرے سامنے ملکی اور گھریلو سیاست بہت معمولی سی چیز ہے۔ ایک ذمہ دار صحافی جاسوس کی طرح ہر معاملے کی جڑ تک پہنچنے کی کوششیں کرتا رہتا ہے۔ میں بھی یہی کرتا ہوں۔ اس طرح میں جرار حقی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ وہ اپنے علاقے میں پچھلا الیکشن ہار چکا ہے۔ اگلے الیکشن کی تیاری کے لئے آپ کے پاس آیا ہوا ہے۔''

''وہ میرا بھتیجا ہے۔ میں تم سے زیادہ اسے جانتا ہوں۔ آج کل وہ میرے ساتھ دن رات رہتا ہے۔ وہ کلام پاک پڑھ کر بھول چکا تھا۔ میں ہر صبح اسے پڑھاتا ہوں۔ اور وہ بہت دل لگا کر پڑھتا ہے۔''

انہوں نے عامر جان کے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ''داڑھی رکھنے سے چہرے پر نور آتا ہے۔ ایک طرح کا تقدس پیدا ہوتا ہے۔ شخصیت میں بھی نکھار آجاتا ہے۔''

''آپ جرار حقی سے پوری طرح مطمئن ہیں کہ آپ نے اسے اپنے جیسا بنا لیا ہے۔ میں پھر ایک بار عرض کروں گا کہ آپ اپنے جیسا سب کو نہیں بنا سکتے۔''

انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کسی ایک کو تو بنا سکتا ہوں۔ مانا کہ ساری دنیا کو عبادت گزار نہیں بنا سکتا لیکن کسی ایک گھر کے ایک فرد کو تو روزے نماز کا پابند بنا سکتا ہوں۔ اور میں اپنے بھتیجے کو بنا رہا ہوں۔''

''میں آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ ایک آخری بات کہہ رہا ہوں۔ آپ ایک بہروپیے نمازی حشمت شیرازی سے دھوکہ کھا چکے ہیں۔ پتہ نہیں اور کتنے لوگ آپ کے سامنے داڑھی رکھ کر اور ہاتھوں میں تسبیح لے کر جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ پھر بھی سو میں سے دس ایسے ہوں گے جو آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوں گے۔ آپ اپنے دینی مشن میں ناکام نہیں ہیں۔ آپ کو کامیابیاں بھی حاصل ہوتی ہے۔ عرض یہ ہے کہ خدانخواستہ جرار سے بھی

دھوکہ ملاتو آپ مجھے یاد رکھیں گے۔اور مجھے اپنی غلامی میں قبول کریں گے۔میں بھی ایک مسلمان ہوں۔میرا بھی یہ ایمان ہے کہ انسان نیک نیتی سے کچھ طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے مایوس نہیں کرتا۔"

ایک گھنٹہ گزر گیا۔پھر دو گھنٹے گزر گئے۔وہ وہیں ہسپتال میں بیٹھے رہے۔انہیں بیٹی کی فکر تھی۔وہ شیرازی سے کہنا چاہتے تھے کہ تمہارا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔تم بھی مجھ پر مہربانی کرو۔میری بیٹی ابھی مجھے لوٹا دو۔شاید اس کے دل میں بھی رحم آجائے۔شاید وہ بیٹی کا پتہ ٹھکانہ بتادے۔

تین گھنٹے گزرنے لگے۔آپریشن میں اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوتی۔شیرازی کے رشتے دار وہیں ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔اچانک اس کا بھائی روتا ہوا آیا۔پھر ماں سے لپٹ کر بولا۔"بھائی صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

یہ سنتے ہی تمام رشتے دار رونے لگے۔ویٹنگ روم سے آپریشن تھیٹر کی طرف جانے لگے۔اس کی موت کی خبر سن کر حقی صاحب کی تو سانسیں رکنے لگیں۔بیٹی کی فکر ہو گئی کہ وہ واپس کیسے آئے گی؟ وہ مرنے والا ہی جانتا تھا کہ آفرین کو اغواء کر کے کہاں رکھا گیا ہے۔

وہ تیزی سے چلتے ہوئے ہسپتال سے باہر آئے۔پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پولیس افسر کے پاس پہنچ گئے۔اسے بتانے لگے کہ پچھلی رات شیرازی نے فون پر اغواء کی واردات کا اعتراف کیا تھا۔اسی کے آدمیوں نے آفرین کو اغواء کر کے کہیں چھپایا ہو گا۔

افسر نے پوچھا۔"آپ نے یہ بات مجھے کل رات ہی کیوں نہیں بتائی؟"

"اگر بتا دیتا تو پولیس کاروائی ہوتی اور میری بیٹی مجھے واپس نہ ملتی۔دشمن اسے مار کر کہیں پھینک دیتے۔اپنے اوپر الزام نہ آنے دیتے۔"

پولیس افسر نے پھر پوچھا۔"وہ اور کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہی کہ آج شام تک میری بیٹی گھر واپس آجائے گی۔میرا کھانا پینا حرام ہو چکا ہے۔میں کل سے جاگ رہا ہوں۔صبح ہی ہسپتال گیا تھا۔تاکہ آپریشن کے بعد اس سے ملاقات کروں۔اور اسے اللہ رسول ﷺ کا واسطہ دے کر ابھی بیٹی واپس لے آؤں۔لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔وہ تو آپریشن کے نتیجے میں مر گیا ہے۔اب میں کس سے

کہوں کس سے اپنی بیٹی واپس مانگوں؟"

پولیس افسر نے پریشان ہو کر کہا۔"حقی صاحب! آپ ہماری مجبوری کو سمجھ سکتے ہیں۔ان کے گھر میں میت ہو گئی ہے۔ہم وہاں جا کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرحوم نے آپ کی بیٹی کو اغواء کرایا تھا۔وہ لوگ سیاسی مگرمچھ ہیں،ہم کسی بھی گواہ اور ثبوت کے بغیر ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

انہوں نے کہا۔"وہ اپنے بھائی کے لئے میری بیٹی کا رشتہ بھی مانگ رہا تھا۔مجھے ایسا لگتا ہے کہ دونوں بھائی اغواء کی واردات میں شریک تھے۔ان کا یہ منصوبہ تھا کہ میری بیٹی کو اغواء کر کے اسے بدنام کیا جائے پھر اس کا رشتہ مانگا جائے تو میں انکار نہیں کروں گا۔آپ اس کے بھائی سے بات کریں۔اسے معلوم ہو گا کہ میری بیٹی کو کہاں لے جا کر رکھا گیا ہے۔"

"حقی صاحب! آپ فرشتہ ہیں۔عداوت رکھنے والوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتے۔وہ کبھی اعتراف نہیں کرے گا کہ اس کے بھائی نے یا اس نے آفرین کو اغواء کرایا تھا۔فی الحال آپ شام تک انتظار کریں۔شائد وہ واپس آجائے۔اگر نہیں آئے گی تو شیرازی کی تدفین کے بعد میں اس کے بھائی کا محاسبہ کروں گا۔"

وہ شام کو آگئی۔عباء میں ہی لپٹی ہوئی تھی۔بلکہ چھپی ہوئی تھی۔ٹیکسی سے اتر کر دوڑتی ہوئی کوٹھی کے اندر آئی۔پھوپھی نے چیخ کر کہا۔"میری بچی! آگئی....."

عبدالسلام حقی اور جرار حقی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔سب ہی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔وہ وہاں پہنچتے ہی ایک دیوار سے اپنا سر پھوڑنے لگی۔بار بار سر کو ٹکراتے ہوئے کہنے لگی۔"میں مر جانا چاہتی ہوں۔مجھے زہر لا کر دو۔میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتی۔"

پھوپھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔"نہیں میری بچی! ایسا نہیں کہتے۔مریں گے تمہارے دشمن۔اللہ ان دشمنوں کو جہنم کی آگ میں جلائے گا۔منہ پر سے نقاب تو ہٹاؤ۔سانس رک رہی ہو گی۔"

پھوپھی نے خود ہی نقاب کو ہٹایا تو چہرہ دیکھ کر ذہن کو جھٹکا سا لگا۔صاف پتہ چل رہا تھا کہ اسے بری طرح نوچا کھسوٹا گیا ہے۔عبا کے گریبان سے پھٹا ہوا لباس جھلک رہا

تھا۔ باپ کی نظریں جھک گئیں۔

وہ جرار حقی کا بازو پکڑ کر کمرے سے باہر گئے۔ پھر دروازے کے پیچھے جا کر بولے۔ ''میری بچی! صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔ ابھی شکرانے کی نماز ادا کرنے جا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صبر اور حوصلہ دے تمہارے لئے دعائیں مانگتا رہوں گا۔''

پھر انہوں نے بہن کو مخاطب کر کے کہا۔ 'صابرہ! اس سے پوچھو کیا یہ دشمنوں کو پہچان سکتی ہے؟ ان کی آواز یا چہروں سے شناخت ہو جائے تو انہیں قرار واقعی سزا ملے گی۔''

وہ جرار کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ پھوپھی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ آفرین دیوار سے لگ کر اکڑوں بیٹھ گئی تھی اور دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں پھر اسے سینے سے لگا کر تھپکنے لگیں۔ ''میری بچی! تم پر جو گزری ہے اور اب جو گزر رہی ہے، اس کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تو اندازہ ہی کر سکتی ہوں اور تمہارے ساتھ آنسو بہا سکتی ہوں۔ مگر یہ آنسو اب تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ساری زندگی بہتے رہیں گے تب بھی کم ہے۔ جو زخم تمہیں لگا ہے، اسے بھر تو نہیں سکتی، بس سمجھا سکتی ہوں' صبر کرو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

وہ آفرین سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ اس وقت پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس کے زخموں پر مرہم بھی رکھنا تھا۔ اس کا حلیہ بھی درست کرنا تھا۔ بیچاری کا حسن تاج محل کی مثال تھا۔ کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔

اس نے ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھا منا کر اس کا لباس تبدیل کروایا۔ فوری طبی امداد کے لئے جو دوائیں گھر میں موجود تھیں۔ ان کے ذریعے مرہم پٹی کی، وہ رو بھی رہی اور سوچ بھی رہی تھی۔ ''عامر جان کو کیا منہ دکھائے گی؟ کیا آئندہ یونیورسٹی جا سکے گی؟''

اس نے خود ہی انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔ اب میں باہر نہیں نکلوں گی۔ کسی کو بھی منہ نہیں دکھاؤں گی۔ آہ! عامر جان! میں تمہارے لئے محفوظ نہ رہ سکی۔ اب کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔''

وہ پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

صابرہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے اسے بیٹی کی طرح پالا تھا۔ اس کا دکھ دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے۔ وہ بڑے کرب سے خدا کو یاد کر رہی تھیں۔ اور پوچھ رہی تھیں۔ ''یا اللہ تعالیٰ! تیری دنیا میں ہم عورتیں محفوظ کیوں نہیں رہ پاتیں؟ میری بچی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ کیا جو گناہ نہیں کرتے' کوئی غلطی نہیں کرتے انہیں بھی سزا ملتی ہے؟''

حقی صاحب ڈرائینگ روم میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جرار بھی سامنے سر جھکائے ہوئے تھا اور چور نظروں سے انہیں دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ ''بابا جانی پہاڑ تھے، اور میں یہاں اونٹ بن کر آیا تھا۔ لیکن اب یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ اب ان کی بدنام بیٹی کو کوئی قبول نہیں کرے گا۔ میں ہی قبول کر سکتا ہوں۔ میں ان کے لئے اب پہاڑ ہو گیا ہوں اور یہ میرے سامنے اونٹ کی طرح چھوٹے پڑ گئے ہیں۔''

وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''بابا جانی! آپ جہاندیدہ ہیں۔ دنیا جہاں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ پھر بھی میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میری عقل کہتی ہے' اس معاملے سے پولیس والوں کو دور رکھا جائے۔ وہ واردات کرنے والوں کو پکڑیں گے، انہیں سزا بھی دلوائیں گے، تو بدنامی ہماری ہی ہوگی۔ آپ اس قدر مشہور اور معروف ہیں کہ اخبار والے آپ کی ذرا ذرا سی خبریں بھی چھاپ دیتے ہیں۔''

انہوں نے قائل ہونے کے انداز مین سر ہلایا پھر کہا۔ ''قانون کے مطابق تو مجرموں کو سزا ملنی ہی چاہئے۔ اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میری معصوم بیٹی پر ظلم کیا گیا ہے لیکن ایسا ظاہر کرنے سے بدنامی اپنی ہی ہوگی۔ میری بچی اپنے رشتے داروں کے سامنے بھی سر جھکا کر رہا کرے گی۔''

جرار نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے آفرین کا سر کسی کے سامنے نہیں جھکے گا۔ اس کی رسوائی میری رسوائی ہے۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ میں اس کے سر پر حیاء کا آنچل رکھوں گا۔''

حقی صاحب کو یوں لگا جیسے ڈوبنے والے کو صرف سہارا نہیں ملا' کنارہ بھی مل گیا

ہے۔انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''بیٹے! ہمارے خاندان میں یوں تو کئی جوان
لڑکے ہیں۔لیکن موجودہ حالات میں آفرین کو جو بھی قبول کرے گا ، وہ میری دولت اور
جائیداد کے لالچ میں ہی ایسا کرے گا۔تم میرے سگے بھائی کے بیٹے ہو۔سب سے بڑی
بات یہ ہے کہ میرے نقش قدم پر چل رہے ہو۔''

انہوں نے ایک ذرا توقف سے کہا۔''میں تقریباً ایک برس تک تمہیں آزمانا چاہتا
تھا۔اب نہیں آزماؤں گا۔جلد سے جلد آفرین کا نکاح تم سے پڑھادوں گا۔''

''وہ صدمات سے بری طرح ٹوٹ رہی ہے،آپ اسے پیار محبت سے
سمجھائیں کہ موجودہ حالات میں اس کی بدنامی اسی طرح چھپ سکتی ہے کہ وہ جلد سے جلد
میری شریک حیات بن جائے۔وہ میری عزت بن کر رہے گی تو کوئی اس کی طرف انگلی
اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا۔''

صابرہ پھوپھی دروازے پر کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔انہوں نے اندر
آکر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''ابھی اس کی شادی کی بات نہ ہی کی جائے تو بہتر ہو
گا۔بدن پر زخم لگے تو بھر جاتا ہے،دل پر لگا زخم اتنی جلدی نہیں بھرتا۔اس کے لئے ایک
عرصہ لگتا ہے۔وہ اتنی جلدی شادی کے لئے راضی نہیں ہوگی۔''

جرار نے کہا۔''پھوپھی جان! میں جانتا ہوں' آپ کوئی نہ کوئی رکاوٹ ضرور
پیش کریں گی۔خدا کے لئے بدنامی کو مٹانے اور نیک نامی کو بحال رکھنے کی باتیں کریں۔یہ
بات اب چھپی ہوئی نہیں ہے۔جن لوگوں نے اغواء کیا تھا،وہ آئندہ بھی ہم پر کیچڑ اچھالنے
کی کوششیں کرتے رہیں گے۔جب میں مجازی خدا بن جاؤں گا ،اور دعوے سے کہوں گا کہ
میری بیوی پہلے بھی عزت دار اور پارسا تھی اور آج بھی اتنی ہی پارسا ہے،اسی لئے میں نے
اسے اپنی عزت بنایا ہے تو سب کو چُپ لگ جائے گی۔''

حقی صاحب نے کہا۔''جرار درست کہہ رہا ہے۔رشتے داروں کا منہ بند کرنے
کے لئے اور دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے آفرین کی شادی جتنی جلدی کر دیں
اتنا ہی بہتر ہے۔جب ایک شخص شوہر بن کر کسی لڑکی کو تحفظ دیتا ہے تو پھر دنیا والوں کی زبانیں
بند ہو جاتی ہیں۔تم اسے سمجھاؤ کہ بابا جانی کا سر جھک گیا ہے۔اب وہی میری برسوں کی نیک

نامی کو بحال کر سکتی ہے۔''

''بھائی جان! آپ کہہ رہے ہیں تو میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ابھی
تو اس سے کوئی بات کرنا فضول ہے۔وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔شرم کے مارے مجھ
سے بھی اچھی طرح بات نہیں کر رہی ہے۔بالکل چپ چپ سی ہے۔میں نے اسے زبردستی
جوس پلایا ہے۔اور اسے بستر پر لٹا دیا ہے۔وہ سوکر اٹھے گی تو کل اس سے بات کروں گی۔''

حقی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔''آؤ جرار! عشاء کی نماز ادا کریں۔''

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔صابرہ جانتی تھی کہ وہ دونوں نماز ادا کرنے کے
بعد مسجد میں تھوڑی دیر بیٹھے رہیں گے۔اور وہاں کے منتظمین سے مسجد کے سلسلے میں
اخراجات کا حساب کتاب دیکھتے رہیں گے۔

ان کے جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔پھر فون کے پاس آکر بیٹھ
گئی۔ریسیور اٹھا کر عامر جان کے نمبر پنچ کئے۔چند سیکنڈ میں ہی رابطہ ہو گیا۔دوسری طرف
سے اس کی آواز سنائی دی۔''اسلام علیکم پھوپھی جان! میں نے سی ایل آئی پر اس گھر کے نمبر
پڑھے ہیں۔آپ ہی بول رہی ہیں ناں؟ آفرین کی کوئی خبر ملی؟''

''ہاں بیٹے! اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔یہ واپس آگئی ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔''اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔پلیز۔اس
سے بات کرائیں۔''

''نہیں بیٹے! وہ بری طرح سے ٹوٹ گئی ہے۔صدمے سے نڈھال ہو رہی ہے۔
رو رو کر برا حال ہے۔میں نے بڑی مشکلوں سے سمجھا منا کر اسے سلایا ہے۔''

''کیا اس نے کچھ بتایا کہ کن لوگوں نے اغواء کیا تھا؟ اور اسے کہاں لے گئے تھے؟''

''اسے اغواء اور بدنام ہونے کا اس قدر صدمہ ہے کہ فی الوقت اس سلسلے میں
کوئی سوال نہیں کرنا چاہئے۔''

''پلیز۔آپ اسے بتائیں کہ میں اس کے لئے کس قدر پریشان رہا ہوں۔اب بھی
ہوں۔اور ہر برے وقت میں اس کے ساتھ ہی رہوں گا۔ساری زندگی ساتھ رہوں گا۔''

''بیٹے! اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے۔اس کے بعد وہ شرم سے مری جا رہی

ہے۔ کہہ رہی تھی کہ کبھی تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔ اپنا منہ کسی کو نہیں دکھائے گی۔"

"موجودہ حالات میں وہ یہی سوچے گی۔ ایسی ہی باتیں کرے گی۔ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ ساری دنیا سے پردہ کرے لیکن مجھ سے نہ کرے۔ میں اسے اتنی عزت دوں گا۔ اتنا تحفظ دوں گا کہ کوئی اس پر کیچڑ اچھالنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔"

"میں تو دل و جان سے یہی چاہتی ہوں کہ وہ تمہاری پناہ میں چلی جائے۔ لیکن یہاں جرار حقی بھائی جان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ بدنامی پر مٹی ڈالنے کے لئے آفرین کو اور مٹی میں ملانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بھائی جان بھی جلد سے جلد اس کا نکاح جرار سے پڑھوانا چاہتے ہیں۔"

"پلیز پھوپھی جان! آپ اپنے بھائی جان کو ایسا کرنے سے کسی طرح بھی روکیں۔"

"میں کس طرح روک سکتی ہوں؟ وہ اپنی برسوں کی نیک نامی کو بحال رکھنے کے لئے جتنی جلدی ہو سکے جرار کے نام کی چادر اس کے سر پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ میں انہیں روک نہیں سکوں گی۔"

"آپ ایک بار آفرین سے میری بات کرا دیں۔ وہ بالغ ہے۔ اپنا فیصلہ خود کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اگر وہ جرار سے انکار اور مجھ سے شادی کرنے کا اقرار کرے گی تو آپ کے بھائی جان کو انصافاً جھکنا پڑے گا۔ وہ دین دار ہیں۔ اور دین کے مطابق لڑکی کی رضامندی ضرور حاصل کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ ایسا ضرور کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ کل صبح آٹھ بجے کے بعد کسی وقت بھی تمہاری بات کراؤں گی۔ اب میں فون بند کرتی ہوں۔ شب بخیر۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ پھر سوچنے لگی۔ "اپنی بچی کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ابھی وہ ایک عذاب . . . سے گزر کر آ رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ دوسرے عذاب میں مبتلا ہو جائے......"

☆☆☆

دوسرے دن آفرین اپنے ہی کمرے میں محدود رہی۔ وہ اپنے بابا جانی اور جرار کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی اس کی جھجک اور شرم کو سمجھتے تھے۔ اپنی بہن صابرہ کے

ذریعے اس سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔

صابرہ نے آفرین کو بتایا کہ کس طرح بدنامی پر مٹی ڈالنے کے لئے جلد سے جلد اسے سہاگن بنانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اس نے کہا۔ "میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ کسی مرد کا منہ نہیں دیکھوں گی۔"

"بیٹی! ایسا نہ کہو۔ لڑکی کو شادی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اسی سے ماں باپ اور خاندان کی عزت بنی رہتی ہے۔ شادی نہیں کرو گی تو بدنامی اور بڑھے گی، لوگ تو یہی کہیں گے کہ میر عبدالسلام حقی کی بیٹی پارسا نہیں ہے۔ کوئی اسے پوچھتا نہیں ہے۔ کہیں سے اس کا رشتہ بھی نہیں آتا ہے۔ تمہارے بابا جی کی عزت پہلے ہی خاک میں مل رہی ہے۔ کیا تم اور خاک میں ملانا چاہتی ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔ بابا جانی نے بڑی محنت اور ریاضت سے ایمان کی راہ پر چلتے ہوئے عزت اور شہرت حاصل کی ہے۔ میں انہیں اور بدنام ہونے نہیں دوں گی۔ وہ جو کہیں گے۔ وہی کروں گی۔"

"وہ تو غلط فیصلہ کر رہے ہیں۔ جلد سے جلد جرار سے تمہارا نکاح پڑھا دینا چاہتے ہیں۔"

اس نے پریشانی سے پھوپھی کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "عامر جان تمہارے لئے بہت پریشان ہے۔ کل بھی اس نے فون کیا تھا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے۔ وہی تمہاری بدنامی کو نیک نامی میں بدل سکتا ہے۔ اس سے ایک بار فون پر بات کرو۔"

"نہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں بات نہین کروں گی۔"

"شرمانے سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ شادی تو تمہیں کرنی ہی ہے۔ خواہ کسی سے بھی ہو تو پھر عامر جان سے کیوں نہ ہو؟"

وہ منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں اب ان کے قابل نہیں رہی۔"

"فضول بات نہ کرو۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی تمہاری عزت کرتا ہے۔ اور تمہیں اپنی عزت بنا لینا چاہتا ہے۔ تمہارے بابا جانی زمینوں پر گئے ہیں۔ شام تک واپس آئیں

گے۔ جرار بھی ان کے ساتھ ہے۔ چلو! ڈرائینگ روم میں چلتے ہیں۔"

"نہیں پھوپھی جان! میں ان سے بات نہیں کر سکوں گی۔"

"تم دنیا والوں سے منہ چھپاؤ' لیکن عامر جان سے تو سامنا کرنا ہی ہوگا۔ ابھی فون پر صرف بات کرنی ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔ ایک پہاڑ جیسی زندگی گزارنے کا معاملہ ہے۔ چلو اٹھو۔"

صابرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اٹھایا۔ پھر اسی طرح ہاتھ پکڑے اسے ڈرائینگ روم میں لے آئی۔ زبردستی فون کے سامنے بٹھایا پھر عامر جان کے نمبر پنچ کئے۔

عامر جان کے نام سے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔ لیکن اس وقت وہی دل شرم کے مارے ڈوب رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے بات کیسے کرے گی؟

رابطہ ہونے پر پھوپھی جان نے کہا۔ "ہیلو عامر جان! میں بول رہی ہوں۔ یہ لو۔ آفرین سے بات کرو۔"

انہوں نے ریسیور آفرین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اس کے کان سے لگاتے ہوئے بولیں۔ "چلو، بات کرو۔"

وہ چپ رہی۔ دوسری طرف سے عامر جان نے کہا۔ "ہیلو آفرین! میں عامر جان بول رہا ہوں۔ تمہارا عامر جان....."

اس کی آواز کان کے اندار یوں محسوس ہوئی جیسے وہ دل کے اندر گھس آیا ہو۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے بڑے دکھ اور محبت سے کہا۔ "چپ ہو جاؤ میری جان! تم رو رہی ہو تو میری جان نکل رہی ہے۔ کچھ نہیں ہوا۔ یقین کرو۔ تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ تم نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلنے پر وہ خواب ختم ہو چکا ہے۔ اب اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمہارا یہ عامر جان تمہاری عزت اور جان کا محافظ بن کر رہے گا۔ ایسے وقت تمہیں ذرا حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ اپنے بابا جانی سے کہنا ہوگا کہ تم میری شریک حیات بننا چاہتی ہو۔"

وہ روتے اور سسکتے ہوئے بولی۔ "میں ایسا نہیں کہہ سکوں گی۔ میری وجہ سے پہلے ہی ان کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔"

"تمہاری وجہ سے نہیں۔ دشمنوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ تم تو بے گناہ ہو۔ آج بھی معصوم ہو۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔"

"کچھ بھی ہو۔ بابا جانی آپ کو قبول نہیں کریں گے۔"

"کیوں نہیں کریں گے؟"

"اس لئے کہ آپ ان کے نقش قدم پر نہیں چل رہے ہیں۔ ان کے مطالبات پورے نہیں کر رہے ہیں۔"

"یہی بات تو انہیں سمجھانی ہے کہ میں بہروپیا نہیں بن سکتا۔ جو ہوں وہی ظاہر کرتا ہوں۔ اگر میں پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھتا صرف ایک وقت کی پڑھتا ہوں تو ایک وقت کا ہی ذکر کرتا ہوں۔ جھوٹ نہیں کہتا۔ دھوکہ نہیں دیتا۔ تمہارے بابا جانی کیوں چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے جو بھی آئے بہروپیا بن کر رہے۔ وہ مجھ جیسے سچ بولنے کو سمجھنا کیوں نہیں چاہتے؟ تمہیں ان کو سمجھانا ہی ہوگا۔"

"نہیں عامر جان! میری وجہ سے بابا جانی کو بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ آپ میرے لئے اپنے طور پر جو بھی کر سکتے ہیں' وہ کریں، اور اگر کچھ نہ کر پائے تو میں بابا جانی کے فیصلے کے آگے سر جھکا دوں گی۔ اپنے بابا جانی کی نیک نامی کو بحال رکھنے کے لئے جو کرنا پڑا وہ کر گزروں گی۔ آپ خود ان سے بات کریں۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور نہیں کہہ سکوں گی۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

پھوپھی نے کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ اس کا جواب تو سننا چاہئے تھا۔"

"میں ان کا جواب کیا سنوں؟ جن حالات سے گزر کر آئی ہوں۔ ان کے پیش نظر بابا جانی میرے لئے سب سے اہم ہیں۔ ان کی عزت اور نیک نامی کو بحال رکھنا میرا سب سے پہلا فرض ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر روتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ پھوپھی بڑے صدمے سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

عامر جان نے اس بات کو تسلیم کیا کہ حقی صاحب سے اسے براہ راست گفتگو کرنا

چاہئے، آفرین ایک شکست خوردہ لڑکی ہے۔ حالات نے اسے اس طرح سے توڑا ہے کہ وہ اپنے بابا جانی سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکے گی۔ اور نہ ہی اسے منوانا چاہئے۔ اسے خود کو اپنے بابا جانی کے رحم کرم پر چھوڑ دینا چاہئے۔

اس نے اسی وقت حقی صاحب کے موبائل فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ ”جناب عالی! میں عامر جان بول رہا ہوں۔“

ان کی آواز سنائی دی۔ ”ہوں۔ بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”سب سے پہلے تو آپ کی صاحبزادی کی واپسی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ گھر پہنچ کر اسے ایک نئی اور محفوظ زندگی مل رہی ہے۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ گھر واپس آ گئی ہے؟“

”یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں ایک صحافی ہوں اور ایک جاسوس کی طرح ہر متعلقہ فرد کے بارے میں چھان بین کرتا رہتا ہوں۔“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے ذاتی اور گھریلو معاملات میں دلچسپی نہ لو۔“

”اور میں نے بھی عرض کیا تھا کہ آپ کی غلامی میں آنا چاہتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے قبول کر لیں۔“

”مجھے افسوس ہے، میں تم سے پہلے اپنے بھتیجے جرار حقی کو داماد بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ آج ہی صبح فجر کی نماز کے بعد میں نے مسجد میں بیٹھ کر جرار کو زبان دی ہے۔ آج سے چار ماہ اور دس کے بعد آفرین کا نکاح اس سے پڑھا دیا جائے گا۔ اس فیصلے کے بعد تمہیں کچھ کہنا نہیں چاہئے۔“

”مجھے یہ کہنا چاہئے کہ آپ دین دار ہیں۔ دینی احکامات کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ آپ کو پہلے اپنی صاحبزادی کی رضامندی حاصل کرنا چاہئے اس سے بھی پوچھنا چاہئے کہ وہ کس کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزارنا چاہتی ہے؟“

”بیٹی کو اگر میرے فیصلے پر اعتراض ہوگا تو ضرور پوچھوں گا۔ میں اپنی سعادت مند بیٹی کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ اسے اپنے باپ پر اعتماد ہے کہ اس کے حق میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گا۔“

”آپ کی صاحبزادی سعادت مند ضرور ہیں لیکن شرم و حیاء کے باعث یہ کہہ نہیں پا رہی ہیں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہیں۔ میرے ساتھ ساری عمر رہنا چاہتی ہیں۔“

”پھر تو وہ محض جذباتی انداز میں ایسا چاہتی ہے۔ اسے یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہمارے گھر اور خاندان کا ماحول مکمل طور پر دینی ہے اور تم دین سے دور اور دنیا سے بہت قریب ہو۔ دنیاوی معاملات میں اس قدر الجھتے رہتے ہو کہ باقاعدہ نمازیں ادا نہیں کر سکتے۔ میں نے سنت رسول ﷺ کے مطابق داڑھی رکھنے کا مشورہ دیا تو تم نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میری بیٹی یہ سمجھ نہیں سکتی، لیکن میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم نام کے مسلمان ہو۔ کبھی فرصت ملی تو اس طرح نماز پڑھتے ہو جیسے اپنے معبود پر احسان کر رہے ہو۔ پتہ نہیں روزے رکھتے ہو یا نہیں؟ بہرالحال۔ میں اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں بولوں گا۔ میں نے ایسا داماد پسند کیا ہے جو میرے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ میں آخری فیصلہ کر چکا ہوں اب بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں عشق و محبت کی راہ میں تمام کھلنے والے دروازے بند کر دیئے۔

☆☆☆

شادی خانہ آبادی ہو گئی۔ اپنا سب کچھ لٹ جانے کے بعد آفرین بے زبان ہو گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے باپ کے فیصلے پر سر جھکا لیا تھا۔ جرار کو مجازی خدا تسلیم کر کے اس کی زندگی میں چلی آئی تھی۔

اس کے اپنے احساسات اور جذبات تھے اور جذبات یہ تھے کہ اس نے اپنی ساری زندگی سارا وجود صرف عامر جان کے لئے امانت کے طور پر رکھا تھا۔ جب وہ امانت ہی نہ رہی تو اپنے محبوب کے لئے کیا رہ گیا تھا؟

وہ تو اس قدر شرمندہ تھی کہ اس کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فون پر بھی جبراً پھوپھی کے کہنے سے بات کی تھی۔ اس کے بعد اس سے سامنا کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی اور نہ ہی وہ نکالنا چاہتی تھی۔ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہی ہوا۔ اس نے حالات کے سامنے سر جھکا لیا تھا۔ بے چاری پھوپھی جان کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ ایک ماہ بعد ہی وہ اللہ کو

پیاری ہوگئیں۔حقی صاحب بیٹی کو دیکھ کر سوچتے تھے کہ وہ پہلے کی طرح مسکراتی نہیں ہے۔ چپ چپ سی رہتی ہے۔لباس شکن آلود ہوتا ہے۔بال بکھرے رہتے ہیں۔یوں اجڑی اجڑی سی دکھائی دیتی ہے، جیسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔

انہوں نے ایک دن پوچھا۔''بیٹی! کیا تم خوش نہیں ہو؟''

وہ چپ رہی۔فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔انہوں نے پھر پوچھا۔''کیا بات ہے؟ جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

''میں کیا جواب دوں؟ آپ نے ہی فرمایا تھا کہ شوہر کو خوش رکھوگی ،تو مجھے بھی خوشیاں ملیں گی اور خوش ہو کر کرنا کیا ہے؟ بس میں مطمئن ہوں۔میں نے آپ کے حکم پر سر جھکایا ہے اور آپ کی مرضی کے مطابق ازدواجی زندگی گزار رہی ہوں۔سہاگن بننے کے بعد میں بھی مطمئن ہوں۔آپ بھی مطمئن ہو گئے ہیں۔اب کوئی مجھ پر انگلی بھی نہیں اٹھاتا ،اور نہ ہی کسی حوالے سے بات بناتا ہے۔''

حقی صاحب نادان نہیں تھے۔سمجھ رہے تھے کہ بیٹی باتیں بنا رہی ہے۔ورنہ حقیقتاً وہ اپنی ازدواجی زندگی سے خوش نہیں تھی۔دس ماہ کے بعد الیکشن ہوئے تو جرار کو یہ کہنا نہیں پڑا کہ اس کی سیاسی حمایت کی جائے۔وہ بھلا داماد کی حمایت نہ کرتے تو اور کس کی کرتے؟ جرار نے بیٹی کو جیت کر اپنے سسر کے تمام فیصلوں کو جیت لیا تھا۔

الیکشن ہو گئے۔جرار نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔قومی اسمبلی میں پہنچ گیا۔وہاں بھی سیاسی ہیرا پھیری سے وزیرِ زراعت بن گیا۔اس قدر کامیابیاں حاصل کرتے ہی آفرین کو لے کر اسلام آباد چلا گیا۔

حقی صاحب نے پہلی بار اعتراض کیا۔''بیٹے! تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے۔تم نے اس علاقے سے کامیابی حاصل کی ہے۔اس شہر کی ترقی کے لئے تمہیں یہیں رہنا چاہئے۔''

اس نے کہا۔''بابا جانی! آپ سیاست کو مجھ سے زیادہ نہیں سمجھتے ہیں۔اسلام آباد میں ہمہ وقت حاضر رہنا لازمی ہوتا ہے۔ورنہ ایک ذراسی سیاسی ہیرا پھیری سے کوئی بھی میری جگہ چھین سکتا ہے۔''

''تم پورے ایمان اور دیانت داری سے اپنے فرائض کی ادائیگی کرتے رہو گے تو

کوئی بھی تمہاری جگہ چھین نہیں سکے گا۔''

''میں اپنے سیاسی مسائل کو آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔پھر یہ کہ رشتے دار اور دوسرے لوگ طعنے دیتے ہیں کہ میں یہاں رہ کر گھر داماد بن گیا ہوں۔آپ کو تو خود ہی سمجھ لینا چاہئے کہ ساری زندگی یہاں نہیں رہ سکتا۔میری اپنی پرسنل لائف ہے۔اپنے بہترے ذاتی معاملات ہیں۔پھر یہ کہ میں یہ ملک تو چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں۔اسلام آباد ہی تو جا رہا ہوں۔آپ جب چاہیں گے بیٹی کو اپنے پاس بلا سکیں گے یا بیٹی کے پاس آسکیں گے۔میں بھی آتا جاتا رہوں گا۔''

اس نے اسلام آباد میں رہائش اختیار کر لی۔آفرین بھی گھر سے چلی گئی۔بہن پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔حقی صاحب بالکل تنہا رہ گئے۔اب وہ نہیں جانتے تھے کہ بیٹی کس طرح اپنی ازدواجی زندگی گزار رہی ہے۔اور داماد کیا کرتا پھر رہا ہے؟

ایک برس بعد انہوں نے اخبار میں جرار کی تصویر دیکھی۔تو حیران رہ گئے۔اس کی داڑھی چھوٹی ہو گئی تھی۔اتنی چھوٹی جیسے شیو کرنا بھول گیا ہو۔انہوں نے دو ماہ پہلے اپنے داماد سے ملاقات کی تھی۔اس وقت اس کی باقاعدہ داڑھی تھی۔ہاتھ میں تسبیح بھی تھی۔اب اخبار کی تصویر میں داڑھی گم ہو رہی تھی۔اور ہاتھ میں تسبیح کی جگہ موبائل فون آگیا تھا۔

ان کا سر چکرانے لگا۔تصویر کو دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے والا داماد تبدیل ہو رہا ہے۔انہوں نے فون پر رابطہ کیا تو آفرین کی آواز سنائی دی۔''اسلام علیکم بابا جانی!''

''وعلیکم اسلام بیٹی! جرار کہاں ہے؟''

''پتہ نہیں۔وہ کہاں مصروف رہتے ہیں؟ راتوں کو بہت دیر سے آتے ہیں۔صبح پھر چلے جاتے ہیں۔''

''میں نے ابھی ایک اخبار میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔یہ تو بالکل ہی بدل گیا ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔''آپ نے تو تصویر ہی دیکھی ہے۔میں تو دن رات انہیں بدلتے دیکھ رہی ہوں۔اور چپ ہوں۔''

''چپ کیوں ہو؟ تمہیں ایسی تبدیلیوں پر اعتراض کرنا چاہئے۔''

"میں کیسے اعتراض کرسکتی ہوں، آپ کی ہدایت ہے کہ شوہر کے سامنے اونچی آواز میں نہ بولا جائے۔"

"مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہے؟"

"ضرورت کی کوئی چیز بازار سے لائی جاتی ہے۔ جب ضرورت پوری ہوجائے تو اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ میں بھی ایک طرف رکھی ہوئی ہوں۔"

فون پر اس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ باپ نے تڑپ کر پوچھا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمہیں نظرانداز کرنے لگا ہے؟"

"آپ ہی کی ہدایت ہے کہ شوہر کی شکائت نہ کی جائے۔ اسے محبت اور خدمت گزاری سے جیتنے کی کوششیں کی جائیں اور میں کوششیں کرتی رہتی ہوں۔"

"کیا تمہاری خدمت گزاری کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا؟"

"وہ اپنے ہوش وحواس میں رہیں گے تب ہی میری محبت اور خدمت گزاری کو سمجھ پائیں گے۔ وہ راتوں کو دیر سے آتے ہیں۔ اس وقت نشے میں چور ہوتے ہیں۔ صبح جب نشہ اترتا ہے تو غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر لباس تبدیل کرتے ہیں، پھر چلے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھنے اور سمجھنے کی انہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔"

حقی صاحب کا سر گھومنے لگا۔ انہوں نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "کیا وہ نشہ کرتا ہے؟"

"جی ہاں۔ میں نے اعتراض کیا تو جواب ملا، یہاں سے امریکہ تک کتنے ہی سیاست دانوں سے ملاقات کرنی پڑتی ہے۔ ان کی سوسائٹی کے مطابق رہنا سہنا اور کھانا پینا پڑتا ہے۔ ان کی کوک ٹیل پارٹیز میں بھی شامل ہونا پڑتا ہے۔"

انہوں نے غصے سے کہا۔ "اس نالائق سے کہو یہاں آکر مجھ سے ملے۔ اگر نہیں آئے گا، نہیں ملے گا تو میں وہاں چلا آؤں گا۔"

"آپ سے ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ وہ کل صبح کی فلائٹ سے واشنگٹن جارہے ہیں۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولے۔ "یا خدا! میں کیا کروں؟ میں تو نیک نیتی سے ہدایات دیا کرتا ہوں۔ لوگ مجھے دھوکہ دینے کے لئے بہروپئے کیوں بن جاتے ہیں؟"

"بابا جانی! آپ سے ایک عرض ہے۔ جو اخبار آپ پڑھا کرتے ہیں۔ عامر جان اس کے نائب مدیر بن چکے ہیں۔ ان کے کالم آج کل بہت مقبول ہورہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں، آپ انہیں بھی پڑھا کریں۔"

"اچھی بات ہے بیٹی! میں پڑھوں گا۔ تم سے پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔"

انہوں نے فون بند کردیا، عامر جان تصور میں دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے اس اخبار میں نائب مدیر کی حیثیت سے اس کا نام پڑھا تھا۔ لیکن اس کے کالم کو نظرانداز کیا تھا۔ وہ اسی وقت اخبار اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ اس کے ایک کالم پر نظر پڑی۔ وہ اسے پڑھنے لگے۔

آخر تک پڑھنے کے بعد یوں لگا جیسے عامر جان نے ان کے ہی متعلق لکھا ہو، اس کی تحریر کا لب لباب یہ تھا کہ دینی معاملات ہوں یا دنیاوی معاملات، انسان کو انتہا پسند نہیں ہونا چاہئے۔ کسی بھی شعبے میں انتہا پسندی ہو تو وہ نقصان پہنچاتی ہے۔ یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ ہم اپنے جیسا دوسروں کو نہیں بنا سکتے۔ اگر بنانا چاہیں گے تو ادھر سے جھوٹ اور فریب ہی ملے گا۔ ہمارا کام ہدایت دینا ہے۔ اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو راہ راست پر لانا ہے، اور کسے گمراہ ہونے کے لئے اور اپنے اعمال کی سزا پانے کے لئے ڈھیل دے دینی ہے۔

وہ سر جھکا کر سوچنے لگے۔ موجودہ حالات میں انہوں نے تسلیم کیا کہ وہ اپنی سادگی کے باعث لوگوں کو سمجھنے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس بار انہوں نے زبردست دھوکہ کھایا ہے۔ اپنی بیٹی کی پوری زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔

جرار صرف دو برس تک قومی اسمبلی میں رہا۔ پھر اچانک ہی حکومت گر گئی۔ ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ رہا تھا۔ اس لئے فوج نے عارضی طور پر ملک کی باگ ڈور سنبھال لی اور علان کیا کہ گیارہ ماہ کے بعد نئے سرے سے الیکشن ہوں گے اور آئندہ کرپٹ سیاست دانوں کو الیکشن میں حصہ لینے نہیں دیا جائے گا۔

اخبارات میں ایسے کرپٹ سیاست دانوں کے نام شائع کئے گئے، جنہوں نے قومی خزانے سے قرضہ لیا تھا اور اس کی ادائیگی نہیں کی تھی۔ ان میں جرار کا نام بھی تھا۔ اس نے پچاس کروڑ روپے قرض لئے تھے اور ملک سے باہر جا کر بیٹھا ہوا تھا۔ قرضوں کے سلسلے

میں نادہندگان کی فہرست سے اپنا نام خارج کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

سیاست میں سب کچھ ہوتا ہے۔ بس ایمان نہیں ہوتا۔ بے ایمانی خود غرضی اور مفاد پرستی کے بغیر سیاست داں کبھی نہیں پنپتے۔ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ الیکشن میں کسی بھی کرپٹ سیاست داں کو حصہ لینے کا موقع نہیں دیا جائے گا لیکن رفتہ رفتہ وہ اعلان بدل گیا۔ قرض نادہندگان کے خلاف صرف اخبارات میں چیخ و پکار ہوتی رہی اور وہ سارے سیاست داں پھر سے الیکشن لڑنے کے لئے خم ٹھونک کر منظر عام پر آ گئے۔

جرار بھی اپنی پجیرو میں بیٹھ کر سید عبدالسلام حقی صاحب سے ملنے آیا۔ انہوں نے دروازے پر ہی اسے روک کر پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو؟“

”بابا جانی! آپ یہ کیسا سوال کر رہے ہیں؟ میں آپ کا بھتیجا بھی ہوں اور داماد بھی۔ میں یہاں دن رات آ سکتا ہوں۔“

”پچھلے دو برسوں میں رات کو تو کیا دن کو بھی ملنے نہیں آئے۔ اب کیسے فرصت مل گئی؟“

”آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے دو برسوں میں اپنے ملک اور قوم کی بڑی بڑی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔“

”ملک و قوم کو تو نہیں، خود کو بہت سنبھالا ہے۔ قومی خزانے سے پچاس کروڑ ہتھیا لئے، پھر وزیرِ زراعت کا عہدہ سنبھال کر پتہ نہیں کتنے کروڑ کماتے رہے؟“

”بابا جانی! یہ باتیں آپ گھر کے اندر بھی کر سکتے ہیں۔ دروازے پر تو محاسبہ نہ کریں۔“

”بے شک۔ تم میرے داماد اور بھتیجے کی حیثیت سے گھر میں آؤ۔ لیکن سیاست کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرو گے۔“

”آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ سیاست تو ہماری خوراک ہے۔ خوراک کے بغیر کیا انسان زندہ رہ سکتا ہے؟“

”تو پھر یہ خوراک اس گھر سے باہر ہی کھاتے رہو اور ڈکاریں لیتے رہو۔ میرے گھر میں یہ خوراک نہیں ملے گی۔“

”بابا جانی! ہمارے پارٹی لیڈر نے مجھے اسی علاقے سے الیکشن لڑنے کا ٹکٹ دیا ہے۔ آپ سے اس سلسلے میں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”تمہاری بہت سی باتوں کے جواب میں میری ایک ہی بات آخری اور فیصلہ کن ہے، اب میں تمہاری سیاسی حمایت نہیں کروں گا۔“

وہ شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”آپ اور میری حمایت نہیں کریں گے؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں آپ کا بھتیجا ہی نہیں، داماد بھی ہوں۔ میری کامیابی آپ کی بیٹی کی کامیابی ہے۔ پچھلے دو برس سے وہ ایک بہت بڑے وزیر کی شریک حیات کہلاتی آئی ہے۔ آئندہ بھی اسے یہی عزت اور مرتبہ ملتا رہے گا۔“

”میں ایسے بلند مرتبے اور عزت اور شہرت پر لعنت بھیجتا ہوں، جو عوام کا لہو نچوڑ کر قومی خزانے پر ڈاکہ ڈال کر حاصل کی جاتی ہیں۔ تم تو ایسے بہروپئے ہو جو داڑھی بڑھا کر ہاتھ میں تسبیح لے کر خدا کے نام پر دھوکہ دیتے رہے ہو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کبھی تمہاری حمایت نہیں کروں گا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”دیکھئے بابا جانی! میں یہ مانتا ہوں کہ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ آئندہ نہیں ہوں گی۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ ایک بار اور میری حمایت کریں۔ اگلی بار میں الیکشن جیتنے کے بعد پچھلی غلطیوں کی تلافی کروں گا۔“

”تم خدا کا نام لے کر دھوکہ دیتے رہے ہو۔ میں کبھی تم پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ اس علاقے کے بچے بوڑھے عورتیں اور مرد مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے داماد نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی وزارت کا عہدہ حاصل کیا۔ لیکن اس علاقے کے لئے کیا کیا؟ میرے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ صرف شرمندگی ہوتی ہے۔ اور میں آئندہ شرمندہ ہونا نہیں چاہتا۔ جب بھی یہاں آؤ تو میرے بھتیجے اور داماد بن کر..... سیاسی لیڈر بن کر آؤ گے تو تمہارے لئے اس گھر کا دروازہ کبھی نہیں کھلے گا۔“

وہ پلٹ کر گھر کے اندر جانے لگے۔ اس نے چیلنج کے انداز میں کہا۔ ”بابا جانی! اچھی طرح سوچ لیں۔ آپ کی بیٹی میرے گھر میں ہے۔“

وہ جاتے جاتے رک گئے۔ پلٹ کر اسے گھورتے ہوئے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم

کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے اور کیا کہنا چاہئے؟ جب آپ کے گھر کا دروازہ میرے لئے بند ہو گا تو کیا آپ کی بیٹی کے لئے میرے گھر کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا؟"

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ صاف صاف بولو۔ میری بچی کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ نے میری حمایت کی۔ مجھے بلندی پر پہنچایا اور اب نیچے گرا رہے ہیں۔ تو کیا آپ کی بیٹی کو میں ذلت کی پستیوں میں نہیں گرا سکتا؟ جب کہ وہ اغواء ہونے کے بعد دو کوڑی کی ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔ اس گری ہوئی لڑکی کو شریک حیات بنا لیا۔"

وہ غصے سے گرج کر بولے۔ "بکواس بند کرو۔ میری بیٹی نہ پہلے کمتر تھی' نہ ہی اب ہے۔ ذلالت کا ثبوت تم دے رہے ہو۔ اسے اپنے گھر کی عزت بنانے کے بعد اس پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔"

"کیچڑ تو اب ایسے اچھلے گی کہ آپ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ آپ آج شام تک فیصلہ سنائیں کہ میری حمایت کریں گے یا نہیں؟ اگر نہیں' تو میری جوابی کاروائی کے لئے تیار رہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ پھر اپنی پجیرو میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ حیران پریشان اسے دیکھتے رہے۔ اور سوچتے رہے کیا یہ میرے سگے بھائی کا خون ہے؟ کیا یہ اتنا گر جائے گا کہ گڑے مردے اکھاڑے گا؟ میری بیٹی کی بے آبروئی پر جو پردہ ڈالا گیا ہے اس پردے کو نوچ کر ہمیں ننگا کرنا چاہے گا؟ ایک ہی خاندان کا فرد ہو کر یہ نہیں سوچے گا کہ وہ اس کی صرف شریک حیات ہی نہیں اس کے بابا جانی کی بیٹی بھی ہے؟ اس خاندان کی عزت بھی ہے؟

جہاں خود غرضی اور مفاد پرستی ہو، وہاں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ خون کا رشتہ بھی پانی ہو جاتا ہے۔ شام کو اچانک آفرین آ گئی۔ انہوں نے بیٹی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر کہا۔ "آؤ بیٹی! بیٹھو۔ تم تو اسلام آباد میں تھیں؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے فون کر کے حکم دیا کہ فوراً یہاں چلی آؤں۔ دوپہر کی فلائٹ سے پہنچی تو مجھے ائیرپورٹ لینے آئے تھے۔ پتہ چلا' آپ نے انہیں گھر میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پہلے تو مجھ سے سخت کلامی کرتے تھے۔ آج منہ سے گالیاں بھی نکالی ہیں۔ غصہ اس بات پر ہے کہ آپ ان کی سیاسی حمایت کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"یہ تو میں آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔ کسی بھی چور اور بے ایمان کو اپنے کاندھے پر بٹھا کر اقتدار کی کرسی پر نہیں پہنچاؤں گا۔"

"انہوں نے کہا ہے کہ میں آپ کو ان کی سیاسی حمایت کے لئے راضی کر کے ہی واپس آؤں۔ ورنہ وہ مجھے اپنے گھر نہیں لے جائیں گے۔"

"وہ بہت ہی کم ظرف ہے۔ تمہارے ذریعے مجھے کمزور بنانا چاہتا ہے لیکن میرا ایمان اتنا کمزور نہیں ہے۔ میں ایک بے ایمان کی حمایت کبھی نہیں کروں گا۔ اگر وہ تمہیں اپنے گھر نہیں لے جائے گا تو تم یہیں رہو۔ واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بابا جانی! آپ نے ہی سمجھایا ہے کہ جیتے جی شوہر کا گھر کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اگرچہ وہ گھر میرے لئے جہنم سے بھی بدتر ہے، پھر بھی وہاں رہ کر سہاگن تو کہلاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ اتنی جلدی واپس جاؤ گی؟"

"میں ان سے کہہ کر آئی تھی کہ آپ دین ایمان کے سلسلے میں میری کبھی کمزور نہیں پڑیں گے۔ کبھی ان کی حمایت نہیں کریں گے۔ مجھے آپ پر فخر ہے بابا جانی!"

وہ خدا حافظ کہہ کر جانے لگی۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی اور بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹی! رک جاؤ۔ ابھی نہ جاؤ۔"

"انہوں نے فوراً واپس آنے کو کہا ہے، اور میں بھی فوراً ہی آپ کا جواب سنا دینا چاہتی ہوں۔ وہ پچھلے دو برسوں میں بالکل ہی فرعون بن گئے تھے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سیاست میں دین سے جدا ہو کر چنگیز خان بننے والا پھر اپنی اوقات پر آ گیا ہے۔"

وہ اس بے دین شوہر کی کار میں بیٹھ کر وہاں سے ریسٹ ہاؤس پہنچی۔ یہ سب

جانتے تھے کہ حقی صاحب خدا اور رسول ﷺ کے قوانین اور اصولوں کے مطابق جب کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو پھر کسی کے لئے معافی کی گنجائش نہیں رہتی۔

جرار حقی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس نے مذہب کو ہتھیار بنا کر میر عبدالسلام حقی کے احساسات اور جذبات کو مجروح کیا ہے۔ اب وہ کبھی اس کی سیاسی حمایت نہیں کریں گے۔

آفرین نے بھی یہی خبر سنائی تو وہ غصے سے بپھر گیا۔ گرج کر بولا۔ ''تیرے باپ کو میری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ کیا وہ بھول گیا کہ میں نے اس کی عزت رکھنے کے لئے تجھ جیسی بدچلن آوارہ اور آبرو باختہ لڑکی سے شادی کی....؟''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''میں آبرو باختہ نہیں تھی۔ میرے ساتھ جبر کیا گیا تھا۔ آپ کے ساتھ کوئی جبر نہیں ہوا۔ آپ بہروپئے بن کر بابا جانی کے پاس آئے اور ان کی شرافت اور ایمان داری سے فائدہ اٹھا کر کامیابی کی بلندی تک پہنچ گئے۔ جتنی بلندی پر پہنچے' آج اتنی ہی پستی پر گر رہے ہیں۔ آپ کو اس علاقے سے ایک ووٹ بھی نہیں ملے گا۔ آپ کے پارٹی لیڈر اور دوسرے سیاست داں جو آپ کو سر پر بٹھاتے ہیں' وہی آپ کو نیچے گرا دیں گے۔''

''تو کیا سمجھتی ہے میرے ساتھ ایسا ہوگا تو تو میرے سر پر بیٹھی رہے گی؟ میں تو تجھے ذلت کی پستیوں میں گرا دوں گا۔ دنیا والوں کو بتاؤں گا کہ کس طرح تجھے اغواء کرنے کے بعد تیری عزت کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔''

''پھر بھی میرے بابا جانی کا ایمان قائم اور دائم رہے گا۔ آپ مجھے پستیوں میں گرا کر بھی ان کا فیصلہ نہیں بدل سکیں گے۔''

اس نے تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ ایک طمانچہ مارا پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی پٹائی کرتا چلا گیا۔ اس علاقے کے معززین کو معلوم ہوا تھا کہ حقی صاحب کا داماد ان کی بیٹی کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں آکر ٹھہرا ہوا ہے، اور ان کے گھر نہیں جا رہا ہے۔ سب کو تشویش ہوئی تھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ معاملہ کیا ہے؟ لہٰذا ایسے ہی وقت وہ سب وہاں پہنچ گئے تھے۔

انہوں نے جب جرار کی گالیاں اور آفرین کی چیخ و پکار سنی تو سب ہی دندناتے ہوئے اندر چلے آئے۔ جرار نے غصے سے پوچھا۔ ''کون ہیں آپ لوگ؟ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

انہوں نے آفرین کی طرف دیکھا اس کی ناک اور منہ سے لہو بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ایک بزرگ نے کہا۔ ''ہم نے حقی صاحب کی صابزادی کو کبھی بے پردہ نہیں دیکھا۔ ایک اندازے سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ ان کی ہی صاحبزادی ہیں، اور تمہاری شریک حیات....؟''

جرار حقی نے کہا۔ ''ہاں۔ یہ میری شریک حیات ہے۔ حقی صاحب کی بیٹی ہے۔ آپ لوگ ہمارے معاملے میں کچھ نہ بولیں۔ یہاں سے چلے جائیں۔''

''کیسے چلے جائیں؟ آپ اتنے محترم بزرگ کی صاحبزادی کو اذیت دے رہے ہیں۔ یہ مصیبت میں ہیں اور ہم آنکھیں بند کر کے یہاں سے چلے جائیں؟''

باہر ریسٹ ہاؤس کے ملازم اور دوسرے لوگ بھی سن رہے تھے۔ وہ اس بات کو دور تک پہنچانے لگے۔ ادھر جرار نے کہا۔ ''میر عبدالسلام حقی جیسے عالم دین کی بیٹی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ پارسا ہے۔ یہ انتہائی آوارہ اور بدچلن ہے۔ دو برس پہلے یہ اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور جھوٹی خبر پھیلائی گئی تھی کہ اسے اغواء کیا گیا ہے۔ آج بھی اپنے یار سے ہی ملنے گئی تھی۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ اس لئے اسے سزا دے رہا ہوں اور اب یہ میرے قابل نہیں رہی ہے۔ اس لئے آپ تمام لوگوں کے سامنے اسے طلاق دے رہا ہوں۔ میں نے تمہیں طلاق دی.....''

آفرین نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ خدا کے لئے یہ لفظ منہ سے نہ نکالیں۔''

اس نے سنی ان سنی کی اور کہا۔ ''میں نے تمہیں طلاق دی۔ اور میں نے تمہیں طلاق دی......''

ایک ہٹے کٹے نوجوان نے آگے بڑھ کر ایک الٹا ہاتھ جرار کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس جوان نے کہا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے' ہمارے حقی صاحب کی صاحبزادی پر جھوٹے الزامات لگائے گا اور طلاق دے کر یہاں سے زندہ واپس جا سکے گا۔''

وہ سب اسے مارنے کے لئے آگے بڑھے۔ بزرگ حضرات ان جوانوں کو روکنے لگے۔ جرار دوڑتا ہوا اپنے اٹیچی کے پاس گیا۔ پھر اسے کھول اس نے ایک ریوالور

نکالتے ہی چھت کی طرف فائر کیا۔سب ہی محتاط انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔

اس نے للکارتے ہوئے کہا۔''خبردار! کسی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں گولی ماردوں گا۔''

وہ انہیں ریوالور دکھا کر ان کے درمیان سے گزرتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں آیا۔سامنے کار کھڑی ہوئی تھی۔وہ ادھر جانا چاہتا تھا۔اچانک ہی ایک جوان نے اس پر چھلانگ لگائی اس کے ساتھ ہی گولی چل گئی۔

وہ جوان فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔جرار بھاگتا ہوا کار کے پاس آیا۔پھر ریوالور دکھاتے ہوئے بولا۔''سب مجھ سے دور رہیں۔جو بھی قریب آئے گا،وہ مارا جائے گا۔''

اس نے ایک جھٹکے سے اسٹیرنگ سیٹ والا دروازہ کھولا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بیٹھتا' اچانک ہی ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔سب نے چونک کر دیکھا' اس کے سینے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا' پھر اس کے دیدے پھیل گئے۔ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر گر پڑا۔

میر عبدالسلام حقی پولیس والوں کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔وہاں پہنچتے ہی ایک دم سے ٹھٹھک گئے۔تمام معززین انہیں بتانے لگے کہ اب تک وہاں کیا ہوتا رہا ہے۔

وہ کمرے میں بیٹی کے پاس آئے۔بیٹی چادر میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ایک شریف زادی کو طلاق کے نام پر گالیاں ملی تھیں۔باپ کا سر جھک گیا تھا۔وہ نہ کچھ کہہ سکتے تھے' نہ کچھ کر سکتے تھے۔انہوں نے چپ چاپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا،

پولیس افسر نے پوچھا۔''جرار کو کس نے گولی ماری ہے؟''

ایک بزرگ نے کہا۔''ہم نہیں جانتے کہ اس پر گولی کس نے چلائی ہے۔ویسے جس نے بھی ایسا کیا ہے' ہم سب پر احسان کیا ہے۔اگر اسے گولی نہ ماری جاتی تو پتہ نہیں یہ ہم میں سے اور کتنوں کو ہلاک کر دیتا۔''

عامر جان بھیڑ کو چیرتا ہوا حقی صاحب کے پاس آیا۔پھر بولا۔''آپ جیسے عالم دین اپنے دین ایمان کے مطابق فرشتہ بن کر رہتے ہیں۔بہروپیوں کو سمجھ نہیں پاتے،اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ آپ نے انہیں اپنا جیسا بنا لیا ہے۔بے شک آپ ایک سچے عالم دین

ہیں۔بس آپ کی ایک کمزوری ہے کہ آپ انتہا پسند ہیں۔دوسرں کو اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں۔اور یقین بھی کر لیتے ہیں۔کہ وہ آپ جیسا بن چکا ہے۔''

پھر اس نے لباس میں سے ریوالور نکال کر پولیس افسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''یہ میرا اپنا خیال ہے کہ ایمان کمزور ہو رہا ہو تو شیطان کو اس کی شیطانیت سے ہی مارنا چاہئے۔میں بہروپیا نہیں ہوں۔ایک قتل کرنے کے بعد خود کو چھپا نہیں رہا ہوں' جو سچ ہے وہ سب کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔''

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہتھکڑیاں پہننے کے لئے بڑھا دیئے۔پولیس افسر نے اٹھ کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔''ہم تمہیں ہتھکڑی نہیں پہنائیں گے۔پورا علاقہ گواہ ہے کہ تم نے اور کئی لوگوں کی جانیں بچانے کے لئے ایک قاتل کو اس کے برے انجام تک پہنچایا ہے۔ہم تمہیں عزت سے لے جائیں گے،انشااللہ عزت سے تمہارے حق میں فیصلہ کیا جائے گا۔''

وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے لگے۔آفرین چادر سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔عامر جان نے اسے پلٹ کر دیکھا۔اور اس یقین سے دیکھا کہ وہ صدمے سے نہیں' اس فخر سے رو رہی ہے کہ اس کا محبوب بہروپیا نہیں ہے۔انتہا پسند بھی نہیں ہے۔جس حد تک مسلمان ہے اسی حد تک سچائی کا بول بالا کر رہا ہے۔

ختم شد